مُستنصر حسین تارڑ

پُتلی پیکنگ کی

''پُتلی پیکنے دی تے نقش روم والے''

ہیر کے حسن کی مدح میں لکھے گئے وارث شاہ کے اس مصرعے سے میں نے سفرنامے کا عنوان مستعار لیا ہے.. اگرچہ لفظ ''پیکنے'' کے بارے میں کچھ اختلاف ہے کہ یہ دراصل ''پتلی پیکھنے دی'' ہے یعنی تماشہ کی پتلی.. ہیر وارث شاہ کے کچھ نسخوں میں ''پیکنے'' درج ہے اور کچھ میں ''پیکھنے''۔ میرے نزدیک بھی ''پیکھنے'' زیادہ قرین از قیاس ہے کہ اُن زمانوں میں بیجنگ' پیکنگ نہیں کہلاتا تھا... اس کے باوجود میں نے ''پیکنے'' پر انحصار کیا ہے۔ اگر لی پو کی تتلی میرے ہمراہ پرواز کر سکتی ہے تو ''پیکھنے'' بھی ''پیکنے'' ہو سکتا ہے۔

فہرست

صحرائے گوبی

بیجنگ

شی آن

شنگھائی

لونگ جن

ہانگ چُو

بیجنگ

تیان جن

بیجنگ

مقام....صحرائے گوبی

''تتلی اور تارڑ...ریت کے پرندے پرواز کرتے ہیں''

تتلی اڑی...
مشکل سے اڑی...
کہ اس کے پروں میں وقت کے گھونسلے تھے..جو انہیں بوجھل کرتے تھے..
گھونسلوں میں تنکے تھے..
ہر تنکا ایک سفر تھا...

سب سے پہلا تنکا جو اس گھونسلے کی بنیاد تھا..رتّی گلی کی جھیلوں میں تیرتے برف کے راج ہنس کا ایک پَر تھا..

پھر تنکے آتے گئے اور آشیاں بنتا گیا..ان تنکوں میں یورپ اور ایشیا کے لاتعداد ٹھکانے تھے..جو اوائل عمر کی نوخیزی اور بیش قیمت نادانی کے دن تھے..

ایک گھونسلا سراسر پاکستانی شمال کے تنکوں سے وجود میں آیا تھا..اور اس کی بُنت شاہراہ ریشم کے ربن سے ہوئی تھی..شاہ گوری..نانگا پربت..فیری میڈو..کرومبر..شمشال..سنو لیک اور ایسے ان گنت تنکے..

اس تتلی کے پروں میں وقت کے گھونسلے تھے..اور گھونسلے سفر کے ان تنکوں سے بنے تھے اور اب یہ تتلی ایک ایسے اونٹ کی مانند تھی جو کسی آخری تنکے کے بوجھ سے مسمار ہو سکتی تھی..

پر اس تتلی نے ایک اور تنکے کے بوجھ کو بھی سہار لیا..

کیونکہ یہ تتلی... میں تو نہ تھا.. وہ چینی فلسفی تھا جس نے خواب میں دیکھا کہ وہ تتلی بن گیا ہے اور پھر ساری عمر اسی سوچ میں رہا.. اسی مخمصے میں رہا کہ کیا میں نے خواب دیکھا تھا کہ میں تتلی ہوں یا واقعی تتلی ہوں.. یا یہ تتلی تھی جس نے خواب میں دیکھا کہ وہ میں ہوں.. اور اس لمحہ موجود میں میں کیا ہوں؟.. تتلی یا میں خود.. یا میں دراصل ایک تتلی ہوں جو خواب دیکھ رہی ہے کہ...

وہ چینی فلسفی جس کا نام چُوانگ چو تھا ساری عمر انہی بھول بھلیوں میں گم رہا...

''جب چُوانگ چو نے خواب دیکھا کہ وہ تتلی بن گیا ہے...
تو تتلی چوانگ چو بن گئی..
اگر اکیلی مخلوق اس طرح تبدیلی سے دوچار ہو سکتی ہے
تو یقیناً ساری دنیا ہی بہاؤ میں ہو گی''

(لی پو)

تو میں بھی ساری دنیا کی طرح اسی بہاؤ میں تھا.. جس میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور کون ہے.. وہ بادی النظر میں دکھائی کچھ دیتا ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ بلھے شاہ بھی چوانگ چُو کا ہی ایک اور روپ ہے.. کی جاناں میں کون او بلھیا.. کی جاناں میں کون..

اگر بلھے شاہ اور چوانگ چُو یہ نہیں جان سکے کہ وہ کون تھے تو میں کیسے جان سکتا تھا..

تو یہی تتلی جو ہم سب کا دوسرا روپ ہے.. یا ہم اس کا ایک روپ ہیں۔ بس یہی تتلی اپنے بوجھل پروں میں سفر کے اور وقت کے تنکے سہارتی اڑی..

اور اُڑ کر پیکنگ کی تتلی دیکھنے کو پہنچی..

کیسے پہنچی؟

یہی تو روئیداد ہے.. یہی داستان ہے..

لیکن ہر داستان کی مانند اس میں بھی حقیقت معدوم ہوتی جاتی ہے اور خواب و خیال

ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ تتلی ایک انسان نہیں ہوتی جو ایک منشی ایک سعادت مند کلرک کی طرح ایک رجسٹر میں واقعات کا پوری سچائی کے ساتھ اندراج کرتی چلی جائے.. سفر کی منزلوں، مسافتوں اور ہم سفروں کی تفصیل نہایت عرق ریزی سے لکھتی چلی جائے..

چنانچہ یہ سفرنامہ.. یہ ناول.. یہ داستان.. یہ قصہ میں نہیں لکھ رہا.. ایک تتلی بیان کر رہی ہے جس کے پَر گھونسلوں کے بوجھ سے بوجھل ہیں.. اور اس کی آنکھیں اِس دنیا کو اس کے لوگوں کو جانے کیسے دیکھتی ہیں.. جیسے بھی دیکھتی ہیں ایک انسان سے مختلف دیکھتی ہیں۔ اس لیے اس بیان میں انسانی آنکھ کی حقیقت سے دوری ہو گی.. اس کے رنگ مختلف ہوں گے... اس کے زاویے اور ہوں گے اسی لیے یہ تتلی نہیں جانتی کہ ملک چین کو روانگی پر کون کون سے احباب اُسے ایئرپورٹ پر الوداع کہنے کے لیے آئے... بیجنگ پہنچنے پر کن کن چینی زعماء نے اس کا استقبال کیا.. اس کے ہم سفر کون تھے.. اور پھر اس نے کیسے چینیوں کے طے کردہ شیڈول کے مطابق چین دیکھا۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسی بے چاری تتلی تھی جس کے پَر فرشتوں سے بہت پہلے ہی جل جاتے تھے.. جو دنیا کے طویل ترین برفانی راستے کے درمیان میں واقع سنو لیک کی برف کائنات میں پرواز کرتی تھی اور سینئر میڈ مسٹر تارڑ کے گھڑے میں سے نکلی تھی..

تو اس تتلی کو آپ کٹہرے میں کھڑا کر کے مطالبہ نہیں کر سکتے کہ بی بی تم نے وہ چین کیوں نہیں دیکھا جو سب لوگ دیکھتے ہیں..

آپ اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے..

اسے کسی فیلسوف نے بتایا تھا کہ تم اس کے بارے میں مت سوچو جو پیچھے رہ گیا ہے.. ہر شے دنیا کی روح میں لکھی گئی ہے.. اور وہ وہاں ہمیشہ کے لیے رقم ہو گئی ہے۔ صرف اپنے دل کی آواز سنو اور شگونوں کی جانب دھیان دو.. سفر کا راز یہ ہے کہ تمہارے اندر ہوائیں ہیں.. صحرا، سمندر اور ستارے ہیں.. اور ہر وہ شے ہے جو کائنات میں ہے.. اور ہم سب کو صرف ایک ہاتھ نے تخلیق کیا ہے اسی لیے ہم سب کی روح ایک ہے..

تو یہ تتلی بھی اپنے آپ کو ہواؤں میں بدل سکتی تھی..

صحرا ہو سکتی تھی.. سمندر ہو سکتی تھی..

اور یہ تتلی صرف اپنے دل کی آواز سنتی تھی..
اور چین کو پرواز کرتی تھی..
ایک ناتواں تتلی جس کی حیات چند روزہ ہے۔ اس سے آپ یہ توقع نہ رکھئے گا
کہ وہ آپ کو چین کے سفر کی وہی کہانیاں سنائے گی جو پچھلے مسافر سنا چکے ہیں..
اگرچہ اسے یقین ہے کہ جو کہنا تھا وہ کہا جا چکا۔ اب کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا..
جو کہنا تھا وہ کالی داس‘ ہومر‘ سفوکلیز‘ لی پو‘ طوفو‘ کنفیوشس‘ لاؤ چو اور بہت سے کہہ چکے..
جو المیہ یا طربیہ تخلیق ہو سکتی تھی وہ ہو چکی..
شکنتلا کے راجہ کے رتھ کے برابر میں دوڑتے اپنے بدن سے آگے نکلتے ہرن‘
حنائی انگلیوں کی سویر.. ٹروجن عورتیں.. بادشاہ کی خدمت کے لیے وادیوں میں پھول چننا..
جب چوانگ چو نے خواب میں دیکھا کہ وہ تتلی بن گیا ہے اور جو راستے کو جانتا ہے وہ
بولتا نہیں.. جو بولتا ہے وہ راستے کو نہیں جانتا.. یہ سب کچھ بیان ہو چکا..
تو اس تتلی کے بارے اگرچہ کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا لیکن اس کی حیات محدود ہے..
وہ کچھ نہ کچھ تو کہے گی..
چنانچہ یہ تتلی جو ایک قدیم چینی فلسفی کے وجدان میں سے وجود میں آئی‘ محوِ پرواز
ہوتی ہے..
تتلی اڑتی ہے..
اور چینی فلسفی کے وجدان میں سے پر کھولنے والی تتلی کے بھیتر میں مَیں تھا.. جو
چین کی جانب پرواز کرتا تھا..
یہ قصہ کبھی تتلی کی زبان میں ادا ہوگا اور کبھی میں بیان کروں گا.. کیونکہ یہ طے نہیں
ہو رہا کہ تتلی.. تارڑ ہے.. یا تارڑ ہے جو تتلی بن چکا ہے..
ہم دونوں پی آئی اے کی پرواز پی کے 880 یا 420 پر سوار پرواز کرتے ہیں اور
جہاز کے پروں کے نیچے.. صحرائے گوبی پھیلتا ہے.. تبت کی ویرانیاں گزرتی ہیں.. اور پھر ہم
منگولیا کے آسمانوں پر ہیں..

ایسی مسافتوں کے بارے میں چینی شاعر طوفو سوچتا ہے..
پتلی نرسلیں اور زمین سے آتی ہوئی نرم رو بادِ نسیم!
ہمارا مستول..
رات میں بلند اور مضبوط ہے..
اور میں اکیلا ہوں..
ستارے میدان اعظم پر لٹکے ہوئے ہیں..
اور چاند بہتے ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے..
ضروری نہیں کہ کمال سخنوری کے ساتھ..
شہرت بھی ملے..
مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ایک ریت کا پرندہ ہوں..
جو مظاہر فطرت کی زد پر اڑ رہا ہے..

مظاہر فطرت.. دنیا بھر میں.. صحرائے گوبی‘ تبت اور منگولیا سے بڑھ کر اور کہاں ہوں گے..
اور ہم ریت کے پرندے ہیں.. جانے کس لمحے مسمار ہو کر جہاز کے پروں تلے
گزرتے صحرائے گوبی کی ریت میں ذرّے ہو جائیں.. لیکن جب تک ہم ذرّے نہیں
ہو جاتے ہم وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتے رہیں گے جو کہا جا چکا ہے..
چنانچہ تتلی اڑی..
اگرچہ وہ بھی اور میرا وجود بھی ریت تھے..
لیکن لمحۂ موجود میں ہم دونوں پرندے تھے..
اس لیے اڑتے جاتے تھے..
ملک چین کی جانب..
فلائٹ پی کے 880.. یا 420..
ہم دونوں اڑتے جاتے تھے۔

مقام.... بیجنگ

’’یہ چین میں ہماری پہلی سویر تھی‘‘

ہماری کوچ ایئرپورٹ شاہراہ پر ایک بے آواز آہستہ خرامی کے ساتھ بیجنگ کے شہر کو جا رہی تھی۔ میں کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے اپنے پہلے چینی شہر کی پہلی سویر کو دیکھ رہا ہوں اور اس سویرے میں شاہراہ کے پہلو میں ایک الگ راستے پر ہزاروں سائیکلیں ہیں اور ان پر ہزاروں چینی اور چینیاں سوار ہیں.. وہ ہماری کوچ کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ایسے جاہل ہیں کہ نہیں جانتے کہ اس کوچ میں دوست ملک پاکستان کے دانشور اور ادیب کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں.. البتہ ہم انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں.. ان کی آنکھیں ہمارے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتیں.. ذرا ترچھی اور مختصر ہیں.. چینیاں ہماری توقع کے برعکس ماؤ جیکٹوں اور ڈھیلے پاجاموں میں ملبوس نہیں ہیں بلکہ مختصر بلاؤزز اور نیکروں میں نہایت دل پذیر انداز سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ اگرچہ اپنے پاکستانی ’’سٹینڈرڈ‘‘ کے مطابق اُن کے پاس بدن کے بالائی حصوں پر ظاہر کرنے کے لیے بہت کچھ نہیں ہے.... وہ اپنے دھیان میں ہیں اور ہم ان کے دھیان میں ہیں کہ ہم سب ایک نسوانی ناآسودگی کے معاشرے سے آئے ہیں اور وجودِزن کی کائنات دیکھتے ہوئے آسودہ ہو رہے ہیں..

میں کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ناک چپکائے بیٹھا ہوں اور تتلی اس کھڑکی کی چوکھٹ پر براجمان پَر سمیٹے بیٹھی ہے اور ہم دونوں بیجنگ کی صبح کے نظارے کر رہے ہیں..

ہزاروں آسودہ حال اور نہایت ستھرے چینی سائیکل سواروں کے پہلو میں

باغات اور سبزہ زاروں کا ایک سلسلہ ہے جہاں مزید چینی اس صبح کو اپنے اپنے انداز میں خوش آمدید کہہ رہے ہیں..

اپنے من کی موج میں ہیں اور ہمارے حساب سے جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ ورزشیں کر رہے ہیں..

ایک مڈل ایج خاتون بُت بنی کھڑی ہیں، پھر یکدم ایک اُلٹ بازی لگا کر پھر بُت بن جاتی ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں..

ایک پستہ قد چینی باباجی اپنے قد جتنی ہی ایک بڑی سی تلوار نہایت آسانی سے گھما رہے ہیں اور پینترے بدل رہے ہیں.. کبھی خود گھوم جاتے ہیں.. کبھی تلوار گھماتے ہیں اور کبھی وار کرنے کے بعد ساکت ہو جاتے ہیں.. لیکن مجال ہے کہ بقیہ پبلک میں سے کوئی ایک بھی ان کی ان حرکات پر توجہ دیتا ہو اور وہ اپنے دھیان میں تلوار گیان میں مگن اسے گھماتے، پینترے بدلتے صبح کی ورزش کیے جا رہے ہیں..

کچھ ٹولیاں اجتماعی ورزش میں مشغول ہیں..

ایک صاحب نہایت اہتمام سے ایک کرسی پر براجمان بیچ پارک میں شیو بنوا رہے ہیں۔ حجام صاحب بھی ایپرن باندھے نہایت اہتمام سے ان کے گالوں پر تھوپی جھاگ میں اُسترا چلا رہے ہیں.. اور وہ صاحب اخبار پڑھ رہے ہیں اور صرف ایک ہاتھ بار بار فضا میں بلند کر کے اپنی ورزش کا کوٹہ بھی پورا کر رہے ہیں..

شنید ہے کہ چینی حجاموں کے اُسترے کبھی کُھنڈے نہیں ہوتے کیونکہ بیشتر چینی ’’کھودے‘‘ ہوتے ہیں اور ان کے رخساروں پر بالوں کی فصل قدرے کم کم ہوتی ہے.. اور جو ہوتی ہے وہ بھی نرم رو ہوتی ہے.. یہ فصل بہت ہی اچھی ہو جائے تو بھی گالوں سے درگزر کرتی ٹھوڑی میں سے نمودار ہو کر سرسراتی ہوئی بہار دکھاتی ہے جیسا کہ انکل ہوچی منہ کی داڑھی سے ہویدا ہے.... شاید اسی لیے چین میں ریزر بلیڈز کی صنعت پنپ نہیں سکی کیونکہ ایک عام چینی کے لیے صرف ایک بلیڈ یا اُسترا ہی عمر بھر کے لیے کافی ہوتا ہے جسے وہ فوت ہونے پر بیٹوں اور پوتوں کے لیے تقریباً نئی حالت میں چھوڑ جاتا ہے۔

بیجنگ کی اس سویر میں جتنے بھی چہرے تھے.. سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر.. بسوں اور کاروں میں.. پارکوں میں یا پیدل چلتے ہوئے وہ سب کے سب بظاہر بے حد شانت تھے.. لیکن یہ چہرے مسکراتے ہوئے نہ تھے اور چین میں مَیں نے بہت کم لوگوں کو مسکراتے یا دل کھول کر ہنستے ہوئے دیکھا... اگرچہ وہ مطمئن اور پُر امن تھے.. پاکستان میں کسی بھی سویر آپ اپنے اپنے کام کاجوں پر جاتے' بچوں کو سکول چھوڑتے' بس سٹاپوں پر کھڑے' پیدل چلتے چہروں کو دیکھیں تو وہ سب ناخوش نظر آتے ہیں.. بیزار اور کدورت بھرے دکھائی دیتے ہیں... شاید ہمارے ہاں بندۂ مزدور کے اوقات بہت سخت ہوتے ہیں اس لیے.. یا یہ ہمارے قومی مزاج میں شامل ہے کہ ہم ہمیشہ سنجیدگی کو اوڑھے رہتے ہیں.. ہر شے سے ناخوش رہتے ہیں.. ایام جوانی میں ملک انگلستان میں تصویر اترواتے ہوئے انگریز خواتین و حضرات ہمیشہ اپنے کرم خوردہ' ٹیڑھے میڑھے پیلے دانتوں کی فخریہ نمائش کرتے ہوئے کیمرے کا سامنا کرتے اور ہم... منہ بھینچتے ایک رونی سی ناآسودہ شکل بنائے نہایت سنجیدگی سے فوٹو کھنچواتے.. میری پہلی لینڈ لیڈی نے ایک بار میرے ہمراہ ایک اسی قسم کی تصویر اتروانے کے بعد کہا تھا.. مجھے حیرت ہے مسٹر چودھری کہ آپ کے خطے سے آنے والے لوگوں کے دانت اتنے سفید اور خوبصورت ہوتے ہیں کہ ان پر نقلی بتیسی کا گمان ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ انہیں چھپا کر رکھتے ہیں' ان کی نمائش نہیں کرتے..

مشرق میں صرف اہل جاپان کو دیکھا ہے کہ ہمہ وقت خوش رہتے ہیں.. مسکراتے رہتے ہیں.. خوش اطوار ہیں اور بہت ہی خوش خوراک ہیں.. اردو دان جاپانی یاما نے خصوصی طور پر آموں کے موسم میں پاکستان آتے ہیں اور سنگ میل کے شوروم میں بیٹھ کر ایک ٹب میں آموں کو برف میں لگا کر پوری دوپہر نوش کرتے رہتے ہیں..

تو بیجنگ میں ہماری پہلی سویر میں.. چین میں دیکھے جانے والے ہمارے پہلے چینی مسکرا نہیں رہے تھے.. خوش نظر نہیں آتے تھے لیکن مطمئن اور شانت نظر آتے تھے..

تتلی ... کھڑکی کی چوکھٹ پر پر جمائے بیٹھی یہ منظر میری نظروں سے دیکھ رہی تھی.. یا میں اس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا..

ایئر پورٹ سے باہر آنے پر متعدد بڑے بڑے قدیم طرز کے چینی دروازے شاہراہ پر آراستہ تھے.. شوخ رنگوں... اژدہوں اور گل بوٹوں سے مزین.. ایسے دروازے جن کے پار طلسمات کی ایک بھید بھری دیومالائی بستی ہو سکتی تھی.. قبلائی خان کا سنہری تخت ہو سکتا تھا اور اس کے گلی کوچوں میں مارکوپولو اور ابن بطوطہ سے ملاقات ہو سکتی تھی.. لیکن ان دروازوں کے پار آج کا بیجنگ تھا..

دنیا میں پانچ خطے ایسے ہیں جنہیں بیان کرنے والے سفرنامہ نگاروں کے پَر جل جاتے ہیں کہ وہ انسان کو زمین پر بھیجے جانے کا سب سے بڑا جواز بنتے ہیں۔ انسانی تہذیب کے ارتقاء کی ایسی کائناتیں ہیں جو کسی ایک شخص' ایک کتاب کے بس کی بات نہیں... یونان' مصر' اندلس' ہندوستان اور چین... چونکہ میں اس سے پیشتر اندلس کو بیان کرنے کی کوشش میں پَر جلا بیٹھا تھا' اسی لیے میں نے چین کو تتلی کے سپرد کر دیا تھا کہ اس کے پَر ابھی تک موجود تھے..

میرے ذہن میں چین کا ایک موہوم سا تصور تھا۔ بیجنگ کی صبح کی یہ تصویر اُس سے سراسر مختلف تھی۔

میرے ذہن میں تیس برس پیشتر کا پُر ہجوم اور ٹھنسا ہوا اور آبادی کے زور سے پھٹتا ہوا... دہلی کا شہر تھا.. اگر دہلی اتنا گھنا اور پُر ہجوم تھا کہ بعض اوقات فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے آپ پلٹنا چاہتے تھے تو پلٹ نہیں سکتے تھے... اپنی مرضی کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے تھے.. گھنی بھیڑ میں پاؤں اکھڑتے تھے اور آپ وہاں پہنچ جاتے تھے' جہاں آپ نے نہیں پہنچنا ہوتا تھا تو اب دنیا میں سب سے بڑی آبادی رکھنے والے ملک کے شہر بیجنگ میں کیا حالات ہوں گے.. یقیناً انسانوں کا ایک لاوا ہو گا جو ہر شاہراہ.. ہر عمارت.. ہر پارک میں بہہ رہا ہو گا... یاجوج ماجوج کے وجود سے ہر شے معدوم ہو چکی ہو گی..

لیکن یہ تصور سراسر باطل ثابت ہوا۔

بیجنگ کی سویر میں رونق تو تھی' لیکن کوئی ہجوم نہ تھا.. ابتری نہ تھی.. انسانوں کے سروں کا لاوا نہ تھا۔

لاہور اور کراچی کی سویروں میں.. اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگ ہوتے ہیں.. ابتری ہوتی ہے۔

تتلی نے پَر کھولے اور مجھ سے مخاطب ہوئی ''سیر فی الارض کا فرمان اسی لیے ہے کہ جو تم تصور کرتے ہو.. ارض وہ نہیں ہوتی.. اس پر بسنے والے لوگ وہ نہیں ہوتے.. انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھو.. ریشم کے کیڑے کی مانند اپنے کوکون میں بند نہ رہو.. اپنے حجروں.. ٹی ہاؤسوں میں بیٹھ کر تصور نہ کرو.. اپنی آنکھوں سے دیکھو اور پھر اپنی رائے قائم کرو۔''

''مشورے کا شکریہ تتلی..''

''ڈونٹ مینشن اِٹ...'' تتلی نے پَر پھڑ پھڑائے..

میں نے سوچا.. اے تتلی تم جی بھر کے اپنے پر پھڑ پھڑا لو.. بالآخر چین کو بیان کرنے کی سعی میں یہ جل جائیں گے..

ڈیلی گیشن کے بیشتر اراکین پہلی بار ملک سے باہر آئے تھے اور ان مناظر سے سمجھوتہ نہیں کر پا رہے تھے..

''جناب عالی.. یہ چینی قوم کو کیا ہو گیا ہے.. یہ تو ماؤ کا چین نہیں ہے.. گراں خواب چینی سنبھلتے سنبھلتے کچھ زیادہ ہی نہیں سنبھل گئے.. نہ ماؤ جیکٹس.. نہ ڈھیلے ڈھالے پاجامے' جن میں پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ان کے اندر مرد ہے یا عورت.. اور اب تو نیکریں اور مختصر بلاؤز اور بہت ہی زیادہ پتہ چلتا ہے کہ یہ عورتیں ہیں.. اور کوئی ڈسپلن نہیں ہے.. ہر کوئی اپنی من مانی کر رہا ہے.. اور نہ ہی ہمیں دیکھ کر کسی نے ''پاک چین دوستی زندہ باد'' کے نعرے لگائے ہیں.. یہ کیسا چین ہے جناب عالی..''

اس پر لیڈر نے.. جو ایک نہایت سمارٹ سفید بالوں والا بزرگ اور گھنے شیشوں والی عینک کا حامل لیڈر تھا' فوری طور پر ازمنۂ قدیم کا کوئی حوالہ دیا' جب وہ چند ہفتوں کے لیے ماؤ کے چین میں چینی زبان سیکھنے کے لیے آیا تھا.. اور اس شام تک کھل گیا کہ اس کی لیڈری محض اس کی بزرگی کا کرشمہ تھی.. لیکن اس کے باوجود وہ ایک نہایت معصوم اور کیوٹ سا لیڈر تھا جسے چند روز کے لیے لیڈر مان لینے میں کوئی حرج نہ تھا.. اگر اس کی گفتگو کے بارے

میں تھوڑی سی غفلت اختیار کر لی جائے تو!

ایک رکن یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے کہ جن نعروں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں چینی عوام ان سے آگاہ ہی نہیں ہیں' چنانچہ انہوں نے کھڑکی میں سے اپنا سفید ریش چہرہ برآمد کر کے ''پاک چین دوستی زندہ باد'' کا ایک خفیف سا نعرہ لگانے کی کوشش کی اور پھر ہانپ کر اپنے ارادے کو موقوف کر دیا..

باہر.. چین کی پہلی سویر گزر رہی تھی... پہلے چینی گزر رہے تھے اور ہم جو تبت' منگولیا اور صحرائے گوبی پر سے ابھی ابھی پرواز کر کے آئے تھے.. گزر رہے تھے..

یہ بیجنگ کی صبح تھی..

چین میں ہماری پہلی سویر تھی۔

دورۂ چین کی دعوت موصول ہوئی تو میں ششدر رہ گیا.. سناٹے میں آ گیا.. یہ دورِ جام مجھ تک کہاں آ گیا.. ادب کا ہر ٹام ڈِک اور ہیری چین جا چکا تھا بلکہ ایک ٹام تو دو مرتبہ جا چکا تھا تو پھر میری باری کیسے آ گئی.. میں نہایت متعجب ہوا.. اور پھر گہری ریاضت کے بعد یہ کھلا کہ پس ماندگان میں صرف میں ہی بچا تھا اور کسی نہ کسی کو تو بھیجنا ہی تھا' اس لیے یہ قرعہ' چین میرے نام نکل آیا.. یہ وہ ہُما تھا جو ہر ہُما شُما کے سر پر بیٹھ چکا تھا اور صرف میرا سر ہی باقی بچا تھا' اس لیے یہ ہُما کی مجبوری تھی۔

دورۂ چین کی دعوت بالآخر موصول ہوئی تو نہ میں نے کنفیوشس کے بارے میں سوچا.. نہ تاؤازم اور لارڈ بدھا میرے ذہن میں آئے اور نہ ماؤ.. نہ ڈاکٹر سن یات سن.. اور نہ ''ایک پاگل کی ڈائری'' کے لوہسون نے میرے اندر سنسنی پیدا کی.. اور نہ ہی میں چین کے ریشم' کاغذ' بارود' ادب اور آرٹ کے بارے میں ہیجان میں مبتلا ہوا.. میں اگر اس دورۂ چین کی دعوت سے ایکسائٹ ہوا تو صرف دو وجوہ کی بنا پر.. ایک یہ کہ وہاں میں پورے سترہ روز دن رات.. ناشتے' لنچ اور ڈنر میں اپنی من پسند مرغوب چینی فوڈ تناول کروں گا.. اور دوسرے یہ کہ میں جس ریچھ نما جانور پانڈے کو خوابوں میں دیکھتا تھا.. اور جس کے عشق میں میں بری

طرح مبتلا ہو چکا تھا' اسے اپنی آنکھوں سے ..روبرو..دیکھوں گا..

اگر میں نے اقرار کر لیا ہے تو پلیز مجھے کور ذوقی کا طعنہ نہ دیجیے گا..اس اقرار سے یقیناً آپ کی حسِ جمال کو ضعف پہنچے گا لیکن میں نے بچپن میں ایک انگریزی محاورہ رٹا تھا کہ..آنسٹی از دی بیسٹ پالیسی..تو میں نہایت دانش مندی اور سوجھوان لوگوں کی باتیں بھی کر سکتا تھا..لیکن اپنی زبان کا کیا کروں جو چینی فوڈ کے چٹخارے لیتی ہے اور اپنے خوابوں کا کیا کروں جن میں کنفیوشس اور ماؤ کی بجائے پانڈے آتے ہیں..چنانچہ آنسٹی..ویسے بھی ایک دانش ور اور ایک آوارہ گرد کا ایجنڈا مختلف ہوتا ہے..

بیجنگ ایئرپورٹ سے شہر کو جاتی آہستہ خرام کوچ میں..میں نے ڈیلی گیشن کے بظاہر انچارج...ابھی ہر ایک رکن کا ناقدانہ جائزہ لیتے ..اسے جانچتے..پرکھتے..کامریڈ لیو سے ایک سرگوشی میں اپنے دل کی بات کہہ دی..چین میں اپنے دو نکات کے ایجنڈے کے بارے میں اسے مطلع کر دیا..

لیو نے اپنی عینک درست کی اور حیرت سے کھل جانے والے منہ کو بمشکل بند کیا۔

''آپ چین صرف اس لیے آئے ہیں کہ یہاں جی بھر کے چینی فوڈ کھائیں؟''

''جی..''

''اور ایک پانڈا دیکھ سکیں۔''

''جی۔''

''آپ کو چینی ادب' تاریخ اور فلسفے سے کوئی دلچسپی نہیں؟''

''نہیں..''

''تو آپ..'' لیو انگریزی بولتا بولتا ہکلا گیا اور چند فقرے چینی میں کہہ کر پھر سے انگریزی کی راہ راست پر آ گیا۔ ''تو آپ دانشور نہیں ہیں؟''

''نہیں..'' میں ذرا..بلکہ بہت زیادہ کھسیانہ ہو گیا۔ ''باقی اتنے ڈھیر سارے جو ہیں تو ان میں ایک آوارہ گرد بھی چلا آیا ہے تو اسے برداشت کر لیں۔''

''ٹھیک ہے..'' اس نے مسکراہٹ موقوف کر دی۔ ''وزارت خارجہ اور چینی

ادیبوں کی انجمن کی جانب سے میری ڈیوٹی ہے کہ میں دوست ملک پاکستان سے آنے والے مہمانوں کی ہر خواہش کا احترام کروں..میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو بہترین چینی فوڈ کھلاؤں..اور وہ آپ کھائیں گے..لیکن ہماری شیڈول میں پانڈا شامل نہیں ہے..اس کے لیے بیجنگ کے چڑیا گھر میں جانا ہوگا جو ہمارے پروگرام میں شامل نہیں..پھر بھی میں پوری کوشش کروں گا۔''

''شکریہ..''

''مینڈک فرائیڈ' بچھو پکوڑے اور پہلا چینی طعام''

پیس ہوٹل..

بیجنگ کے دل میں..اس کے مرکز میں.. جہاں چہار سو جدید عمارتیں.. بے فکرے چینیوں سے بھرے فٹ پاتھ..سٹور' ریستوران اور شراب خانے تھے وہاں پیس ہوٹل تھا۔ ہوٹل کے ماتھے پر ایک سنہری فاختہ پرواز کرتی تھی لیکن وہ اس کی آخری منزل تک پرواز نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس کے پروں کی پہنچ سے کہیں بلند اور آسمان میں تھی..

اتنے پُرشکوہ اور شاندار..نفیس اور ستھرے.. بلکہ شاہانہ انداز کے ہوٹل کی لابی میں معزز اراکین داخل ہوئے تو گمشدہ گائیوں کی مانند تھوتھنیاں اٹھا کر..اور ان میں مَیں بھی شامل تھا..اس کی وسیع لابی میں بلند ہوتے ہرے بھرے سچ مچ کے پام کے درختوں.. شاہانہ زینوں..فرانسیسی محلات ایسی سیڑھیوں..سنہری ستونوں..اور شیشے کے چار چفیرے کے پار بیجنگ کے جو انہونے اور انجانے رنگ..عمارتیں اور ٹریفک تھی اسے..تھوتھنیاں اٹھا کر دیکھنے لگے۔

لیو...ہم بھیڑوں کا رکھوالا اور انگریزی کا مترجم تھا..

وانگ لی..منگولین ناک اور ترچھی آنکھوں والی وانگ لی ابھی انگریزی اور چینی کے درمیان اٹکتی ڈولتی تھی..

اور پھر خاور تھا.. جو چینی لہجے میں اردو بولتا تھا..اگرچہ اس کا اصل نام..

چاؤ چن ڈن شانگ تانگ ہو..قسم کا تھا لیکن یہ بچہ مشرف بہ پاکستان ہو چکا تھا..اسلام آباد میں قیام کر چکا تھا اور اس قیام کے دوران اتفاقاً مجھے ٹیلی ویژن پر بھی دیکھ چکا تھا اس لیے مجھ پر قدرے مہربان ہو گیا..بیجنگ یونیورسٹی سے اردو کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنے چینی نام سے تائب ہوا اور خاور کہلایا..یہ چینی بچہ شنگھائی کا رہنے والا تھا اور بیجنگ کے باسیوں کو قدرے تحقیر سے دیکھتا تھا اور بیک ورڈ جانتا تھا۔اسی خاور نے نہایت شُستہ لہجے میں حکم دیا کہ پاکستانی ادیب برادران فوری طور پر اپنا سامان کمروں میں رکھ کر فوری طور پر ناشتے کے لیے پیس ہوٹل کے ڈائننگ روم میں فوری طور پر پہنچ جائیں..کہ یہی شیڈول ہے۔

چنانچہ ہم فوری طور پر چست اور مستعد ہو گئے..لفٹوں میں سوار ہو کر بھاگم بھاگ اپنی منزل پر پہنچے..پورٹر سے اپنا سامان حاصل کر کے کمروں میں ڈمپ کیا۔باتھ روم میں چند چھینٹے اڑائے اور فوری طور پر لفٹوں میں سوار ہو کر نیچے پہنچ گئے۔

پیس ہوٹل کے ڈائننگ روم میں چھت کے بڑے گنبد سے روشنیاں اتر رہی تھیں..پام کے درخت چپ کھڑے تھے اور مصنوعی آبشاروں کی ترل رِل سے اعصاب کو اتنا سکون ملتا تھا کہ افیون کی گولی پھانکنے سے بھی کہاں ملتا ہوگا..

گمشدہ گائیوں نے جو اپنے کمروں کی آسائش و آرائش..ان میں رکھے فریج' منی بار' ٹیلی ویژن اور کھڑکی سے نظر آتے شہر بیجنگ کے نظاروں کو دیکھ کر مزید گمشدہ ہو گئی تھیں۔اب جو اپنے آپ کو اس خوابناک طعام گاہ میں پایا تو انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اپنی مسرت کا اظہار ''با آبا آ'' کر کے کرنے سے روکا جو کہ گمشدہ گائیوں کے دل کی آواز ہوتی ہے..

ایک جانب مغربی ناشتے کے پُرتکلف آثار سجے تھے..

اور دوسری جانب خصوصی چینی ناشتے کے بھرپور انتظامات تھے..

میں نے اگرچہ فوری طور پر بلکہ والہانہ طور پر پہلے مغربی ناشتے کے حصے میں جا کر اپنے پسندیدہ گریپ فروٹ جوس کے متعدد گلاس ڈیک لگا کر پیئے اور پھر دو فرائیڈ انڈے

جن کی سنی سائیڈ اپ تھی..ایک ابلا ہوا انڈا جو لڑھکتا تھا اور دو انڈوں کا آملیٹ اپنی پلیٹ میں سجا کر فاتحانہ نگاہوں سے آس پاس دیکھا اور مسکرایا کیونکہ میری بیٹی ڈاکٹر قرۃ العین کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا ورنہ وہ میرے بلڈ پریشر کی وجہ سے فوراً حکم دیتی کہ ابو خبردار جو انڈوں کو ہاتھ لگایا تو..یہ مختصر سا ناشتہ کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ لاہور میں ہم چینی لنچ اور ڈنر تو کرتے ہی رہتے ہیں مگر چینی ناشتہ کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تو اب یہ اتفاق ہو رہا ہے تو یہ بھی کر لیا جائے..

میں ایک اور پلیٹ تھامے چینی حصے میں چلا گیا..وہاں دھیمی آگ پر کچھ عجیب عجیب سا سلگ رہا تھا..عجیب بھی اور اجنبی بھی..اور ہر اجنبی خوراک میں بہت سے خدشے ہوتے ہیں..اس کے اجزاء کیا ہیں۔ ابر کیا ہے‘ ہوا کیا ہے‘ جانور کیا ہے جس کا گوشت ہے..اور کیا حلال ہے..جائز ہے..مکروہ ہے..کیا ہے..گلابی رنگ کے جو قتلے فرائی ہو رہے تھے انہیں تو میں نے فوراً پہچان لیا کہ اُسی جانور کے ہیں جو اسلام آباد میں پائے جاتے ہیں اور مغربی سفارت کار انہیں اپنے سفارتخانوں میں بیٹھے شوٹ کر سکتے ہیں کہ ان کی اتنی فراوانی ہے۔

ان قتلوں سے میں نے پرہیز ہی کیا..

پھر ایک ایسی ڈش سامنے آئی جو نہایت نظر نواز تھی..گوشت کا رنگ چین کے سمندری موتیوں ایسا تھا اور میں اسے بہرطور اپنے پہلے چینی ناشتے میں شامل کرنا چاہتا تھا..لیکن موتیوں ایسی شفاف رنگت کے گوشت کے جو ٹکڑے تھے ان کے آخر میں مجھے دو آنکھیں نظر آئیں..کھلی اور حیرت میں گم..ایسی کہ تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے..مجھے اس ڈش کو نہایت رغبت سے دیکھتے ہوئے پا کر ویٹرس میرے قریب آ گئی..''یہ اُبلے ہوئے ہیں لیکن ہم آپ کے لیے فرائی بھی کر سکتے ہیں‘‘ اسی لمحے میں نے ڈش کے ایک کونے میں چسپاں ایک چھوٹی سی چٹ دیکھی جس پر بہ زبان انگریزی درج تھا ''مینڈک..اُبلے ہوئے‘‘...ویسے آپس کی بات ہے میں نے اتنا لذیذ نظر آتا خوش رنگت گوشت کبھی نہیں دیکھا تھا اور اگر وہ چٹ وہاں چسپاں نہ ہوتی تو مجھے مینڈک خوری کا

نہایت نایاب تجربہ حاصل ہو جاتا..

مینڈکوں کی طشتریوں کے بعد مجھے دیگر خوراکیں بھی کچھ ٹراتی ہوئی نظر آئیں‘ اس لیے میں نے مغربی ناشتے کے حصے کی جانب پسپائی اختیار کر کے ایک فرائی انڈہ مزید نوش کر لیا..

''تمام معزز اراکین اب فوراً اپنے کمروں میں چلے جائیں اور فوری طور پر آرام کریں..اور پھر پورے گیارہ بجے لابی میں پہنچ جائیں تا کہ لنچ کیا جا سکے..اور اس کے بعد ہم فوری طور پر دیوارِ چین دیکھنے کے لیے روانہ ہو جائیں گے...‘‘ خاور نے اعلان کیا..

''لیکن ابھی تو ہم نے ناشتہ کیا ہے۔‘‘ ایک گیسو دراز نہایت دل پھینک رکن نے احتجاج کیا۔ ''غضب خدا کا ہم دو گھنٹے بعد لنچ کیسے کر سکتے ہیں۔‘‘

''یہی شیڈول ہے۔‘‘ لیو نے فیصلہ سنا دیا..

''لیکن...‘‘ میں بھی احتجاج میں شامل ہونے کو تھا کہ تتلی نے اپنے لبوں پر ایک پر جما کر کہا ''شی...‘‘

''کیوں...شی؟‘‘

''چین میں بے شک اب ایک ملک دو نظام رائج ہیں لیکن یہ لوگ ابھی اپنے کڑے ڈسپلن سے باہر نہیں آئے..شیڈول کو حکم خداوندی سمجھتے ہیں..اس سے روگردانی کو کفر سمجھتے ہیں بلکہ مرتد قرار دیتے ہیں اس لیے لازم ہے کہ تم چینیوں کے شیڈول کا احترام کرو۔‘‘

چنانچہ ہم سر جھکائے کمروں میں آ گئے..

سفر کی تھکن تھی..جیٹ لیگ کی بے چینی اور بے آرامی بدن میں دُکھتی تھی۔ بستر بھی اجنبی تھا..میں ایک شہتیر کی طرح بستر پر لیٹا رہا لیکن اس چوبی کیفیت میں میرے بدن نے آرام کرنے سے ریلیکس کرنے سے انکار کر دیا..

میں اٹھا اور کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا..دور دور تک بے روح اور سپاٹ عمارتیں تھیں جو کسی بھی ملک کی ہو سکتی تھیں..بہت دور صبح کی دھند میں ایک پگوڈا نما عمارت تھی جس

سے شائبہ ہوتا تھا کہ یہ چین ہو سکتا ہے..

میں نے آگے بڑھ کر ساتویں منزل سے نیچے جھانکا.. ہوٹل کے پچھواڑے میں ایک بے آباد سڑک تھی؛ جس کے کناروں پر ٹین کی چھتوں اور شکستہ اینٹوں کا ایک شینٹی ٹاؤن پھیلا ہوا تھا.. ایک کچی آبادی کے پرانے کمرے اور صحنوں کے ڈھیر تھے جو ابھی تک تعمیر نو کی زد میں نہیں آئے تھے.. ٹین کے پرانے ٹکڑوں کی پچکی ہوئی چھتیں، چھوٹے چھوٹے کمرے اور صحن.. کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے.. ان میں سے ایک صحن میری کھڑکی کے عین نیچے میری زد میں تھا... صحن کے اوپر یہاں سے رسیوں کا ایک جال سا تنا ہوا تھا جس پر کپڑے سوکھ رہے تھے.. خالی کارٹن اور پنجرے.. تنگدستی اور غربت کے آثار.. ایک عورت ایپرن باندھے ایک تسلے میں نُوڈل اُبال رہی ہے اور انہیں ایک ڈوئی سے اٹھا کر ذرا ہوا لگواتی ہے اور پھر سے گرم پانی میں ڈال دیتی ہے.. ایک بیزار سا شخص کھلے پاجامے اور ٹی شرٹ میں ایک سائیکل دھکیلتا صحن سے باہر سڑک پر آیا جس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی.. اس بلندی سے اس کی بیزاری دکھائی تو نہیں دیتی تھی لیکن میں نے قیاس کیا کہ اس قسم کے ڈربے میں سے.. کاٹھ کباڑ سے اٹے بوسیدہ صحن میں زندگی کرنے والا شخص بیزار ہی ہو گا.. اگلے کئی روز تک میں ایک پیپنگ ٹام کی مانند صبح سویرے گہرائی میں واقع اس شینٹی ٹاؤن کے صحن میں جھانکتا.. اور وہ عورت ہمیشہ ایپرن باندھے نُوڈل اُبال رہی ہوتی.. اور ایک معینہ وقت پر وہ بیزار شخص سائیکل سنبھالتا صحن سے باہر سڑک پر آ جاتا.. میں اس شخص کو اس کے کام کاج پر رخصت کر کے ہی نیچے ناشتے کے لیے جاتا..

پیس ہوٹل کے لش پش کرتے لشکتے پھسلواں سنگ مرمر کے شیشہ فرشوں پر اپنے آپ کو سنبھالتے.. یکدم سامنے آنے والے قد آدم آئینوں میں اپنے بے سروپا سراپے یکدم سامنے پا کر ٹھٹکتے کہ یہ کون چغد ہے اور پھر اپنے آپ کو پہچان کر کھسیانے ہوتے ہم اپنے میزبانوں کی معیت میں ڈائننگ ہال کو عام شہریوں کے لیے ہی مناسب جانتے.. اس سے درگزر کرتے گزرتے ایک مختصر سے.. ہماری آمد کی خوشی میں آراستہ پرائیویٹ ڈائننگ روم

میں داخل ہوئے جس کے درمیان میں ایک گردشی میز کے گرد کرسیاں لگی تھیں جن پر بیٹھنے سے حرکت کرنے کی گنجائش نہ رہتی تھی کہ وہ گردشی میز ہی پورے کمرے کو بھر دیتی تھی..

اس میز پر کراکری اور کٹلری کی نمائش ہو رہی تھی اور اس کے درمیان مختلف سلادوں کی رکابیاں اور طشت سجے تھے..

ہم کرسیوں پر براجمان ہو گئے.. ایک غیر ملک میں پہلے دن کی پہلی ضیافت میں ایک قابل توصیف تاثر ثبت کرنے کی غرض سے ہر رکن ایک نہایت متانت بھری بُوتھی بنائے.. کچھ شاعر.. شاعر دکھائی دینے کی کوشش میں خلا میں گھورتے ہوئے..

افسانہ نگار.. ذرا افسانوی ہوتا ہوا..

ناول نگار.. ایک سپیریئر نظر سے ہر ایک کو قدرے حقارت سے دیکھتا ہوا..

اور سفرنامہ نگار.. ضرورت سے زیادہ فرینک ہوتا اپنے آپ کو ایک آوارہ گرد اور لاپروا ثابت کرتا ہوا..

اور لیڈر.. کچھ بھی ثابت نہ کرتا ہوا.. اپنے نفیس گرے کوٹ میں سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتا اپنی لیڈری کے زعم میں..

اب ہم چین میں.. اپنے پہلے جینوئن چینی طعام کے منتظر تھے جس کی تاریخی حکایتیں ہم نے پڑھ رکھی تھیں اور سن رکھی تھیں کہ کبھی ازمنۂ قدیم میں کسی شاہانہ دعوت میں ایک مہمان خوراک کی کمی کے باعث بھوک سے انتقال کر گیا تھا اور اس سانحے کے بعد چینیوں نے طے کر لیا تھا کہ آیندہ کے ہزاروں برسوں میں اگر کسی مہمان کو مارنا ہی مقصود ہے تو اسے کھلا کھلا کر مارنا ہے... ہم نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ چین میں جب طعام کے دوران مہمان یہ سمجھتا ہے کہ بس یہ آخری کورس ہے تو وہ دراصل دعوت کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے بعد اتنے کورس آتے ہیں کہ مہمانان گرامی کورس میں الاپنے لگتے ہیں کہ.. تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں..

ہم میں سے بیشتر لاہور اور کراچی کے چینی ریستورانوں میں کھائے جانے والے بظاہر چینی کھانوں کے ندیدے رسیا.. اب اس تاریخی لمحے میں ان کھانوں کے

اور یجنل ذائقوں کے انتظار میں کچھ اپنی مونچھیں سنوارتے تھے..صرف ایک رکن اپنی ریش سنوارتے تھے اور بقیہ لوگ اپنے منہ سنوارتے تھے..اگرچہ بشمول اس خاکسار کے ہم میں سے بیشتر کے منہ ایسے تھے جو سنوارنے سے سنورتے ہی نہ تھے بلکہ مزید بگڑتے جاتے تھے..

ویسے ایک غیر ملکی چینی دانائے راز نے ایک بار فرمایا تھا کہ...اور آپ سے کیا پردہ کہ یہ غیر چینی دانائے راز میں خود ہوں..تو میں نے ہی فرمایا تھا کہ چینی لوگ ہر اس شے کو کھا جاتے ہیں جو حرکت کرتی ہو..تقریباً ہر شے..اس لیے کہ وہ انسانی حقوق پر یقین رکھتے ہیں اور انسان کھانے سے پرہیز کرتے ہیں...بہرطور انسانی ہمدردی اور بھائی چارہ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے..اگر انسان سارے کے سارے نوش کر لیے جائیں تو ظاہر ہے ہمدردی اور بھائی چارے کے لیے کون ہوگا..بس اسی لیے وہ انسانوں کے کھانے سے گریز کرتے ہیں..میں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ چینی ہر اس شے کو بھی کھا جاتے ہیں جو اڑتی ہے..طاقت پرواز رکھتی ہے..سوائے ہوائی جہاز کے..صرف اس لیے کہ وہ اسے پکڑ نہیں سکتے...شاید صرف اس لیے بھی کہ چین میں ان گنت چینی باقاعدہ مسلمان ہیں اور صدیوں سے مسلمان ہیں اور وہ اس ''پرندے'' کو حرام سمجھتے ہیں۔

ہمارے انگریزی اور اردو مترجموں نے ہمیں گردشی میز پر سجی سلاد کی ڈشوں کی طرف مائل کیا کہ آپ فی الحال سلاد چینی کریں..اصل خوراک آیا ہی چاہتی ہے..

تازہ سلاد میں کھیرے، ککڑیاں، مونگ پھلیاں اور کچھ نامعلوم سی سمندری کائی کی طرح کے ریشے اور لچھے تھے..میں نے اپنے پہلے باقاعدہ چینی طعام کا آغاز اس لچھے دار سبز کائی سے کیا تو مجھے اپنے گاؤں کا وہ جوہڑ یاد آ گیا جس میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے کبھی کبھار سبز کائی منہ میں چلی جاتی تھی تو بس وہی ذائقہ تھا..میں نے اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی بجائے بمشکل نگلا اور پھر ایک سبزی کی جانب رجوع کیا جو سوّیوں کی شکل میں تھی..میں نے اسے کانٹے میں پرو کر منہ میں ڈالنے کی سعی کی..میرے ایک نہایت دور افتادہ بزرگ نے جو دراصل میری بڑی خالہ جان کے سسر تھے اور حکمت میں بھی یکتا تھے، اپنے گھر میں سوّیوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی..انہیں ذائقے پر اعتراض نہ تھا صرف کھاتے

ہوئے ان کی لٹکاہٹ کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے..ان کا کہنا تھا کہ جس طور ایک انسان سوّیوں کے گچھے اپنے کھلے منہ میں گھسیڑتا ہے اور پھر وہ سوّیاں اس کے دہن سے لٹکتی ٹھوڑی کو آلودہ کرتی ہیں اور انسان سانس اندر کھینچتا، جبڑا چلاتا انہیں نگلنے کی کوشش کرتا ہے تو سراسر جانور لگتا ہے بلکہ وہ جانور جس کی موجودگی میں گھر میں فرشتے نہیں آتے..اگلے زمانوں کے بزرگ تھے اور انہی زمانوں میں فوت ہو کر معدوم ہو چکے لیکن میں نے جب بھی لچھے دار سوّیاں چاہے عید مبارک کے دن کھائیں یا فالودے میں سے تلاش کر کے دہن میں رکھنے کی کوشش کی تو ہمیشہ ان کا سنہری قول یاد آیا..کچھ یہی صورت حال آج چین میں درپیش تھی کہ یہ ریشے دار سوّیاں نما سبزی میرے منہ سے لٹکتی ٹھوڑی پر بہار دکھاتی تھی اور میں شڑپ شڑپ کر کے انہیں نگلنے کی کوشش کرتا تھا..

لیکن صرف یہی تنہا آزمائش نہ تھی۔ یہ جو کچھ بھی درپیش تھا اس میں کسی خاص تیل کی مہک تھی جو ابکائی کی صورت میں سب کچھ الٹاتی تھی..

دیگر اراکین کے چہرے بھی ابکائیوں کو روکنے کی مختلف حالتوں میں تھے..

میں نے کھیرے کی ایک پھانک اٹھا کر اسے آزمایا تو اس میں بھی وہی بساند تھی۔

اس خصوصی طعامی نشست گاہ میں کھلتی کھڑکیوں کے باہر بیجنگ کا منظر تھا..گرمی اور آسمان کا وہی رنگ تھا جو میں لاہور میں چھوڑ کر آیا تھا..سوائے اس فرق کے کہ..یہ وہاں سپاٹ چھتوں گنبدوں اور برج میناروں کو پگھلاتی ہے اور یہاں اس کی زد میں ڈھلوان سرخ چھتیں، بہت دوری پر ایک پگوڈا اور آسمان سے جانے کیا باتیں کرتے ہوئے سکائی سکریپر تھے..باتیں تو ظاہر ہے چینی زبان میں ہی کرتے ہوں گے..

چونکہ اس مختصر کمرے میں جتنی جگہ تھی اسے کھانے کی گردشی میز گھیرے ہوئے تھی اور ہم بمشکل اپنی کرسیوں میں ٹھنسے بیٹھے تھے۔ اس لیے ہوٹل پیس کی نہایت مستعد اور صاف ستھری اور مسکراہٹیں بکھیرتی خادمائیں جب ہماری خدمت کے لیے حرکت کرتی تھیں، تو ان کے بدن ہمارے شانوں سے کھہتے تھے..

لیکن اس کھے جانے کے عمل سے کسی بھی رکن کے شانوں میں کوئی سنسنی پھیل کر

اس کے پورے بدن میں کھلبلی نہیں مچاتی تھی کہ سب کے سب جوانی کی تڑپ اور مڈل ایج کی ہوس سے کہیں آگے جا کر بے حس ہو چکے تھے..

ایک خادمہ نے جھک کر ہمارے مترجمین سے کچھ دریافت کیا.. لیو اور خاور نے سر ہلایا اور پھر ہمیں متوجہ کر کے پوچھا: ''آپ کھانے کے ہمراہ کون سا مشروب پسند کریں گے.. بیئر' وائن یا کوکا کولا...''

اس پر ایک کورس کی شکل میں تقریباً سب اراکین نے بیک آواز پارسائی کا مشروب کوکا کولا اپنے حلق کو تر کرنے کے لیے طلب کیا اور وہ جو پارسا نہیں تھے اقلیت میں تھے تو انہوں نے بھی یہی بہتر خیال کیا کہ جمہور کی رائے سے اتفاق کیا جائے.. اگر وہ بولتے تو وہ طوطی ہوتے.. اور نقار خانے میں ان کی آواز کون سنتا تھا..

البتہ ایک بظاہر مخبوط الحواس اور جہاندیدہ شاعر نے اپنے طوطی ہونے میں کوئی قباحت نہ سمجھی اور بیئر کی فرمائش کر دی.. اس پر سب پارسا دانشوروں نے انہیں بری طرح گھورا اور گھورتے ہی رہے تو انہوں نے کہا: ''یار بیئر ہی منگائی ہے کوئی فحش کام تو نہیں کیا جو یوں گھور رہے ہو.. میں نے تمہارے نہ پینے پر اعتراض کیا ہے؟''

ان کی اس جرأت رندانہ سے کچھ اور اراکین کو حوصلہ ہوا اور انہوں نے بھی مصنوعی پارسائی ترک کر کے رندی اختیار کر لی..

مجھے اسلام آباد میں چینی سفیر کی جانب سے ہمارے مخدوش اعزاز میں دی گئی پچھلی شب کی وہ دعوت یاد آ گئی جہاں ایک طویل میز کے گرد ہم عزت مآب دانشور اپنے یوں یکدم عزت مآب ہونے کا یقین نہ کرتے ہوئے تشریف فرما تھے اور ہر مہمان کے سامنے کٹلری اور کراکری کے علاوہ کرسٹل کے تین تین گلاس دھرے تھے.. ایک تنگ منہ کا لامبا گلاس تھا اور دو ٹھگنے اور بھاری گلاس تھے.. لامبے گلاس کی تہہ میں ایک گھونٹ کسی سرخ روح افزا کا تھا' البتہ ٹھگنے گلاس زندگی کے خالی پن کا شکوہ کر رہے تھے..

چینی سفیر کی نہایت عمدہ اردو اور نہایت چینی شاعری سننے کے بعد جب ضیافت کا

باقاعدہ آغاز ہوا تو ایک ویٹر نے سفید اکڑے ہوئے نیپکن میں لپٹی ایک سفید چوکور بوتل کو بڑے اہتمام سے تھاما اور جھک کر ہر رکن کے کان میں سرگوشی کی.. اور ہر رکن کے کان سرخ ہو گئے اور اس نے زیر لب بڑبڑا کر شاید لاحول پڑھا اور انکار میں اتنی شدت سے سر ہلایا کہ اس جھٹک سے اس کی گردن کا منکا تڑخ سکتا تھا..

بدقسمتی سے اس ویٹر نے میز کے دوسرے سرے سے آغاز کیا..

اور میں ادھر اس سرے پر ایک مقامی انگریزی شاعر کی شاعری نہایت دقت سے سن رہا تھا اور صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں انگریزی میں ید طولیٰ رکھتا ہوں' داد بھی دے رہا تھا.. لیکن میں نے یہ نوٹ کیا کہ انگریزی شاعر کی توجہ بھٹکنے لگی ہے اور بھٹک کر اس چوکور بوتل تک جا پہنچی ہے جسے ویٹر نے ایک نومولود کی طرح نیپکن میں لپیٹ رکھا ہے..

''یہ موتائی ہے..'' انگریز شاعر نے بالآخر کہا.. اور نہایت دکھ سے کہا۔

''کس کی موت آئی ہے؟''

''چین کی بہترین شراب ہے.. حیرت ہے کہ یہ لوگ انکار کیوں کر رہے ہیں..''

''شاید یہ یقین نہیں کرتے کہ موت آئی ہے.. آپ اپنے شعر سنائیں..''

وہ شعر کیسے سناتے کہ وہ تو موت کے آنے کے منتظر تھے اور موت کے بعد مرنے کے منظر کے منتظر تھے..

جب متعدد اراکین نے نہایت حقارت سے اس موت کو رد کر دیا اور سفید بوتل کنواری کی کنواری ہی رہی تو میرے برابر میں براجمان انہی بظاہر مخبوط الحواس جہاندیدہ شاعر کی جان پر بن گئی اور انہوں نے میرے کان میں کہا'' تارڑ صاحب.. یہ سب بے وقوف انکار کیے چلے جاتے ہیں کہیں یہ ویٹر بددل ہو کر ریٹائر نہ ہو جائے اور ہماری بزم تک یہ جام ہی نہ آئے..''

لیکن ان کے یہ خدشات باطل ثابت ہوئے اور ویٹر بھی ثابت قدم رہا اور بالآخر یہ دور جام ہم تک آ ہی گیا.. اور جب اس نے.. یعنی ویٹر نے پہلی مرتبہ گردن کا منکا توڑ دینے والا سر جھٹک کر انکار کر دینے والا ردعمل نہ دیکھا بلکہ شرمندگی اور چاہت کا اثبات دیکھا

تو وہ ہکا بکا رہ گیا اور پھر پُر مسرت ہو گیا.. اور نفی اثبات کا پانی گلاسوں میں انڈیلنے لگا.. بلکہ آس پاس ہی منڈلانے لگا کہ کہیں کوئی معزز مہمان پیاسا نہ مر جائے۔

حسرت ناک نے لامبے گلاس کی تہہ میں جو ایک سرخ گھونٹ تھا وہ حلق میں اتارا اور برا سا منہ بنا کر بولا ''اوئے شربت تو نہیں..'' اس پر ایک نزدیکی ویٹر نے فوراً اس کے گلاس کو جو شربت نہیں تھا اس سے لبریز کر دیا۔ ''اوئے نہیں بھائی.. یہ میرا ڈیپارٹمنٹ نہیں..''

دراصل لامبے گلاس میں وہ ایک گھونٹ سرخ وائن کا تھا.. یعنی اگر آپ وہ گھونٹ بھر لیتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ خبائث کا شوق رکھتے ہیں اور مزید کے طلبگار ہیں..

چنانچہ اسلام آباد میں ہی.. سفر کی پہلی شب میں ہی رندوں اور پارساؤں کی واضح تقسیم عمل میں آ گئی..

اور اب ہم بیجنگ میں تھے..

کچھ لوگ اپنے مشروبات سے اپنے مسوڑھے گرم کر رہے تھے اور بیشتر انہیں ٹھنڈا کر رہے تھے.. تھوڑی دیر بعد باقاعدہ خوراک کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا.. بلکہ تانتا بندھ گیا..

ہماری میز پر تہہ در تہہ.. بلکہ منزل بہ منزل ڈشیں انبار کی جانے لگیں اور جب گردشی میز ناکافی ثابت ہوئی تو سائیڈ ٹیبلز لگا کر ان کی رہائش کا بندوبست کیا گیا.. یہ کچھ نہ سمجھ میں آنے والی عجیب و غریب اجنبی خوراکیں تھیں..

ان کی شکلیں اور صورتیں.. ہمارے ہاں کے چینی کھانوں سے کوئی میل نہ رکھتی تھیں.. نہ کوئی سلگتا ہوا چکن منچورین آیا.. نہ بیف وِد ویجی ٹیبل دکھائی دیا.. چکن وِد پائن ایپل کا دور دور تک پتہ نہ تھا.. سپرنگ فرائیڈ چکن یا فرائیڈ پرانز بھی کہیں نہ تھے.. یہاں تک کہ چکن کارن سُوپ اور ایگ فرائیڈ رائس بھی غائب تھے.. جو خوراک بھی آئی قطعی طور پر ناآشنا اور نامحرم آئی..

اس خوراک کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد ہم مسلمانوں کا قدرتی اور ہماری ذات

میں جڑیں پھیلائے ایک ردعمل سامنے آیا.. جب کسی نے استفسار کیا ''کیا یہ سب کچھ حلال ہے؟''

''حلال؟'' خاور نے اپنی عینک درست کر کے اپنی نوخیز عمر سے کہیں زیادہ چالاک چہرے کے ساتھ بھولپن سے پوچھا ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ...'' ہمارے وفد کے سب سے زیادہ سفید ریش شاعر.. جو ایک زمانے میں صرف شاعر ہوا کرتے تھے اور اپنی روح کو بیباکی سے بیان کیا کرتے تھے اور اب ذرا روزِ آخرت کی فکر میں کچھ مذہبی ہو گئے تھے۔ ''مطلب یہ خاور میاں کہ.. کہ کیا ہم مسلمان اس خوراک کو کھا سکتے ہیں.. یہ حلال ہے کہ نہیں؟''

خاور اور لیو نے کچھ دیر خادماؤں اور ہوٹل کے ایک نمائندے سے گفتگو کی اور پھر پُر جوش انداز میں اعلان کیا ''جناب یہ مُسلم فوڈ ہے.. اس کی ہمیں گارنٹی دی گئی ہے آپ بے فکر ہو کر اسے کھائیں..''

یہ انکشاف تو بہت بعد میں ہوا کہ چینیوں کے نزدیک ''مسلم فوڈ'' سے کیا مراد ہے.. ویسے میں اپنے آپ کو لبرل عناصر میں شمار کرتا ہوں لیکن میری لبرل ازم کی بھی ایک حد ہے یعنی میں بھی مینڈکوں، کتوں، سانپوں اور کیڑوں مکوڑوں کو نوش کرنے سے قدرے اجتناب کرنا پسند کرتا ہوں.. اگرچہ اس فوڈ کو سرکاری طور پر مسلم فوڈ ڈیکلیئر کیا جا چکا تھا لیکن اس کے باوجود طبیعت ادھر نہیں آتی تھی.. ویسے تو میز پر سجے طعام میں مچھلی بھی تھی.. مرغی اور گائے کا گوشت بھی تھا.. لیکن عجیب بے سواد اور روکھا اور بے روح.. اور وہی بساندہ ناگوار مہک والا ذائقہ جو معدے میں داخل ہوتے ہی واپسی کا ٹکٹ کٹا لیتا تھا..

''تارڑ صاحب..'' لیو جو نہایت اشتیاق سے ہر ڈش چکھ رہا تھا اور ذائقے کی جنت میں قیام پذیر تھا مجھ سے مخاطب ہوا ''آپ کی ایک خواہش تو پوری ہو گئی ہے یعنی چین کے اوریجنل کھانے آپ کھا رہے ہیں.. باقی پانڈا رہ گیا تو وہ بھی دکھا دیں گے۔''

''لیو برادر.. مائنڈ نہ کرنا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ چینیوں کو اپنے چینی کھانے بنانے بھی نہیں آتے.. تم اگر لاہور آؤ تو تمہیں اصلی چینی فوڈ کھلاؤں.. ہم لاہوری ہی چینی کھانے بنا سکتے ہیں.. آپ جانتے ہیں کہ ہمارے انتخاب عالم اور آپ کے چینی دانشور جو

اردو کے بڑے باکمال شاعر ہیں‘ ہر برس پاکستان صرف اس لیے تشریف لاتے ہیں کہ وہاں اصلی چینی فوڈ سے لطف اندوز ہوسکیں..‘‘

’’میں اسلام آباد میں تھا..‘‘ خاور نے ایک طالب علم کی طرح ہاتھ کھڑا کردیا۔

’’اور میں نے وہاں بہت پاکستانی فوڈ کھائی ہے جو بعد میں مجھے بتایا گیا کہ وہ چینی تھی..اس میں مرچیں بہت تھیں..لیکن مزیدار تھی..‘‘

جو ڈشیں سراسر اجنبی تھیں‘ ان کے بارے میں مَیں تشویش میں مبتلا رہا۔اس لیے بھی کہ دو برس پیشتر ناول نگار عبداللہ حسین چین آئے اور اسی قسم کی ایک ضیافت کے دوران اپنے تئیں مخدوش خوراکوں سے اجتناب کرتے ہوئے صرف پکوڑے کھاتے رہے..تا آنکہ ان کے مترجم نے ان کا ہاتھ روک لیا اور گزارش کی کہ انہیں ذرا کم کھائیں..

عبداللہ نے پوچھا..’’کیوں؟‘‘

تو مترجم نے دریافت کیا’’آپ جانتے ہیں کہ یہ کیا ہیں؟‘‘

’’پکوڑے ہیں اور کیا ہیں؟‘‘

’’اگرچہ یہ پکوڑے دکھائی دیتے ہیں..لیکن یہ فرائیڈ سکارپین ہیں..تلے ہوئے بچھو‘‘

عبداللہ حسین کا کہنا ہے کہ ان کا تلے ہوئے بچھو ہونا اپنی جگہ لیکن انہوں نے زندگی بھر اتنی کڑکڑاتی اور لذیذ خوراک نہیں کھائی تھی..

انتظار حسین نے بھی ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ وہ ابھی تک چین صرف اس لیے نہیں گئے کہ چینی دسترخوان سے گھبراتے ہیں..

اور واقعی چینی دسترخوان ایسا ہے کہ اس کے سامنے آپ کی تمام تر لبرل ازم‘ بین الاقوامیت اور فراخ دلی ہتھیار ڈال دیتی ہے..صرف اس لیے کہ ہم میں اور چینیوں میں خوراک کے ذائقے اور معیار مختلف ہیں۔یہ وہ مشرق ہے جس کی اقدار اور خوراک سے ہم سمجھوتہ نہیں کر سکتے..چین ایک دنیا ہے جس کے ذائقے اور زندگی ہم سے مختلف ہے..شاید ہماری تاریخی اور جغرافیائی حالت ایسی ہے کہ ہم مغرب کی قربت میں بے آرام نہیں

ہوتے..ہم برگر..کلب سینڈوچ یا کینٹکی چکن سے تو مفاہمت کرسکتے ہیں لیکن اپنے دوست اور ہمسائے چین کے رنگ میں نہیں رنگے جاسکتے..یہ ہماری تاریخی اور جغرافیائی مجبوری ہے..

تنازع خوراک کا نہیں..تہذیب اور تاریخ کا ہے..

خوراک بھی ایک عقیدے کی طرح ہوتی ہے جس میں آپ جنم لیتے ہیں اور اس سے روگردانی ممکن نہیں ہوتی..

نہایت کریہہ النظر گوہ‘ چھپکلے‘ ٹڈیاں‘ کیکڑے‘ اونٹ کے سری پائے‘ کپورے اور بکرے کی آنکھوں کے تکے بھی اگر حلال ہیں تو عقیدے کی رو سے..اگر ان کی نسبت کہیں زیادہ شفاف اور ستھرے..سانپ‘ گدھے‘ کتے یا مینڈک ہمارے عقیدے کی زد سے باہر ہیں تو یہاں بحث کی کیا گنجائش ہے..

اور ان چینیوں کی جہالت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ سُوپ کھانے کے آغاز پر نہیں اختتام پر پیش کرتے ہیں..

چونکہ سب لوگوں نے اس چینی خوراک کو ذہن میں کم اتارا تھا اور نظروں سے زیادہ چکھا تھا‘ اس لیے قابل فہم طور پر قدرے ناآسودہ اور بھوکے تھے..چنانچہ ایک اجتماعی التجا کی گئی کہ دوستو ہمارے ہاں تو چینی خوراک کا سب سے اہم جزو چاول ہوتے ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتے تو کیا کچھ ایگ فرائیڈ رائس وغیرہ کا بندوبست ہوسکتا ہے..ہماری یہ درخواست سن کر ہمارے مترجم..میزبان اور خادمائیں تک سب کے سب خفا ہوگئے..

اس لیے کہ چین میں..یا کم از کم چین کے جس حصے میں ہم تھے..کوئی بھی چاول نہیں کھاتا تھا۔یہ صرف غربا اور مساکین کی خوراک سمجھی جاتی تھی۔اور اگر کوئی مہمان ان درجنوں نایاب ڈشوں کے باوجود چاولوں کی فرمائش کرتا تھا تو گویا چینیوں کی مہمان نوازی کی روایت پر اور ان کی عزت نفس پر حملہ آور ہوتا تھا۔یعنی وہ موجودہ خوراک سے مطمئن نہیں ہوا تھا‘ اس لیے چاول مانگتا تھا..جب ہم نے بہت ہی منت سماجت کی تو انہوں نے نہایت ناگواری سے چاول منگوائے جو چھوٹے چھوٹے پیالوں میں تھے..ابلے ہوئے اور

موٹے اور گیلے تھے.. ہم نے ان پیالوں میں تھوڑا سا سوپ انڈیل کر انہیں قابل استعمال بنا لیا. لیکن اب ایک اور مسئلہ درپیش تھا. میز پر سیاہ مرچ اور نمک مفقود تھے اور ہم چاہتے تھے کہ چاولوں اور سوپ کے ملغوبے پر انہیں چھڑک کر ذرا ذائقہ بہتر بنا لیا جائے.. تو اس مسئلے کے حل کے لیے ہم نے لیڈر سے رجوع کیا جو چینی زبان کا عالم بے بدل تھا..

لیڈر نے ہماری درخواست پر پہلے تو اپنی طلسمی مسکراہٹ اور گرے سوٹ کا لشکارا ڈالتے ہوئے زیر لب ہم سے کہا کہ.. اگر میز پر نمک اور سیاہ مرچ موجود نہیں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ ان کے ہاں انہیں معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے اگر ہم یہ اشیاء طلب کریں گے تو نہ صرف پاکستان کا امیج برباد ہو جائے گا بلکہ میزبانوں کے ناراض ہو جانے کا بھی احتمال ہے..

''ہو جائیں.. ہو ہو جائیں ناراض..'' ایک رکن جو بھوک سے نڈھال ہکلاپے میں مبتلا ہو چکے تھے بہت ہکلے ہو گئے۔ ''آپ آپ نمک مرچ منگائیں..''

یہ کھلی بغاوت تھی جسے لیڈر نے پسند نہ کیا اور سیریس ہو گیا۔ ''لیڈر کی حیثیت سے میرا فرض ہے آپ کو سمجھانا.. آپ نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے.. اگر اس درخواست پر میزبان برا مان گئے تو آپ ذمہ دار ہوں گے۔''

''بے بے شک برا.. مان مان جائیں.. ہم یہاں بھوک کے مرنے کو تو نہیں آئے...''

اور ہاں... خاور لیو اور وانگ لی ہماری حالت زار سے بے خبر چاپ سٹکس چلاتے تھے اور مرغیوں' مچھلیوں اور شاید مینڈکوں کے بدنوں کو اُچکتے انہیں ڈھانچوں میں بدلتے تھے.. چین میں خوراک اپنی پلیٹ میں ڈال کر کھانے کا رواج نہیں بلکہ چاپ سٹکس سے براہ راست اسے ڈش میں سے دبوچ کر منہ میں اتارا جاتا ہے..

لیڈر نے مجبوراً نزدیک ترین ویٹرس کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے جس کی مختصر چینی پشت لیڈر کے شانوں کو چھوتی اس کے بوڑھے بدن میں روحانی اور قلبی مسرت کے ٹیکے لگاتی تھی..

''نی ہاؤ سا...'' لیڈر نے اٹک اٹک کر کہا..

''تمہارا کیا حال ہے..'' میں نے دل ہی دل میں ترجمہ کیا کیونکہ چینی یاترا سے قبل میں نے ایک گائیڈ بک میں روزمرہ کی بول چال کے چند چینی فقرے رٹ لیے تھے..

''شی اے.. شی اے.. ہن پاؤ'' ویٹرس نے جواب دیا.. میں بالکل ٹھیک ہوں.. شکریہ.

''وہ شر پا چستان ان..'' لیڈر تو چینی میں فلوئنٹ ہو گیا یعنی میں پاکستانی ہوں..

''شی اے.. شی اے'' ویٹرس نے کوئی خاص خوشی کا اظہار نہ کیا..

''زائے چی ان...'' لیڈر نے نہایت انہاک اور سنجیدگی سے.. ایک پاکستانی کنفیوشس کی سنجیدگی سے کہا..

میں نے دل ہی دل میں پھر ترجمہ کیا تو اس کا مطلب شاید یہ بنتا تھا کہ ٹائلٹ کدھر ہے..

''نہیں نہیں..'' لیڈر نے فوراً تصحیح کی.. غالباً اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس نے نمک مرچ کی بجائے ایک کموڈ کی فرمائش کر دی ہے.. اس کے بعد لیڈر نے جو کچھ کہا وہ میری وکیبلری سے باہر تھا.. لیکن ویٹرس قدرے جھک کر چلی گئی اور پانی کا ایک گلاس لے آئی..

لیڈر نے پانی کے گلاس کو دیکھا تو فوراً... پو پو.. یعنی نہیں نہیں کہا اور پھر شستہ چینی زبان میں اس کی سرزنش کر کے اپنی طلسمی مسکراہٹ بکھیر کر بولے ''اب یہ خالص چینی زبان نہیں سمجھتی تو میں کیا کروں..''

اس پر ایک فربہ ہوتے ہوئے نسبتاً نوجوان شاعر نے بھنا کر اپنے سامنے رکھے چاولوں کے ملغوبے کی جانب اشارہ کر کے اس پر ہاتھوں سے کچھ جھٹکتے ہوئے کہا ''سوہنیو.. لُون مرچ لیا دیو..''

اور حیرت انگیز طور پر وہ عفیفہ فوراً نمک مرچ لے کر آ گئی..

''دراصل چین کے مختلف علاقوں میں قطعی طور پر جدا جدا لہجے اور زبانیں ہیں.. یہ ویٹرس غالباً شمال سے تعلق رکھتی ہے اس لیے میری کلاسیکی چینی اس کے پلے نہیں پڑتی..''

لیڈر نے توجیہہ پیش کی جو ہم نے فوراً قبول کر لی..

گیلے اور موٹے چاولوں پر سوپ کا چھڑکاؤ اور ان پر سیاہ مرچوں اور نمک کی ہلکی

سی بارش...اس چینی خوراک کے بعد پانی کے دو تین گلاس اور ہم سیر ہو گئے..

لنچ کے اختتام پر لیڈر نے ہم سب کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہوئے میز بانوں کا شکریہ ادا کیا..کھانے کی بے پناہ توصیف کی اور دعا دی کہ جس طور یہ کھانا فراوانی میں تھا اور ذائقے دار تھا' خدا کرے کہ ہم دونوں ملکوں کی دوستی بھی ایسی ہی ہو۔

یہ کوئی اچھی دعا نہ تھی..بہر حال..

کھانے سے فارغ ہوتے ہی لیو نے بگل بجا دیا ''اب ہم شیڈول کے مطابق فوری طور پر اپنی کوچ میں سوار ہوں گے اور عظیم دیوارِ چین دیکھنے جائیں گے..چلئے..''

''خواہ مخواہ چلئے..'' بھوک سے ہکلا جانے والے رکن کو چاولوں کے باوجود زیادہ افاقہ نہیں ہوا تھا اور ابھی تک ہکلاہٹ میں برقرار تھے۔''میں ابھی اپنے کمرے میں جاؤں گا..ٹائلٹ جاؤں گا..پھر آؤں گا..''

''لیکن دیوارِ چین..''

''پچھلے کئی ہزار برس سے وہیں ہے ناں جہاں تھی..جتنی دیر میں مَیں کموڈ پر بیٹھوں گا اتنی دیر میں کہیں چلی تو نہیں جائے گی..''

ہم سب نے اجتماعی طور پر اس رکن کے ذوقِ جمال اور تاریخی جہالت پر کفِ افسوس ملا جس نے دُنیا کے ساتویں عجوبے کو...ایک کموڈ پر ترجیح دی تھی۔

''گریٹ وال آف چائنہ..ایک مُردہ اژدھا''

تتلی خوش تھی کہ وہ دیوارِ چین دیکھنے کو جا رہی تھی..پھڑ پھڑاتی تھی اور آنکھیں گول گول گھماتی تھی اور مجھے اس کی خوشی سمجھ میں نہ آتی تھی کیونکہ میری معلومات کے مطابق وہ چینی نژاد تھی..اسے لی پو نے تخلیق کیا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے آج تک دیوارِ چین نہ دیکھی ہو..

''تم نے آج تک دیوارِ چین نہیں دیکھی..''

''نہیں۔''

''ایک چینی نژاد تتلی ہونے کے باوجود نہیں دیکھی..''

''نہیں..''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں ابھی تک لی پو کی شاعری میں ایک حنوط شدہ حالت میں تھی اور پھر تم نے پاکستان میں بیٹھ کر اپنے تخیل کے زور پر مجھے زندہ کیا..دیکھا جائے تو اس حوالے سے میں ایک پاکستانی نژاد تتلی ہوں تو تمہارے ساتھ چین دیکھنے چلی آئی ہے..اب دیکھتے ہیں کہ چین کی یادگاروں کو دیکھ کر مجھے اپنا ماضی یاد آتا ہے کہ نہیں..''

''لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ ہم دونوں میں سے تتلی کون ہے اور تارڑ کون ہے..''

''نہیں..''

''اس کا فیصلہ کب ہوگا؟''''

''کبھی نہیں..''

ہماری خُرخُراتی ہوئی بلّی جو گویا ایک ایرانی قالین پر آسودگی سے بے آواز چلتی تھی' دراصل ہماری کوچ تھی جو اتنی نرماہٹ سے رواں تھی کہ ہم یقین نہ کر سکتے تھے کہ اس کے ٹائروں تلے تارکول کی سختی ہے..

یہ ہمارے میزبانوں کی زیادتی تھی کہ چین میں ہمارے پہلے دن ہی انہوں نے ہمارا مقابلہ چین کی سب سے بڑی یادگار سے کروا دیا تھا..ہمیں ابھی باکسنگ کا کچھ پتہ نہ تھا اور انہوں نے محمد علی کے ساتھ ہمیں رِنگ میں دھکیل دیا تھا..ابھی ہم شملہ پہاڑی پر چڑھنے کے لائق نہ تھے اور انہوں نے ہمیں کے ٹو کے مقابل لا کھڑا کیا تھا..

بیجنگ کی سویر میں جو رونق تھی وہ چھٹ چکی تھی اور اب صرف شاہراہیں مصروف تھیں یا نئی عمارتوں کی تنہائی اور ویرانی بیجنگ کے آسمان کو چھوتی تھی۔

بیجنگ سے نکلتے ہی ہماری کوچ پانچ چینی لڑکیوں کے سفید مجسموں کے گرد گھُومی..

ان چینی مٹیاروں کے ہاتھ ایک دوسرے میں گُندھے ہوئے تھے اور وہ ایک نیم دائرے میں حرکت کے انداز میں ساکت تھیں اور ان کی پونی ٹیلز جو بظاہر ہے پتھر کی تھیں ہوا' میں معلق تھیں۔ میں خاص طور پر اس مجسمے کا تذکرہ اس لیے کر رہا ہوں کہ جب ہماری کوچ ان کے گرد گھومی تو سکوت میں آئے ہوئے پتھریلے بدن گویا حرکت میں آ گئے کہ ان کے رقص میں گھومنے اور ہماری کوچ کے ان کے گرد گھومنے میں کوئی ایسا تناسب تھا کہ وہ پانچوں کِکلی ڈالنے لگیں۔ کِکلی کلیر دی پگ میرے وِیر دی..دوپٹہ میرے بھائی دا..فٹے منہ جوائی دا۔ الاپتی ہوئی پنجابی مٹیاریں ہو گئیں اور دائرے میں رقص کرتی گھومنے لگیں..لیکن یہ صرف پل دو پل کا کھیل تھا..جونہی ہماری کوچ ان کے گرد ایک گھمن گھیری کھا کر باہر نکلی تو وہ پھر سے پتھرا گئیں..

ان مجسموں کو تراشنے والا اور اس گول دائرے میں نصب کرنے والا جو بھی مجسمہ ساز

تھا' وہ حرکت کے تناسب کا ماہر تھا اور جانتا تھا کہ یہاں سے روزانہ ہزاروں بسیں' کوچیں اور کاریں گزرتی ہیں اور وہ ایسے زاویے پر گھومیں گی کہ انہیں یہ پانچ لڑکیاں رقص کرتی دکھائی دیں گی..

ہم بیجنگ سے دور نکل آئے تھے اور ایک انجانی شاہراہ پر رواں تھے جس کے دونوں جانب گھنے جنگل اور جھاڑیاں تھیں جو قدرت کا عطیہ نہیں تھیں' انسانی کاوشوں کا ثمر تھیں..اس شاہراہ پر ان گنت کوچیں سیاحوں سے لبریز بقول خاور' گریٹ وال کی زیارت کو جا رہی تھیں..

''کیا تم میں ایک ہیجان نہیں ہے..'' تتلی نے ایک بیلے رینا کی مانند نازکی سے پَر سمیٹ کر کہا۔

''کس بات پر؟''

''یہی کہ چین میں یہ تمہارا پہلا دن ہے اور تم دنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے ایک کی زیارت کو جاتے ہو..عام زیارتیں تو ایک مقام پر..ایک جگہ موجود ہوتی ہیں ٹھہری ہوتی ہیں اور یہ زیارت تقریباً ڈھائی ہزار کلومیٹر تک چلی جاتی ہے..کیا تم میں ہیجان نہیں ہے؟ تم ایکسائیٹڈ نہیں ہو؟''

''میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ نہیں..لیکن اس کے باوجود کہوں گا کہ نہیں میں ایکسائیٹڈ نہیں ہوں۔''

''کیوں؟''

''دیواریں ہمیشہ بند باندھتی ہیں..قید میں رکھتی ہیں..تقسیم کرتی ہیں..اپنے پاکستان میں تھوڑی دیواریں ہیں جن سے ہم سر پھوڑتے ہیں' اس لیے میں کسی ہیجان میں مبتلا نہیں ہوں..''

''لیکن اس دیوار نے چین کی حفاظت کی..اسے منگولوں سے بچایا..''

''ہاں اسے شمال سے آنے والے حملہ آوروں سے بچایا اور اس کے ساتھ ہی کُل دنیا کی ثقافت اور سوچ سے بھی بچا لیا..چینی اپنی چار دیواری میں گم ہو کر رہ گئے..اور جب یہ

گراں خواب سنبھلے تو انہیں احساس ہوا کہ اگر دیوارِ چین نہ ہوتی تو شاید وہ پہلے سنبھل جاتے..میری معلومات کے مطابق یہ دیوارِ چین کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔''

تتلی پہلے ادائیں دکھاتی تھی' نخرے کرتی تھی' اب سنجیدہ ہوگئی۔''ہر قوم کو ایک دیوارِ گریہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ساتھ لپٹ کر وہ اپنے ماضی کا نوحہ بیان کر سکے اور دل کی بھڑاس نکال سکے.. یہودی ہیکل سلیمانی کی دیوار کو چومتے چاٹتے ہیں..تم لوگ حجرِ اسود سے لپٹتے ہو..اپنے ماضی کی دیوار سے ایسے چمٹے ہو کہ اس کا حصہ ہوگئے ہو.. عیسائیوں کے پاس صلیب کی دیوار ہے جسے وہ کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں..ہندو اپنی رامائن اور مہابھارت کی دیواروں میں پناہ لیتے ہیں..اور پارسیوں کی دیوار آگ کی ہے.. ادھر بہاء اللہ قرۃ العین طاہرہ کے شعروں کی دیوار کے سائے میں ہے..کیا یہ سب دیواریں بیکار نہیں؟..تو پھر اگر چینیوں نے بھی لاکھوں جانیں قربان کر کے ایک بے مقصد اور بیکار دیوار تعمیر کر لی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟..

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''کم از کم یہ دیوار نظر تو آتی ہے..تمہارے پاکستان میں بلکہ میرے پاکستان میں ہر سو دیواریں ہیں اور وہ نظر بھی نہیں آتیں...ہم تم تو اعتراض کر بھی نہیں سکتے...''

چونکہ ایک تتلی کی حیات ایک کریہہ النظر سنڈی میں سے جنم لیتی ہے اور پانچ سات روز میں فنا ہو جاتی ہے تو ایسی مختصر حیات والے کیڑے مکوڑے سے بحث نہیں کی جا سکتی..اس لیے میں نے اپنا منہ بند رکھا اور تتلی نے بھی پر سمیٹے رکھے..

تقریباً پونے دو گھنٹے کی مسافت کے بعد کوچ کی ونڈ شیلڈ میں سے سامنے کی پہاڑیوں میں بل کھاتا ایک سفید اژدھا دکھائی دیا..یہ اژدھا پھنکارتا نہ تھا بل کھاتا..مردہ حالت میں..بلندیوں اور پستیوں میں اونچا اور نیچا ہوتا چلا جاتا تھا..اس کے نظر آتے ہی کوچ میں براجمان مسافر چپ ہوگئے..اس کے احترام میں خاموشی اختیار کر لی گئی..جیسے جس کا جو عقیدہ ہے وہ اس عقیدے کی بنیاد عمارت یا یادگار کو نظر کے سامنے پاتا ہے تو چپ ہو جاتا ہے..

دیوارِ چین کے دو ہزار چار سو ستر کلومیٹر طویل اژدھے کے بدن کا ہر حصہ نمائش کے لیے نہیں ہے۔ بیجنگ کی قربت میں تین مقام ایسے ہیں جہاں اس دیوار کو سیاحوں کے لیے نمایاں کیا گیا ہے..ہم ان میں سے کسی ایک مقام پر جا رکے..رکے اور باہر آئے تو باہر ایک شہر آباد تھا..جس میں چینی اور غیر ملکی سیاح یاجوج ماجوج کی طرح یلغار کرتے تھے' جو اس دیوار کو چاٹنے آئے تھے..

یہ دیوار کو چاٹنے والوں کے لیے ایک عارضی شہر تھا۔

سینکڑوں گفٹ شاپس' ریستوران' ٹائلٹ...دیوار کے یادگاری ماڈل' پوسٹ کارڈ' گائیڈ بکس..کیلنڈر اور بے شمار کاٹھ کباڑ جو سیاحوں کی مرغوب غذا ہے...اور وہ ہزاروں کی تعداد میں اس شہرِ دیوار میں اترے ہوئے تھے..ان میں سے بیشتر کے بٹوے ڈالروں' پاؤنڈوں اور ینوں سے بھرے پڑے تھے اور ہماری جیبوں میں پاکستانی روپے تھے جن کا کوئی طلبگار نہ تھا..

لیو نے کوچ سے اترتے ہی اپنے سابقہ تجربے کو بروئے کار لا کر مسکراتے ہوئے کہا''آپ میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے نہایت تحمل سے دو گھنٹے کا یہ سفر برداشت کیا اور ایک بار بھی ٹائلٹ نہیں گئے تو ان سے درخواست ہے کہ فوری طور پر سامنے جو ٹائلٹ روم ہیں ان میں جا کر فرحت حاصل کریں۔''

چنانچہ پورے ڈیلی گیشن نے اس اعلان پر لبیک کہا اور فرحت حاصل کی..

اس فراغت کے بعد لیو نے سرکاری خرچے پر ہم سب کے لیے منرل واٹر کی ایک ایک بوتل کا بندوبست کیا اور ہم اس بوتل کو ایک فیڈر کی مانند سینے سے لگائے اس بازارِ دیوار میں سے گزرنے لگے..شاپنگ کرنے لگے' بھاؤ تاؤ کرنے لگے..دیوار کے نہایت عامیانہ سے ماڈل خریدنے لگے...یہاں یادگاری تحفوں یعنی سوونیئرز کی اتنی ورائٹی تھی کہ ہم ضبط سے کام نہ لیتے تو دورۂ چین کے لیے عطا کردہ حکومت پاکستان کے تمام تر ڈالر یہیں جلا کر راکھ کر دیتے..

میں نے اپنے بیٹوں کے لیے اور اپنے لیے وہ سرخ پی کیپیں خریدیں جن پر

"گریٹ وال آف چائنا" کاڑھا ہوا تھا..

میں نے منرل واٹر کے فیڈر سے ایک گھونٹ بھرا اور گریٹ وال آف چائنا کی پی کیپ اوڑھ کر دیوار کی زیارت کے لیے کمربستہ ہو گیا..

لیکن اس کمربستگی سے پیشتر میں اس شہر دیوار میں ذرا آوارہ ہو گیا کیونکہ میرے بیشتر ساتھی ابھی تک سوونیئر شاپس کی شاطر خواتین کی گرفت سے باہر نہیں آئے تھے..اور دھڑا دھڑ ڈالر جلا رہے تھے..

بازارِ دیوار سے ذرا ادھر فٹ پاتھ پر مقامی کسان اپنے باغوں کے پھل فروٹ سجائے بیٹھے تھے..جن میں کچے اور کھٹے انگور تھے..نابالغ آڑو اور آلوچے تھے...اور کچھ عجیب سی ناشپاتیاں اور خوبانیاں سی تھیں..سیاح ان چینی پھلوں کو نہایت رغبت سے خرید کر چکھ رہے تھے اور پھر بڑے برے منہ بناتے تھے..میرے گھر کے قریب فردوس مارکیٹ میں..اسی اداکارہ فردوس کی مارکیٹ میں جو کسی زمانہ میں ہیر ہوا کرتی تھی اور اس کی بہت مارکیٹ تھی..اور اب بوڑھی اور بیکار ہو چکی ہے...اور اپنے شاندار ماضی کو منشیات کی مجبوری اور خمار میں زندہ کرتی ہے تو اس مارکیٹ میں اللہ رکھا سبزی والا ہے جس کی دکان میں..سبزی کے سوا ایسے پھل سجے ہوتے ہیں کہ انہیں صرف دیکھنے سے بھوک مٹتی ہے..سیب' انگور' میٹھے گرمے' کیلے' جاپانی پھل' چکودرے' مالٹے' تربوز...خوش شکل اور خوش ذائقہ..لیکن ان پاکستانی پھلوں کی کوئی قدر نہیں ہوتی..

ہمارے پھل چینی اور میرے تجربے کے مطابق..ایرانی..عربی اور یورپی پھلوں سے کہیں خوش نظر اور شاندار ہیں..

صرف ایک سندھڑی آم کو ہی مقابلے میں لایا جائے تو وہ کل دنیا کو مات دے سکتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ پھل کی کمین ہیں کہ وہ ایک کرپٹ اور بدنام ملک کی پیداوار ہیں۔اور چین کے کھٹے انگور اور نابالغ آڑو ان پر حاوی ہو جاتے ہیں..

صرف اس لیے کہ چین کی عزت نفس ہے..اس کا وقار دنیا بھر میں ہے۔

دیوار کی زیارت سے قبل ہمیں اس کی تاریخ اور تعمیر سے آگاہ کرنے کے لیے

ایک سنے راما تھیٹر میں لے جایا گیا جہاں چاروں جانب اس دیوار کی تعمیر اور مختلف جگہوں کے مناظر حرکت کرتے تھے..توپیں داغی جا رہی تھیں اور سرپٹ بھاگتے گھوڑے جن کے سموں کی ٹاپیں ہائی فائی ساؤنڈ میں کانوں کے پردوں کو لرزاتی تھیں..یہ ایک ٹریلر تھا..ایک تعارف تھا..

دیوارِ چین جو اس پُررونق شہر کی گہما گہمی میں نظر نہیں آتی تھی..وہاں تک پہنچنے کے لیے دو راستے تھے..

ایک تو وہ لاتعداد اور دھوپ میں سلگتی پتھریلی سیڑھیاں تھیں جو اس کے دامن تک جاتی تھیں اور جن پر کئی سیاح عالم مدہوشی میں بےسُدھ لڑکھڑاتے تھے..

اور دوسرا راستہ..چیئر لفٹ کا تھا..جس میں براجمان ہو کر آپ ہنستے کھیلتے دیوارِ چین کی آغوش میں چلے جاتے تھے..

چونکہ چیئر لفٹ کے گراں ٹکٹ کا خرچہ چینی سرکار کے ذمے تھا اس لیے ہم سب نے قابل فہم طور پر اس راستے کا چناؤ کیا..

یہ چیئر لفٹ..قریۂ دیوار کی گہما گہمی سے بلند ہو کر..ہمارے گناہوں کے بوجھ کے باوجود ہمیں سنبھالے بلند ہوتی ہوئی ہمیں دیوار کے برجوں اور میناروں کے دامن تک لے گئی..ہم چیئر لفٹ سے اتر کر چند سیڑھیاں طے کر کے دیوار کے وجود میں آ گئے...

دیوارِ چین پر پہلا قدم رکھتے ہوئے میں نے تتلی کے بقول کوئی ہیجان محسوس نہیں کیا..میرے بدن میں کوئی سنسنی کوئی رغبت نہیں پھوٹی..

بس یہ ایک دیوار تھی..

سرسبز وادیوں اور پہاڑیوں میں وہ ایک سفید اژدھے کی مانند سمٹتی..لہراتی..بل کھاتی چلی جاتی تھی..اور اس کے حفاظتی حصاروں اور میناروں اور بُرجوں میں ٹورسٹ دندناتے پھرتے تھے..اور ان ٹورسٹوں نے..جن میں بیشتر امریکی تھے انہوں نے اپنے سروں پر مِنگ خاندان کی خصوصی ٹوپیاں اور پونی ٹیلز اوڑھی ہوئی تھیں...اور مسخرے ہو رہے تھے..

دیوار میری نظروں کے سامنے حدِ نظر تک تھی.. میری حدِ نظر شاید ایک دو کلو میٹر تک ہی تھی لیکن وہ اس سے پرے سینکڑوں کلو میٹر تک چلی جاتی تھی..

میں اپنے گروہ سے الگ ہو کر اس نیت سے چلنے لگا کہ دو ہزار چار سو ستر کلو میٹر کا کل فاصلہ تو لمحوں میں طے ہو جائے گا.. میں اس کے آخر تک جا کر لوٹ آؤں گا..

تو ایک لمحہ ایسا آیا جب میں مکمل طور پر تنہا ہو گیا..

صرف میں تھا.. اور دیوار تھی..

اور ہاں تتلی بھی تھی۔

ٹورسٹ.. میرے ڈیلی گیشن کے اراکین ایک برج کے اندر خوش گپیوں میں مصروف تھے. صرف میں تھا. تتلی تھی.. اور دیوار تھی..

ڈھلتی دوپہر کی دھوپ میں دیوار کے کنگرے سایہ کرتے تھے.. میں گریہ کرنے کی غرض سے اپنے ساتھیوں سے الگ ہوا تھا.. دیوار کا یہ حصہ نو تعمیر شدہ تھا. نواں نکور اور سیاحوں کی خواہشوں کی پیروی میں تھا..

لیکن اس سے پرے..

دیوار اس سستی شہرت اور نمائش سے گھبرا کر نکل جاتی تھی... ایک روزن سے دیوارِ چین کا ایک ایسا حصہ سرسبز وادی میں اترتا نظر آتا تھا جو سراسر کھنڈر تھا. برج مینارے شکستہ تھے.. سبزہ اور خودرو شجر دیوار کی شکستہ اینٹوں کو ڈھانپے ہوئے تھے..

پہاڑیوں پر گرمی کی شدت سے ایک دُھندسی اٹھتی تھی اور ان کی ہریاول میں یہ دیوار کوندتی بجلی کی مانند.. کہیں سے شکستہ. کہیں سے مسلسل سفید ہوتی دور تک چلی جاتی تھی..

ایک اپنے گروپ سے بچھڑی ہوئی.. دھوپ کی شدت سے نڈھال.. اپنے آپ کو ایک چینی پنکھے سے جھلتی ہوئی.. ایک امریکی سیاح خاتون نہایت فربہ میرے نزدیک سے گزرتے گزرتے ٹھہر گئی اور نہایت شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگی ''ذرا یہ تو بتاؤ کہ سینکڑوں برسوں تک یہ گاڈ فارسیکن وال تعمیر ہوتی رہی.. لاکھوں مزدور ہلاک ہو گئے جنہیں اسی کے پتھروں میں دفن کر دیا جاتا تھا.. چین کی ساری دولت اسے بنانے میں صرف ہو گئی

تو ذرا یہ بتاؤ کہ چینی... ان منگولوں کو یا جو کوئی بھی تھے جو اُدھر سے حملہ آور ہوتے تھے' ان کے ساتھ جنگ کر کے انہیں اپنے ملک میں آنے سے روک لیتے.. کیا یہ دیوار تعمیر کرنے کی نسبت سستا اور آسان حل نہ تھا. تو چینیوں نے اس پر غور کیوں نہ کیا..''

''اس لیے میڈم...'' میں نے اس موٹی اور بدہیئت خاتون سے ہنس کر کہا...

میں نے اس دوران اپنے موٹاپے اور بدہیئتی کو درگزر کیا ''اس لیے کہ یہ دیوار ان کا حفاظتی نہیں دراصل نفسیاتی مسئلہ تھا اور جب آپ نفسیاتی طور پر گمشدہ ہو جاتے ہیں تو پھر ایک ہی مقام پر ٹھہر جاتے ہیں۔ آپ کی سوئی اٹک جاتی ہے کہ ہمیں دیوار چاہیے.. ہمیں دیوار چاہیے.. چنانچہ چینی بھی اٹک گئے..''

''پھر بھی کوئی تک ہے چوبیس سو ستر کلو میٹر طویل دیوار بنانے کی..'' وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی..

میں دھوپ کے باوجود دیوار پر چلنے لگا.. جو خاصی چوڑی تھی اور کناروں پر منڈیریں تھیں' اس لیے میں نیچے تو نہیں گر سکتا تھا اور یہ بھی شنید ہے کہ اس پر پانچ گھڑسوار شانہ بشانہ سفر کر سکتے تھے.. اور میں صرف ایک تھا اور میرے پاس گھوڑا بھی نہیں تھا۔

اب یہ اقرار کر لینے میں کوئی حرج نہیں کہ دیوارِ چین نے مجھے انگریزی محاورے کے مطابق بالکل ٹھنڈا چھوڑ دیا. قطعی طور پر میرے دل کی کسی ایک تار کو بھی نہیں چھوا.. میں متاثر نہیں ہو سکا.. اگرچہ اس پر چلتے ہوئے میں اپنے آپ کو اشتعال دلاتا رہا کہ دیکھو میاں تارڑ تم اس لمحے دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک پر چہل قدمی کر رہے ہو.. گریٹ وال.. چین کی روح.. انسانی عظمت کا ایک شاہکار.. سینکڑوں برسوں کی مشقت.. لاکھوں جانوں کا نذرانہ.. گریٹ وال آف چائنا.. جس کے سامنے ہماری کوئی حیثیت نہیں اور اس کے باوجود تم اس کے پتھروں پر مٹر گشت کر رہے ہو.. لیکن کوئی بھی حربہ کامیاب نہ ہوا اور میں ٹھنڈا ہی رہا.. اس کی عظمت کے طور پر ایک اور دعویٰ بھی کیا جاتا ہے.. اور یہ دعویٰ بھی نہایت معروف اور پسندیدہ ہے کہ جناب اگر چاند سے زمین کو دیکھیں تو وہاں سے دیوارِ چین وہ واحد انسانی تعمیر ہے جو نظر آتی ہے.. اور اس کی زیارت کے لیے جو ٹکٹ خریدا گیا تھا.. اس پر بھی درج تھا

کہ یہ دیوار خلا سے نظر آتی ہے..

یہ ایک فکری یا چینی مغالطہ ہے.. نہ یہ چاند سے دکھائی دے سکتی ہے اور نہ خلا سے نظر آتی ہے..

امریکی خلانوردوں نے بھی اس کی تردید کی ہے کہ خلا سے دنیا ایک نیلے گھومتے ہوئے گولے کی طرح دکھائی تو دیتی ہے لیکن دیوارِ چین نظر نہیں آتی۔

صرف تیس ہزار فٹ کی بلندی سے جیٹ ہوائی جہاز سے نیچے دیکھئے تو پورے پورے شہر نظر نہیں آتے.. بادشاہی مسجد کا پتہ نہیں چلتا تو ایک دیوار جو بے شک تقریباً ڈھائی ہزار کلومیٹر طویل ہو' چند میٹر چوڑی ہو' وہ کیسے دکھائی دے جائے گی.. البتہ چین کی قدیم لوک کہانیوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے..

''وفادار بیوی'' کے عنوان سے شفیع عقیل نے ایک ایسی ہی لوک کہانی کا ترجمہ کیا ہے جس میں ایک عورت کا خاوند چن خاندان کے شہنشاہ شی ہاؤ نگ کے عہد میں دیوارِ چین کے بیگاری مزدوروں میں شامل ہے اور وہ شدید موسم سرما میں اس کے لیے جوتے اور کپڑے نکال کر ایک طویل سفر کے بعد دیوار تک پہنچتی ہے اور وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خاوند تعمیر کے دوران مر گیا تھا اور جس مقام پر اس نے دم توڑا تھا' اسے وہیں پر دفن کر کے اس کے اوپر دیوار چن دی گئی تھی.. اس المناک خبر کے فوراً بعد خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ شہنشاہ صاحب اس عورت کے حسن کی تاب نہ لا کر اسے شادی کی پیشکش کرتے ہیں اور وفادار بیوی اپنی چند شرطیں پیش کرتی ہے.. میرے شوہر کی لاش نکلوا کر اسے سونے کا کفن پہنائیں۔ اس کفن پر چاندی کی چادر چڑھائیں.. اور پھر چین کے تمام وزیر اور جنرل اس کے جنازے میں شریک ہوں اور ظاہر آپ بھی شریک ہوں.. دل کے ہاتھوں مجبور شہنشاہ اس کی تمام شرطیں پوری کر دیتا ہے لیکن وفادار بیوی دیوار کے پہلو میں بہتے ہوئے دریا میں کود جاتی ہے اور ایک سنہری مچھلی بن جاتی ہے..

تتلی مجھ سے بہت پہلے دیوار پر پہنچ چکی تھی.... اور میری طرح کیبل کار میں سوار ہو کر نہیں پہنچی تھی کیونکہ کسی بھی باعزت تتلی کے لیے یہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ اپنے

پروں پر انحصار کرنے کی بجائے ایک کیبل کار میں بیٹھ کر بلندی تک پہنچے.. البتہ وہ کسی ایک جگہ بیٹھتی نہ تھی کہ گرم پتھروں سے اس کے نازک پاؤں جھلستے تھے اور وہ بار بار اڑتی تھی اور پھر بیٹھنے کی کوشش کرتی تھی... اور سب جانتے ہیں کہ تتلیاں زبان سے نہیں اپنے پاؤں سے چیزوں کو چکھتی ہیں۔

''میں تمہاری مایوسی سے آگاہ ہو گئی ہوں.. دراصل یہ تیز دھوپ ہے اور چندھیا دینے والی روشنی اور گرمی ہے جس نے دیوار کو اس طرح برہنہ اور سپاٹ کر دیا ہے کہ تم اس سے متاثر نہیں ہوئے.. اس میں کوئی پوشیدگی کوئی بھید نہیں رہا.... برہنگی کا یہی نقصان ہوتا ہے چاہے وہ ایک دیوار کی ہو یا ایک حسین عورت کی.. ذرا تصور میں لاؤ کہ موسم سرما کی کوئی سویر ہو اور تم منہ اندھیرے جوگر پہنے اپنے موٹاپے پر ایک ٹی شرٹ چڑھائے مقامی پارک میں جانے کی بجائے ادھر آنکلو.. یہ سرسبز پہاڑیاں نیم تاریکی میں ہوں اور ان پر گہری دُھند اتری ہوئی ہو.. اور اس دُھند میں سے کہیں اس دیوار کا وجود ایک آبی جانور کی طرح ظاہر ہو اور پھر روپوش ہو جائے.. جیسے ایک سفید اژدھے کا بدن.. جیسے سندھ میں ابھرتی سفید ڈولفن... اور پھر طلوع آفتاب کے آثار ہویدا ہوں.. تاریکی اور دھند کی چادر کو چھیدتے ہوئے سورج دیوتا کے گلابی تیر تمہارے سر پر سے پرواز کرتے ہوئے نکلنے لگیں.. اور یاد رہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے.. اور مشرق چین ہے اور چین کا دل یہ دیوار ہے تو سورج اسی کی کوکھ سے نکل کر کل دنیا کو منور کرے گا.. تمہارے سامنے اب بھی یہ دیوار سینکڑوں کلومیٹر تک نظر آ رہی ہے تو پہاڑیوں کی ہریاول میں یہ ڈوبتا ابھرتا اژدھا گلابی ہو جائے گا.. تو پھر تمہاری کیا کیفیت ہوگی؟.. دیوار ایک چینی شہزادی کے بدن کی مانند زرد اور ریشم صفت ہو جائے گی تو پھر تم کیا کہو گے.. یا پھر برساتوں کے موسم میں تم ادھر آنکلو اور بارش سے بچاؤ کی خاطر اس کے ایک برج میں پناہ لے کر اس کے طویل سراپے پر ایک بھیگی ہوئی نظر کرو تو پھر تمہارے احساسات کیا ہوں گے؟''

''یہ سب تو خواب و خیال ہیں.. ممکنات ہیں.. لیکن میرے لیے تو یہ ممکن نہیں کہ میں یہاں ڈیرے ڈال دوں اور برساتوں اور موسم سرما کا انتظار کروں.. میں نے کونسا روز

روز ادھر آنا ہے..میرے ذہن کے کیمرے میں تو صرف ایک تصویر کی گنجائش تھی جو ثبت ہوگئی..دوپہر' دھوپ اور بے روح سپاٹ دیوار۔''

''تم اس دھوپ میں تاج محل کو دیکھو تو وہ بھی بے روح ہوگا۔''

''تم اس دیوار کی اتنی وکالت کیوں کرتی ہو؟..یہ میرے دل میں نہیں اتری اور اس دل کا حدود اربعہ چوبیس سو ستر کلومیٹر سے کہیں کم ہے تو اترے بھی کیسے..دیکھو میں ہمیشہ ان جگہوں کی جانب سفر کرنے سے گریزاں رہتا ہوں جنہیں پہلی نظر دیکھنے اور ان سے روحانی اور جسمانی طور پر متاثر ہو جانے کا فیصلہ تاریخ اور عقیدہ کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پہلی نظر ان پر پڑے تو میرا بدن کچھ بھی محسوس نہ کرے' لاتعلق رہے' مجھ پر کچھ اثر نہ ہو..میں شاید اپنے موروثی عقیدے کے مقدس مقامات پر جانے سے اس لیے جھجکتا ہوں کہ یہ کیا ضروری ہے کہ انہیں پہلی بار دیکھنے سے مجھ پر بھی وہی کیفیت وارد ہو جو لاکھوں معتقدین اور راسخ العقیدہ دلوں پر اثر کرتی ہے..اگر ایسا نہ ہوسکا تو کیا ہوگا..عین ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن ایسا نہ ہوا تو میں کیا کروں گا...اگر اقرار کروں گا تو مرتد ٹھہرا دیا جاؤں گا اور اگر تاریخ اور عقیدے کے پیچھے ہاتھ باندھ کر اپنے اصل احساسات کا اظہار نہ کروں تو ملامت مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا کر رسوا کردے گی..تو اے پیاری تتلی! مجھے دیوارِ چین کو پسند کرنے پر مجبور نہ کرو...اور تم اس کی وکالت نہ کرو۔ تمہیں کنفیوشس کا واسطہ...''

''اس کی وکالت کرنا میری مجبوری ہے اس لیے کہ چوانگ چو نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ تتلی بن گیا ہے اور میں وہی چوانگ چو ہوں اور چینی ہوں..ایک چینی کے لیے یہ دیوار..دیوار گریہ ہے..مکہ مکرمہ..بیت المقدس..بیت اللحم' گیا اور بنارس ہے..بلخ ہے..''

''تو پھر یہ عقیدہ ہے جو تمہیں آبدیدہ کرتا ہے..''

''نہیں یہ تیز دھوپ اور روشنی ہے جو تمہیں آبدیدہ ہونے سے روکتی ہے۔''

''تتلی تم ایک معمولی تتلی ہو..جس کی حیات چندروزہ ہے..اپنی اوقات میں رہو اور میرے بارے میں فیصلے نہ کرو..مجھے مشورے نہ دو..میرے ذہن کو پراگندہ نہ کرو..تمہاری طرح میں بھی اپنے عقیدے پر اندھا ایمان رکھتا ہوں..میرا خیال تھا کہ چین میں تم

مجھے راستے دکھاؤ گی لیکن تم تو مجھے بھٹکا رہی ہو..پلیز پرواز کر جاؤ اور مجھے اپنے فیصلے خود کرنے دو..''

تتلی کو تو بہانہ چاہیے تھا۔ تیز دھوپ میں اس کے پر جلتے تھے اور دیوار پر بیٹھنے سے اس کے پاؤں جھلستے تھے....وہ پرواز کر گئی..ہریاول کی وادی میں اتر گئی..

''ایک خیمہ، سلیپنگ بیگ اور چینی شاعری کی ایک کتاب اور دیوارِ چین''

اوپر.. جہاں برج تھے.. وہاں سیاحوں کے ہجوم تھے اور نادار چینی عورتیں چوری چھپے پوسٹ کارڈ اور گریٹ وال کے سوونیئر فروخت کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور نظر رکھتی تھیں ان پاسبانوں پر جو انہیں اس غیر قانونی عمل کے جرم میں گرفتار کر سکتے تھے.. اور یہ پابندی کسی حد تک مناسب بھی تھی.. اگر اس کی اجازت ہوتی.. ہر کوئی دیوار پر آ کر دکانداری شروع کر دیتا تو سیاحوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔

میں اب بھی دیوارِ چین کی دھوپ میں چلتا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے تقریباً ڈھائی ہزار کلومیٹر میں سے بمشکل نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا' جب دیوار کے دائیں جانب جو کھائی اترتی تھی وہاں درختوں کے اندر سے کچھ چیخوں' آہ و زاری اور ہاؤ ہو کی آوازوں کا شور سنائی دیا.. ہر سُو سناٹا تھا اور اس خاموشی میں جب کچھ دلدوز قسم کی چیخیں اور شور بلند ہوا تو میں بھی دہل گیا.. میں نے آگے بڑھ کر دیوار کی منڈیر سے نیچے جھانکا.. کیا دیکھتا ہوں کہ دو چینی پولیس مین ایک شخص کو دھما دھم پیٹ رہے ہیں اور اس شخص کی قمیض تار تار ہو چکی ہے اور دانتوں میں سے خون بہہ رہا ہے.. اور وہ اپنے آپ کو چھڑا کر فرار ہونا چاہتا ہے اور ان دونوں پولیس مینوں کی پُشت پر.. بلکہ پشتوں پر ایک چینی عورت اسی رفتار

سے جس رفتار سے وہ اس شخص کو دھما دھم پیٹ رہے ہیں.. مکّے رسید کر رہی ہے اور کبھی کبھی ان میں سے کسی ایک کی پشت پر سوار ہو کر اپنے محبوب یا شریک جرم کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے اور بے دریغ چیختی چلی جا رہی ہے.... عام چینی اگر اپنی زبان میں عام سی بات کرے تو بھی لگتا ہے کہ وہ ذرا چیخ رہا ہے اور جب وہ سچ مچ چیخ رہا ہو تو وہی لگتا ہے جو یہ عورت لگ رہی تھی... اور یہ معتوب شخص بھی اطمینان اور آسودگی سے بہ رضا و رغبت نہیں پٹ رہا تھا بلکہ جب کبھی اس کا بس چلتا وہ پولیس والوں کو مکّے رسید کرتا.. لاتیں مارتا.. ان کی معزز ٹوپیاں ہوا میں اچھالتا اور وردیوں کو تاراج کرتا ان کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرتا تھا۔ حیرت یہ تھی کہ ان شریف النفس چینی پولیس مینوں کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا جس سے وہ بے دریغ اسے پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیتے بلکہ چھوٹی چھوٹی چھڑیاں تھیں.. اور ان میں سے بھی ایک چھڑی وہ ملزم چھین کر نیچے گہرائی میں پھینک چکا تھا... اور اس والہانہ تگ و دو کے دوران ایسا وقت بھی آ جاتا جب مطلوبہ شخص ان میں سے ایک پولیس مین کی بری طرح ٹھکائی کر رہا ہوتا اور دوسرا پولیس مین ہانپتا ہوا.. اپنی پھٹی ہوئی وردی پتلون میں اڑستا۔ ذرا ایک جانب ہو کر اپنے موبائل پر مزید کمک کی فریاد کر رہا ہوتا..

دیوارِ چین کے پہلو میں کھیلے جانے والے جرم و سزا کے اس عظیم المیے اور طربیے کا واحد تماشائی میں تھا..

عورت جب اپنے ساتھی کو بچانے کی خاطر آخری مرتبہ ایک پولیس مین کی پشت پر ایک پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار تھی اور اس کے بال نوچ رہی تھی تو اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی جو دیوار کی منڈیر سے نیچے جھانک رہا تھا تو اس نے پولیس سواری کی اسی پوزیشن میں.. مجھ سے مخاطب ہو کر دوہائی دی.. کہ تم ہی مدد کو آ جاؤ' کچھ کرو..

آس پاس دور دور تک کوئی نہ تھا۔

وہ دہائی دیتی.. پولیس مین کی کمر کو اپنی ٹانگوں میں جکڑے اس پر سوار اس کے بال نوچتی عورت یقیناً ڈیمزل ان ڈسٹریس تھی جس کی مدد کرنا شولری کے اصولوں کے مطابق واجب تھا اور میں ایکشن پلین تیار کر رہا تھا جب تتلی پھر سے نمودار ہوگئی۔ ''میں جانتی

تھی کہ میرے بغیر تم کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے اس لیے میں تمہارے گارڈین اینجل کے طور پر پھر سے ڈیوٹی پر آ گئی ہوں۔ سنو اور اس پر عمل بھی کرو.. دیارِ غیر میں اور زبانِ غیر میں پرائے پھڈے میں کبھی ٹانگ نہیں اڑاتے.. یہاں سے غائب ہو جاؤ۔ تم نے یہ منظر کبھی دیکھا ہی نہیں..''

''لیکن پتلی اس بے چاری عورت کو یونہی اس پولیس مین کی پشت پر سوار چھوڑ جاؤں.... جانے کس مصیبت سے وہ اس کی پشت پر سوار ہوئی ہے..''

''غائب ہو جاؤ میں کہتی ہوں..'' پتلی بے دید اور بدتمیز ہو گئی۔'' ورنہ دیوارِ چین پر گرفتار ہونے والے تم پہلے پاکستانی ہو گے..''

چنانچہ میں نے اس تماشے سے منہ موڑا اور مکمل طور پر غائب ہو جانے کے لیے واپس اس برج کی جانب ہو لیا جس کی سایہ دار عافیت میں درجنوں سیاح دیوارِ چین سے غفلت برتتے ہوئے آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے..'' لیڈر جو اس گرمی میں بھی ایک پکا صاحب کی طرح اپنا گرے سوٹ پہنے ٹائی لگائے اگرچہ دیدہ زیب لگتا تھا لیکن پسینے سے تربتر تھا۔ مجھے ڈانٹ کر کہنے لگا ''ڈسپلن کا خیال رکھا کریں.. قومی وقار کا تقاضا ہے کہ وفد کے تمام اراکین اکٹھے رہیں..''

لیڈر نے یہ ''آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' دراصل ''تم کہاں دفع ہو گئے تھے؟'' کی ٹون میں کہا تھا..

''سوری سر..'' میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا..

''کوئی بات نہیں..'' وہ فوراً موم ہو گیا کیونکہ وہ اپنی بظاہر درشتگی کے باوجود اندر سے ایک نہایت نرم دل اور معصوم بوڑھا تھا۔ ''آپ نے دیوارِ چین دیکھی..''

''جی سر..''

''میں نے اسے پچیس برس پیشتر دیکھا تھا..'' اس نے نہایت بھولپن سے سینہ پھلا کر کہا..

ہم چین میں جو کچھ بھی دیکھتے تھے اور یاد رہے کہ یہ چین میں ہمارا پہلا دن تھا.. لیڈر ذرہ بھر کوتاہی نہ کرتا تھا اور فوراً ہمیں ہماری بدقسمتی سے آگاہ کر دیتا تھا کہ یہ جو تم دیکھ رہے ہو آج دیکھ رہے ہو۔ یہ تو میں پچیس برس پہلے دیکھ چکا ہوں..

''پچیس برس میں یہ دیوار بدل گئی ہے؟'' وہ رکن جو آج دوپہر بھوک سے ہکلاتے تھے اور اب تھکاوٹ سے نڈھال تھے، بولے..

''ہاں ان دنوں یہاں اتنے سیاح نہیں ہوا کرتے تھے.. چین میں غیر ملکیوں کے داخلے پر پابندی تھی.. یقین کریں وہ کوئی اور دیوارِ چین تھی جو میں نے دیکھی تھی..''

''گویا بدل گئی ہے؟''

''نہیں..'' اب لیڈر کے ہکلانے کی باری تھی۔ ''نہیں.. دراصل...''

''تو پھر؟'' رکن نے بھنا کر کہا۔

یہ اسی قسم کی صورت حال کی فوٹوسٹیٹ کاپی تھی جس میں ایک تبلیغی جماعت کے پُرجوش کارکن نے ایک میراثی کو روک کر کہا تھا: ''کلمہ سناؤ''

اور میراثی نے پریشان ہو کر کہا تھا: ''کیوں.. بدل گیا ہے۔''

پتلی اس بحث سے دور دیوار کے گرم پتھروں پر براجمان ہونے کی کوشش میں پر پھڑپھڑا رہی تھی۔ جب میں کیبل کار پر سوار ہو کر نیچے چلا گیا..

نیچے.. جہاں میں اترا وہاں کیبل کار سٹیشن کے پہلو میں پولیس کی ایک کوسٹر کھڑی تھی، جس میں وہی دو سپاہی جنہیں ابھی ابھی دھا دھم پیٹا جا چکا تھا اور جن کی پشت پر سواری کی جا چکی تھی، وہی دو سپاہی اور وہی شخص ایک پھٹی ہوئی قمیض سے لاپرواہ اور اس کی ساتھی وہ عورت جس نے اپنے محبوب کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی.. یہ چاروں نہایت دوستانہ ماحول میں سگریٹ پی رہے تھے اور گپیں لگا رہے تھے.. اتنے خوش اخلاق پولیس والے اور ملزم میں نے زندگی بھر نہ دیکھے تھے..

دیوارِ چین نے اگرچہ مجھے بے شک گرم دھوپ کے باعث.. مکمل برہنگی کی وجہ سے.. متاثر نہیں کیا تھا.. میرے دل میں جگہ نہیں بنائی تھی لیکن اس نے.. اس کی قدامت اور

سرسبز جنگل میں بل کھاتی ایک سفید ندی کے وجود نے اس خواہش کو گھونسلے بنانے پر آمادہ کر لیا تھا کہ اگر میں اتنا عمر رسیدہ نہ ہوتا تو میں ایک خیمہ اور سلیپنگ بیگ اور قدیم چینی شاعری کی ایک کتاب اپنے رُک سیک میں پیک کر کے اس کے چوبیس سو ستر کلومیٹر پیدل طے کرتا..اسے ہر رنگ اور ہر موسم میں دیکھتا..اس کے آخری برج پر جا کر اس سے پرے دیکھتا کہ وہاں کیا ہے..کیا ایک اور دنیا ہے یا چین ہی کل کائنات ہے اور اس سے پرے کچھ نہیں..لیکن خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا اور مجھے ایسے شخص کو ایک اور زندگی نہیں دیتا..

''بیجنگ کی شام میں، مردانہ قوّت کے چینی کُشتے''

ہم آج...بیجنگ کی سویر میں آئے تھے..

اور اب بیجنگ میں شام ہو رہی تھی..

دیوار سے واپسی پر سب اراکین اپنے اپنے کمروں میں روپوش اور مدہوش ہو گئے تھے..اس ذرا سی کسرت نے ہر رکن کے بدن میں عمر رسیدگی کے باعث عود کر آنے والے عوارض نمایاں کر دیئے تھے...اور سازِ دلِ پُر درد کو چھیڑ دیا تھا۔

سب سے بلند اور بے سُرا میرا سازِ دلِ پُر درد تھا جو بجتا ہی چلا جا رہا تھا اور تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا..

البتہ لیڈر جو ہم سب میں سے عمر میں کہیں ایڈوانس باختہ تھا، زیادہ مدہوش نہیں ہوا، کیونکہ اسے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے ایک کمرے کی بجائے ایک پُرتعیش سویٹ تفویض کیا گیا تھا۔ اتنا پُرتعیش اور آرام دہ کہ وہ اس میں آرام نہیں کر پا رہا تھا اور وفد کے تمام اراکین کو باری باری فون پر مطلع کر رہا تھا کہ آپ لوگ تو عام کمروں میں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن میں ایک شاہانہ سویٹ میں فروکش ہوں۔ بیڈ روم جدا ہے اور ڈرائنگ روم الگ..
باتھ روم میں چھ تولیے ہیں..پھلوں کی ٹوکریاں ہیں..کھائیں گے؟..طرح طرح کی شرابیں ہیں..پئیں گے؟ کیونکہ میں تو نہیں پیتا..

ایک بزرگ اور جہاندیدہ شاعر نے اس دعوت پر پوائنٹ آؤٹ کیا کہ جنابِ من

جو کچھ آپ کے فریج میں ہے اور چینی بار میں خمار کے جو سامان سجے ہیں انہیں استعمال کریں گے تو ان کے لیے آپ کو اپنے پلّے سے ادائیگی کرنی ہوگی..انہوں نے دو برس پیشتر پاکستانی وفد میں شامل شاعر شہزاد احمد کی ٹریجڈی کا حوالہ دیا جو فریج میں سے منرل واٹر کی بوتلیں نکال نکال کر نہ صرف پیتے تھے بلکہ شاید ان سے ہاتھ منہ بھی دھوتے تھے اور چیک آؤٹ پر انہیں تقریباً دو ہزار روپے ادائیگی کرنی پڑ گئی تھی....لیکن لیڈر نہیں مانتا تھا وہ اصرار کرتا تھا کہ نہیں..شرابیں اگر سجی ہیں تو مفت ہیں..اگرچہ میں نہیں پیتا..ہمارے ایک لیڈر نے ایک جلسۂ عام میں ترنگ میں آ کر اقرار کر لیا تھا کہ ہاں تھوڑی سی پیتا ہوں' لیکن غریبوں کا خون تو نہیں پیتا اور اس پر آج تک لعن طعن ہوتی ہے..اور لعن طعن کرنے والوں میں اکثریت ان کی ہے جو تھوڑی نہیں بہت زیادہ پیتے ہیں...پس ثابت ہوا کہ اقرار ہی سب سے بڑا گناہ ہے اور انکار میں برکت ہے..اس لیے یہ جو ہمارا لیڈر تھا اور جو شاید واقعی نہیں پیتا تھا' وہ کیسے اقرار کر لیتا..

میجر لیو بھی صبح سے ہم بھیڑوں کی نگرانی کرتا کرتا تھکن سے چُور ہو کر اپنے کمرے میں استراحت فرماتا تھا..خاور جانے کہاں تھا..چنانچہ جب میرا سازِ دلِ پُردرد ذرا کم پُردرد ہوا تو میں کپڑے تبدیل کر کے نیچے لاؤنج میں آ گیا..اور وہاں وانگ لی تھی..

یہ وانگ لی ایک سانولی رنگت کی ترچھی منگول آنکھوں والی ایک نہایت بے چاری اور سپاٹ بدن کی بچی تھی جو میجر لیو کی انگریزی اور خاور کی اردو کی زبان دانی اور دہشت سے سہمی سہمی سی رہتی تھی کیونکہ اس کی انگریزی ابھی پالنے سے باہر نہیں آئی تھی اور صرف غوں غاں کرتی تھی..میں نے سوچا کہ اسے بیجنگ کی شام میں نکلنے پر آمادہ کیا جائے چنانچہ اس مقصد کے لیے میں نے اس پر کچھ ڈورے ڈالے..چونکہ یہ بچی اپنی کم مائیگی کے باعث ہمہ وقت خوشگوار اور مددگار ہوتی تھی' اس لیے جب میں نے اس پر ڈورے ڈالنے کی مہم کا آغاز کیا تو وہ پہلے ڈورے میں ہی بندھ گئی..اور آمادہ ہو گئی..ویسے اسے مجھ ایسے کہولت زدہ بابا جی کے ہمراہ اکیلے جانے میں کیا خدشہ لاحق ہو سکتا تھا..اور یوں بھی یہ اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا..

بیجنگ کی سویر کچھ اور تھی..

اور اس کی شام میں بھی ایک چکا چوند سویر تھی..

بیجنگ..ماؤ جیکٹس اور کیپس پہنے..مرد و زن کی تخصیص کے بغیر ایک ڈسپلن زدہ..کمیونسٹ روکھے پن میں کوئک مارچ کرتا نعرہ زن بیجنگ نہ تھا..

یہ ایک نوخیز پیرس تھا..ایک جھولتا ہوا لنڈن اور ہیجان خیز نیویارک تھا..

شارٹ شارٹ نیکروں میں سے برآمد ہونے والی لامبی ٹانگوں کے آخر میں پلیٹ فارم ہیل کے جوتے ٹھپ ٹھپ کرتے تھے..یورپ کے تازہ ترین فیشن اور میک اپ تھے..ہم آغوشیاں اور مسرتیں..ٹی شرٹس..جینز اور جاگرز تھے اور بے خودی تھی۔

آسمانوں کو چھوتے سپر سٹور تھے..کینٹکی چکن اور میکڈونلڈ تھے..اور ہر مقام نفیس اور ستھرا تھا۔

چین نے کنفیوشس اور ماؤ کے چوغے ترک کر کے فرانسیسی اور امریکی فیشن گھروں کے لبادے اپنا لیے تھے اور اب کہتا تھا..ہے کوئی ہم سا جو سامنے آئے..

اس ہجومِ چینیاں میں..کم از کم بیس ہوٹل کے آس پاس جو علاقے تھے' وہاں کوئی ایک چہرہ ایسا نہ تھا جس پر کلاس سٹرگل یا مارکس کے فلسفے کا کوئی بھی نشان رہ گیا ہو..

اور مجھے پھر حیرت ہوئی کہ دنیا میں سب سے بڑی آبادی رکھنے والے ملک کے سب سے بڑے شہر میں کوئی دھکم پیل' کوئی گھنی افراتفری نہ تھی..

''یہاں ایک قدیم کنواں تھا جس کا تذکرہ بیجنگ کی قدیم تاریخ میں ملتا ہے..'' وانگ لی نے مجھے بتایا ''یہ کنواں اس پورے علاقے کی پہچان تھا..پرانے بیجنگ کی دیوار سے باہر ویرانے میں تھا اور مسافر یہاں رک کر..شہر میں داخل ہونے سے قبل پانی پیتے تھے..اپنی پیاس بجھاتے تھے..''

کنوئیں کے جائے مقام پر فٹ پاتھ میں ایک تختی نصب تھی جس پر اس کی قدامت اور تاریخ کے حوالے کندہ تھے اور اہلِ بیجنگ اسے نہایت عقیدت سے دیکھتے تھے..

اگر یہ کنواں آج بھی موجود ہوتا تو اس کا کوئی مصرف نہ ہوتا کیونکہ چین پیاسا نہیں

رہا تھا..اس نے اپنی پیاس بجھالی تھی..

اور یہ تاریخی مغالطہ بھی باطل ثابت ہوا کہ چینی پستہ قد ہوتے ہیں..کم از کم بیجنگ میں تو نہیں ہوتے..اس کے ثبوت کے لیے صرف خواتین کی ٹانگوں کی لمبائی ہی کافی تھی..

چہلیں..بے فکری اور مستیاں..یہ بیجنگ کی شام تھی..

تاریخی کنویں کی قربت میں ایک نہایت عالی شان اور روشنیوں سے دمکتی بلند عمارت کے سامنے اس میں داخل ہونے کی کوشش کرتے چینیوں کے ٹھٹھ لگے تھے..

''یہاں ایک پرانے زمانے کا کمیونسٹ سٹور تھا جس کی تعمیرِ نو یورپی انداز میں کی گئی..صرف تین روز پیشتر کھلا ہے اور ہر بیجنگ والے کی خواہش ہے کہ وہ اس میں جا کر کچھ خریداری کرے..کیونکہ یہ یورپی سٹائل کا ہے..پہلے یہاں لوگ طویل قطاروں میں کھڑے ہو کر سارے دن میں زیادہ سے زیادہ ایک جوتا یا جراب خرید سکتے تھے..''

''اور اب وہی لوگ دھکم پیل کرتے اندر پہنچ رہے ہیں..''

''ہاں..'' وانگ لی کی آنکھیں مزید ترچھی ہو گئیں۔ ''لیکن یہ ان کی مرضی ہے..کسی کا حکم نہیں ہے۔''

سٹور کے اندر جو سیلز گرل تھیں وہ بوکھلائی ہوئی تھیں اور گاہک اتنے زیادہ تھے کہ وہ ان کے نرغے میں آئی ہوئی بمشکل اپنا دفاع کر رہی تھیں..

ہم دونوں اس ہجوم میں بے اختیار بہتے ایک ایسے سٹال کے کنارے جا لگے جہاں صرف نقلی بالوں کی وِگیں فروخت ہو رہی تھیں..وانگ لی نے چینی میں چیخ چیخ کر کہ وہاں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی' سیلز گرل کو متوجہ کیا اور اسے اس سٹور میں دوست ملک پاکستان سے آئے ہوئے ایک نایاب دانشور کی موجودگی سے آگاہ کیا..اگرچہ سیلز گرل نے اس آگاہی کو زیادہ پسند نہ کیا لیکن اس نے آدابِ مہمان نوازی کی لاج رکھتے ہوئے ایک وگ میرے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی۔'' سر آپ اسے پہنیں..ٹرائی کریں..اسے پہنیں گے تو بیس برس پہلے کے جوان لگیں گے..''

میں نے دل ہی دل میں ایک کبوتر کی طرح غٹرغوں' غٹرغوں کیا کہ بھولی سیلز گرل

نہیں جانتی کہ بیس برس پہلے بھی میں جوان نہیں تھا..میں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر وِگ پہن لی اور اس نے فوراً ایک آئینہ میرے سامنے کر دیا..جو کچھ میں نے آئینے میں دیکھا' وہ ناقابلِ یقین تھا..میں ایک نہایت نوخیز بال بھرا دلیپ کمار دکھائی دے رہا تھا..بلکہ تصور کو بہت زیادہ ڈھیل دے دی جائے تو ایک شاہ رخ خان لگ رہا تھا..لیکن بالوں کے نیچے میرا چہرہ میری عمر کی بے شمار چغلیاں کھاتا تھا..اور ان میں جھریاں..جھڑتے ہوئے پیلے دانت اور گالوں سے لٹکتا ہوا ماس تھا..میں اس وگ میں ایک عمر رسیدہ چغد لگ رہا تھا..

سٹورز کے باہر برآمدوں میں..فٹ پاتھوں پر..قطار اندر قطار چینی دستکاریوں اور یادگاری تحفوں کے سینکڑوں سٹال سجے تھے..اور ان اشیاء کی ورائٹی حیرت انگیز تھی..میں ان کی اقسام کی..ان نہایت دیدہ زیب اشیاء کی فہرست تیار کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ وہ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں نمائش پر تھیں اور ہر شے پر نظر ٹھہرتی تھی کہ ایں جا است..یہی خرید لیجیے..اس نمائش گاہ کی خواتین ہاتھوں میں کیلکولیٹر تھامے ''ہاؤ مچ یُو گیو'' کی مسلسل گردان کرتیں..ہر شے..ہر نوادر کی قیمت انگلیوں سے کیلکولیٹر پر کھٹ کھٹ کرتیں۔ پہلے سینکڑوں ڈالروں سے آغاز کرتیں اور پھر آپ کے کہے بغیر پسپا ہوتی ہوئی چند ڈالروں تک آ جاتیں۔ میرے پاس قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو میں اسے یہاں لٹا دیتا کہ وہاں ہر شے دل کو جکڑ لیتی تھی..چینی کراکری کے نمونے' ٹی سیٹ' مجسمے..ہزاروں اقسام کے زیور' گلدان' مہاتما بدھ..منی ایچر تصویریں..شیشے کے ظروف..خطاطی کے نمونے..اگرچہ سب کے سب عہد موجود کی پیداوار تھے لیکن عہد رفتہ کے لگتے تھے۔

میں نے ایک بار گلگت میں ریشم سے بنے ہوئے چینی قالینوں کو دیکھا تھا اور سینکڑوں قالینوں میں سے کسی ایک کی بھی کلر سکیم اور ڈیزائن مشترک نہ تھے اور میری بیگم نے حیرت سے اپنے منہ پر ہتھیلی جما کر کہا تھا'' جو قوم ان قالینوں کو تخلیق کر سکتی ہے' اس کے حسنِ جمال کا کوئی حساب نہیں..''

کچھ ایسے ہی فٹ پاتھ اور برآمدوں میں سجے ان لاتعداد چینی نوادرات کو دیکھ کر

یہی خیال آتا تھا..ان کے حسنِ جمال کا کوئی حساب نہیں..

چینیوں کے اس حسنِ جمال سے بھاری ہوتے ہوئے دو شاپنگ بیگ میرے دونوں ہاتھوں میں تھے جب ہم ان سٹالوں اور اس نمائش گاہ سے فارغ ہوئے..

فارغ ہوئے تو پیس ہوٹل کی جانب رواں ہوئے..

اس روانگی کے دوران ایک اور ڈرگ سٹور سامنے آ گیا..

مجھے معلوم نہیں کہ اسے ڈرگ سٹور کہنا جائز ہے یا نہیں..کیونکہ درجنوں سپر سٹورز' شورومز..فیشن ہاؤسز..شراب کی دکانوں اور ریستورانوں اور شراب خانوں کے بعد ہر گلی میں..ہر سٹریٹ میں اس قسم کا ڈرگ سٹور دکھائی دے جاتا تھا جس کے ماتھے پر چینی زبان میں جانے کیا درج ہوتا تھا لیکن شیشے کے پار سٹور کے اندر دکھائی یہی پڑتا تھا کہ لوگ دوائیاں خرید رہے ہیں..

اس ڈرگ سٹور کی نمائشی کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ناک چپکا کر جب میں نے نمائش شدہ اشیاء کو ملاحظہ کیا تو وہاں دوائیوں کی بجائے مرتبانوں میں چھپکلیاں' بارہ سنگھوں کے سینگ' وہیل مچھلیوں کا گوشت' سانپوں کے سری پائے اور اسی نوعیت کی دیگر اشیاء کو سجے دیکھا..

''وانگ لی..بھئی یہ کیا ہے؟''

''یہ...'' وانگ لی نے نہایت شانتی سے اور بے حد میٹر آف فیکٹ انداز میں کہا: ''یہ مردوں کے لیے ہے..''

''مردوں کے لیے؟'' میں نے سمجھا کہ کوئی خصوصی سٹور ہے جہاں سے مردوں کی بیماریوں کے لیے دوائیں ملتی ہیں اگرچہ میری سمجھ میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا..پھر بھی وہ فرق تھا جو فی الحال میری سمجھ میں نہ تھا۔ ''عورتوں کے لیے نہیں؟''

''یہ دراصل عورتوں کے لیے ہے..'' اس نے اپنی منگول گندمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور وہ جان گئی تھی کہ میں ایک بدھو بوڑھا ہوں۔ ''آپ دیکھنا پسند کریں گے؟''

سٹور کے اندر بے شمار لوگ خریداری کر رہے تھے..خواتین مشورے دے رہی

تھیں اور مرد خریداری کر رہے تھے..اکیلی خواتین بھی تھیں جو سیلز گرلز کے ساتھ نہایت سنجیدگی سے مصروف گفتگو تھیں اور ان کے کہنے پر کچھ مرکبّات وغیرہ پسند کر رہی تھیں..

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چینیوں میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ زیادہ کام اور جنسی سرگرمیاں انسان کے بدن کو نقصان پہنچاتی ہیں..اور یوں زندگی کم ہو جاتی ہے..ان نقصانات سے بچنے کے لیے چینی صبح کی سیر کرتے ہیں..ورزش کرتے ہیں اور جنسی سرگرمیوں کے نتیجے میں جو کمزوری لاحق ہوتی ہے اسے صرف سانپ کے خون' ریچھ کے صفر..وہیل کے گوشت' چھپکلیوں کے اچار' ہرن کے سینگوں کے گودے وغیرہ کے استعمال سے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ اسی طور شیر کا گوشت بھی قوت مردمی کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ گینڈے کے سینگ ذہنی تناؤ کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور بندر کا بھیجہ ذہانت اور ایستادگی کے لیے نہایت کارآمد ہے۔

دیوسائی ٹریک کے دوران اس سطح مرتفع پر رہائش پذیر چند ریچھوں کی بقا کے لیے جو عملہ متعین تھا' انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ان ریچھوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ چینی بھائیوں کی جانب سے ہے جو ان کی چربی اور اعضائے مخصوصہ کو نہایت گراں قیمتوں پر خرید کر اپنے آپ کو توانا کرتے ہیں۔

''ڈرگ سٹور'' کے اندر شوکیسوں میں وہیل مچھلی کے ڈھانچے' مارخور کے سینگ' ریچھوں کی چربی کے علاوہ متعدد مرتبان تھے جن میں چھپکلیوں' بچھوؤں اور سانپوں کے اچار وغیرہ تھے..

یعنی چینی برادران نے اس فن کو جس کے زور پر ہماری حکمت اور حکیم زندہ ہیں..یا لاہور کے فٹ پاتھوں پر داتا دربار اور نگار سینما کے باہر سلاجیت بیچنے والوں..کہ ٹن ٹن کرے گا جیسے سکول کا گھنٹہ بجتا ہے اور سانڈے کا تیل فروخت کرنے والوں کے فن کو ہی ذرا ماڈرن اور معزز کر دیا ہے..

اور وانگ لی نہ شرماتی تھی نہ جھجکتی تھی' بیان کرتی چلی جاتی تھی۔ ''یہ ادویات استعمال کرنا چین کی ثقافت کا ایک حصہ ہیں..اگر آپ وٹامن کھا سکتے ہیں اپنے بدن کو

مضبوط کرنے کے لیے تو یہ بھی زندگی کا ایک بہت لازمی حصہ ہیں..آپ کچھ خریدنا پسند کریں گے؟...آپ کی عمر کے لوگ تو بہت اشتیاق سے یہ مرکّب خریدتے ہیں..''

''لیکن مجھے کچھ تجربہ نہیں..''

''آپ ان سیلز گرل کو بتا دیں کہ آپ کس قسم کے نتائج چاہتے ہیں تو وہ آپ کو مطلوبہ مرکّب مہیا کر دیں گی..''

میں نے اپنی عمر کو اور اپنی بیگم کی بزرگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ مشورہ ترک کر دیا..

ویسے مجھے ان سٹورز میں فروخت کی جانے والی ادویات اور عرق جات کی برقی بیداری کا علم بہت دنوں بعد ہانگ چو جا کر ہوا..لیکن یہ ایک اور کہانی ہے جو انتظار کر سکتی ہے..انتظار کے بعد بھی یہ بیان ہو نہ ہو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

''وانگ لی..کیا ان چیزوں کا کوئی اثر ہوتا ہے؟''

وانگ لی کی منگول آنکھیں تقریباً بند ہو گئیں..سرشاری سے۔''کیوں نہیں..وہ بہت بہتر ہو جاتا ہے..''

''اب واللہ علم یہ ''وہ'' کون تھا..

یہ عجیب بیجنگ تھا جس سے میرا واسطہ پڑا تھا..

شاید یہ ان قدیم کُشتوں کا ہی کرشمہ تھا کہ چین دنیا میں سب سے زیادہ آبادی والا ملک تھا..

''بُدھ مندر میں بے دین تتلی اور چین کی سب سے کیوٹ بڑھیا''

یہ ازل سے ہوتا چلا آیا ہے کہ جونہی آپ کے کسی غیر ملکی سفر کی افواہ پھیلتی ہے تو دوست یار اور رشتے دار چوکنے ہو جاتے ہیں اور اگر آپ ذرا کم کم غیر ملکی سفروں پر نکلتے ہیں تو پھر بہت ہی چوکنے ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ جب کبھی ممالکِ غیر کا رُخ کرتے ہیں تو واپسی پر آپ کے لیے کچھ نہ کچھ تحائف وغیرہ لے کر آتے ہیں..بے شک یہ ''تحائف'' صرف ایک کی رنگ ہو یا ایک پکچر پوسٹ کارڈ..اور اب وہ آپ کو ان نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں کہ ''ہم تمہارے لیے تحفے لے کر آتے تھے ناں تو دیکھتے ہیں تم ہمارے لیے کیا لے کر آؤ گے..''

دوست یاروں اور رشتے داروں کے بعد بیوی بچے آتے ہیں جو اس نتیجے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں کہ یہ جو بے چارہ خاوند ہے اور یہ جو پیارا ابّو ہے اس کی جیب میں جتنے ڈالر ہیں وہ اسی لیے تو ہیں کہ ان سے ہمارے لیے شاپنگ کی جائے..

بیگم کی پہلی دلچسپی یہ تھی کہ عینی کے جہیز کے لیے اگر ملکِ چین سے دیوارِ چین نہ حاصل کی جا سکے تو کم از کم ایک برس میں تیار ہونے والا کُل ریشم ضرور خرید کر لے آئیں..اور گھریلو استعمال کے لیے دو گھوڑا بوسکی کے کچھ تھان..شنگھائی ساٹن' ڈنر سیٹ وغیرہ..اور ممکن ہو تو چائنیز پرلز کے دو چار کلو..

سمیر چینی گھوڑوں میں دلچسپی رکھتا تھا. تصویروں کی صورت میں یا مجسموں کی صورت میں کیونکہ دنیا بھر میں یہ صرف چینی مصور ہیں جنہوں نے گھوڑوں کو کاغذ پر ایسے اتارا ہے کہ وہ سرپٹ بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں..

سلجوق کا رویّہ قدرے فلسفیانہ تھا.. وہ چاہتا تھا کہ کنفیوشس اور تاؤازم کے بارے میں کچھ کتابیں میسر آ جائیں تو وہ لے آئیں..اور اگر ''ایک ملک دو نظام'' پر کوئی مضبوط مقالے مہیا ہو جائیں تو ان کی فوٹوسٹیٹ بنوا لائیں..

ان سب میں سے عینی کی فرمائش بظاہر آسان اور سادہ تھی۔''ابو آپ وہاں سے میرے لیے چند ڈریسز' چینی زیور' سلک گاؤن وغیرہ تو لائیں گے ہی..لیکن میری خواہش ہے کہ اس سفر کے دوران آپ کو جو سب سے کیوٹ چینی بڑھیا ملے' آپ اس کے ساتھ ایک تصویر کھنچوا کر میرے لیے لے آئیں..بس اتنی سی فرمائش ہے..''

چنانچہ ابّو جب سے چین آئے تھے..پیکنگ کی پتلیوں کے اجسام اور اقسام پرکھنے کی بجائے ان کی امّاں جانوں پر نظر رکھتے تھے..جہاں کوئی بڑھیا نظر آتی تھی اس کا پیچھا کرتے تھے کہ یہ کتنی کیوٹ ہے اور ان میں سے اکثر کیوٹ لگنے کی بجائے میکبتھ کی چڑیلیں لگتی تھیں..

اور بالآخر چین کی سب سے کیوٹ بڑھیا مجھے کہاں ملی.. بیجنگ کے سب سے قدیم بدھ مندر کے باہر...

یہ بدھ مندر بیجنگ کے سب سے پُرکشش عجوبوں میں سے ایک تھا..

اور آج تو پیس ہوٹل کے ڈائننگ روم میں مغربی ناشتے کا لطف بھی نہیں آیا تھا..

ہم جب مینڈکوں وغیرہ سے درگزر کر کے فرائی انڈے کھا رہے تھے تو سفید ریش نے ایک قہر آلود نظر ہم سب کے انڈوں پر ڈال کر کہا تھا ''برادران آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کھا رہے ہیں؟''

''ہم انڈے کھا رہے ہیں؟'' سب نے کورس میں جواب دیا تھا..

''آپ جانتے ہیں کہ یہ کس کے انڈے ہیں؟''

''مرغی کے انڈے ہیں..''

''یہ آپ کیسے جانتے ہیں؟'' یہ کہہ کر باریش چپ ہوگیا اور ہمارے ردِعمل کا انتظار کرنے لگا..

''بھئی مرغی کے ہی ہوں گے..اور کس کے ہوں گے..زیادہ سے زیادہ بطخ کے ہوں گے..''

''لیکن یہ چیل کے بھی تو ہو سکتے ہیں..بگلوں اور کچھوؤں کے بھی تو ہو سکتے ہیں.. تختیوں پر یہی لکھا ہے ناں ''فرائیڈ ایگز..'' یہ تو نہیں لکھا کہ کس کے ایگز...چین میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔میرا کام تھا آپ کو خبردار کرنا..اب آپ جانیں اور آپ کے انڈے..''

چنانچہ ہم نے اگرچہ انڈے کھائے لیکن ذرا تشویش سے کھائے..البتہ یہ اطمینان ضرور تھا کہ یہ مینڈک کے نہیں ہیں کیونکہ وہ تو بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں..لیکن کیا پتہ چین میں مینڈکوں کا سائز بہت بڑا ہو اور وہ بڑے بڑے انڈے دیتے ہوں..بہرحال ناشتے کا لطف نہ آیا..

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میجر لیو نے پہلے چینی ادیبوں سے ملاقات اور پھر بُد ندر کے لیے فوری روانگی کا بگل بجا دیا..

ایک بھری پُری شاہراہ پر ہماری کوچ رواں تھی.. یہ شاہراہ ٹریفک سے بھری ہوئی تھی اور فٹ پاتھ پر چلتے چینیوں سے پُر ہوئی تھی.. بائیں ہاتھ پر سٹورز' دکانوں اور ریستورانوں کے درمیان میں ایک تبتی طرز کا بلند اور گھنے اور شوخ رنگوں کے نقش ونگار والا چوبی گیٹ تھا' جس کے اندر ہماری کوچ داخل ہوئی اور وہاں ہم جیسے سیاحوں کی درجنوں کوچوں میں شامل ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھی..

میجر لیو بدھ مندر میں داخلے کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے لپکا اور تمام اراکین اس کے پیچھے لپکے اور اس لمحے مجھے وہ کیوٹ بڑھیا نظر آ گئی.. چنانچہ میں اس لپک جھپک سے الگ ہو کر اس کی جانب لپکا..

''آپ کہاں جا رہے ہیں تارڑ صاحب..'' گیانی جو اگرچہ نہایت گیانی تھا.. مذہب اور تصوف سے لگاؤ رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود ہماری ویولینگتھ کہیں نہ کہیں ملتی تھی' مجھے لپکتے ہوئے دیکھ کر رک گیا..

''اس بڑھیا کے پیچھے..''

گیانی ہنسنے لگا: ''اب یہ نوبت آ گئی ہے..''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں گیانی جی.. میں اس سے ڈیٹ مانگنے نہیں جا رہا' اس کے ہمراہ ایک تصویر اتروانے جا رہا ہوں.. بہت ضروری ہے...''

''بالکل ضروری ہے..'' گیانی نے سر ہلا کر کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ بڑھیا کبھی نہ کبھی بے حد حسین رہی ہوگی اور آپ مجبوراً اب حسنِ رفتہ پر ہی اکتفا کر رہے ہیں.. لیکن بڑھیا ہے کہاں؟''

وہ ایک کوچ کے پاس حیران سی کھڑی تھی..

بال جتنے بھی تھے ان کا جوڑا بنائے ہوئے.. بند گلے کے ایک کوٹ اور ڈھیلے پاجامے میں.. پاؤں میں سینڈل.. اس کے آس پاس اگر جدید بیجنگ سانس نہ لے رہا ہوتا تو وہ ایک ہزار برس پیشتر کی ایک ایسی بوڑھی دہقان ہو سکتی تھی جس کی ساری فصل ایک جنگجو لارڈ کے کارندے لے جاتے تھے اور وہ بے بسی سے انہیں دیکھتی تھی اور بھوک اور فاقوں کو دیکھتی تھی' لیکن کچھ کر نہ سکتی تھی..

میں اس کے قریب گیا اور کیمرہ کھول کر کہا ''فوٹو؟''

وہ ذرا خوفزدہ ہو گئی جیسے میں بھی کوئی جنگجو لارڈ ہوں... میں نے کچھ پاچستان پاچستان کا ورد کیا لیکن وہ سمجھ نہ سکی.. میں جب بھی اس سے بات کرتا وہ ذرا پیچھے ہٹ جاتی..

اتنی دیر میں ایک نوجوان چینن.. نیلی جین اور سفید بلاؤز میں ایک کوچ سے اتری اور ہمارے پاس آ گئی.. اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار اس لیے تھے کہ اس نے اپنی دادی اماں یا نانی جان کے گرد دو غیر ملکیوں کو منڈلاتے دیکھ لیا تھا.. اور قابل اطمینان بات یہ تھی کہ وہ انگریزی میں شُدھ بدھ رکھتی تھی.. ویسے بدھ کے مندر کے باہر شدھ بُدھ رکھنا کیسا حسین اتفاق ہے..

میں نے ذرا رک رک کر آسان لفظوں میں اپنا مدعا بیان کیا کہ کیسے میری ایک بیٹی ہے اور اس بیٹی کی ایک ہی فرمائش ہے وغیرہ وغیرہ.. اس فرمائش نے لڑکی کو مسکرانے پر مجبور کر دیا اور اس نے اماں جان کو یہی فرمائش پہنچا دی..

اماں جان یک لخت شرما گئیں.. شرما شرما کر انکار میں سر ہلانے لگیں.. اور پھر تصویر اتروانے پر آمادگی ظاہر کر دی.. وہ واقعی چین بھر میں سب سے کیوٹ بڑھیا تھی اور اس کی تصویر آج بھی عینی کی ڈریسنگ ٹیبل کی زینت ہے..

پیس ہوٹل سے نکلنے کے بعد ہماری پہلی منزل چینی ادیبوں کا گھر تھی.. یہ گھر بہت عالی شان تھا اور یہاں ہمارے لیڈر نے اور چینی ادیبوں کے لیڈر نے وہی تقریریں کیں جو ایسے موقعوں پر کی جاتی ہیں.. تحائف کا تبادلہ ہوا.. سفید ریش نے فیصل آباد کی ٹی شرٹس اور سکارف پیش کیے.. میں نے اپنا سفرنامہ ''کے ٹو کہانی'' اس حوالے سے پیش کیا کہ یہ چین اور پاکستان کا مشترکہ پہاڑ ہے.. اور میں نے نوٹ کیا کہ کچھ چینی ادیب اس اطلاع پر قدرے حیران ہوئے.. لنچ حسب توقع انتہائی پُرتکلف تھا.. ناریل کے سفید جوس کے گلاس.. موت آئی وائن کے گلاسوں کی نسبت اکثریت میں تھے.. چین کے اردو شاعر انتخاب عالم واقعی اس عالم میں انتخاب تھے اور ان کی مسرت دیکھنے کے لائق تھی..

چینی ادیبوں کے گھر کے داخلے پر جو ایک دیوار تھی اس پر ''ایک پاگل شخص کی ڈائری'' کے مصنف اور ہمارے لیے چین کے سب سے مشہور جدید مصنف لوہشون کی شبیہ تانبے میں ابھری ہوئی تھی.. ہر پاکستانی ادیب نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو برگزیدہ اور لوہشون کے ہم پلہ سمجھتے ہوئے تصویر اتروائی.. میں نے بھی اتروائی..

اور اب ہم بدھ مندر کے اندر داخل ہو رہے تھے.. چین کی سب سے کیوٹ بڑھیا کے ساتھ تصویر اتروانے کے بعد..

بدھ مندر ابھی کچھ فاصلے پر تھا.. ایک پُرسکون روش تھی.. جس کے دونوں جانب گھنے شجر اور جھاڑیاں تھیں.. کچھ سوونیئر شاپس تھیں.. اور گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ باہر ایک پُرشور

اور پُرہجوم بیجنگ بہتا ہے..سیاح اور مقامی لوگ نہایت اطمینان سے اس روش پر چلتے جا رہے تھے..اور ہم بھی چلتے جا رہے تھے..

روش کے آخر میں سرخ نمائشی دروازوں' ڈھلوانوں' چھتوں اور سنہری محرابوں کی کاریگری بیجنگ کے آسمان کو چھوتی تھی..اور اس کی صناعی میں تبت کا رنگ نمایاں تھا..

بُدھ مندر کے سرخ اور سنہری وجود کے آگے... صحن میں ایک دُھند پھیلی ہوئی تھی اور اس دُھند میں چہرے ابھرتے اور روپوش ہوتے تھے.. ہر چہرہ سنجیدہ تھا اور اس پر عقیدت اور احترام کی مُہر ثبت تھی کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جن کے لیے یہ مندر مسجد اقصیٰ تھا۔ سینٹ پیٹرز تھا..ہیکلِ سلیمانی تھا...

وہ ہماری طرح محض تماشا دیکھنے نہیں آئے تھے..اپنے عقیدے کی پیاس بجھانے آئے تھے..اور صحن میں ایستادہ چراغ دانوں میں موم بتیاں روشن کر رہے تھے..دیئے جلا رہے تھے...یہ انہی موم بتیوں اور چراغوں کا دھواں تھا جو دور سے دُھند کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔

یہ کیسا بھید ہے کہ تقریباً تمام عقیدوں میں آگ کا تقدّس مشترک ہے..

تمام عقیدے اپنی اپنی راہ پر چلتے ہیں لیکن ان کا ملاپ آگ پر ہوتا ہے.. ہر کوئی موم بتیاں روشن کرتا ہے..آگ پہ لوبان چھڑکتا ہے تاکہ وہ مزید بھڑکے..دیئے جلاتا ہے۔

چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ،.... پنجواں میں بالن آئی بھلا... جھولے لالن.. سندھڑی دا...

کولون کیتھڈرل میں..فلارنس کے گرجا گھر ڈومو میں..روم کے سینٹ پیٹرز میں..میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ان کلیساؤں کی بلند چھتوں اور تقدیس میں ڈوبی ہوئی سرسراہٹوں اور سرگوشیوں میں مجھے اپنے حصّے کی ایک موم بتی آلٹر پر ضرور روشن کرنی چاہیے..اور میں نے اکثر ایسا کیا..ماحول غالب آ جاتا تھا اور ذاتی عقیدہ پیچھے رہ جاتا تھا..

گوالمنڈی چوک کی...گوروار جن نگر' کرشنا گلی اور گاندھی سکوائر کے مرکزی چوک کی ایک دیوالی ابھی تک میری یادداشت کی سکرین پر کہیں ایک بوسیدہ کٹی پھٹی اٹکتی ہوئی بلیک اینڈ وہائٹ فلم کی مانند چلتی ہے..کبھی بھڑکتی ہے..کبھی تاریکی میں روپوش ہو جاتی ہے..

مجھے کچھ پتہ نہیں کہ یہ فلم حقیقت ہے یا کالی داس کی شکنتلا' پانینی اور کوتلیا کی تحریروں کی مانند تاریخ کا وہ باب ہے جسے ہم بھولتے جاتے ہیں اور صرف گمان میں ہے..یہ فلم صرف پرچھائیوں کی صورت میں چلتی ہے کیونکہ فلم کی شوٹنگ ایک چار برس کے بچے نے کی تھی جو اب ساٹھ برس کی عمر میں اسے دیکھنے کی سعی کر رہا ہے۔

ریلوے روڈ... چوک میو ہسپتال سے اتر کر گوالمنڈی چوک تک آ رہی ہے اور اس کے کناروں پر جو شاندار گھر ہیں' ان کے چہرے چوبی دستکاریوں سے مزیّن ہیں..لکڑی کی محرابیں اور گیلریاں ہیں۔ چند حویلیاں ہیں جن کے پھاٹک کھلے ہیں اور ان کے اندر صحنوں میں پھل جھڑیاں چھوٹ رہی ہیں...سکھ عہد کے شاہانہ جھروکے ہیں جن میں شوخ رنگوں کے لباسوں میں اٹے بچے اور عورتیں ہیں جو نیچے جھانک رہے ہیں..جھروکوں کی منڈیروں پر چراغوں کی قطاریں ہیں..گوالمنڈی چوک میں حلوائیوں کی درجنوں دکانیں اپنے آپے سے باہر ہو کر سڑک کے درمیان تک اتر رہی ہیں..مٹھائیوں کے تھال اس طور سجے ہیں کہ وہ دکان کی چھت سے شروع ہوتے ہیں اور پھر زینوں کی صورت میں اترتے راہگیروں کے قدموں تک چلے آتے ہیں..اور ان تھالوں کے کناروں پر سینکڑوں دیئے جھلملاتے ہیں جن کی روشنی میں ہندو دیوی دیوتاؤں کے مٹی سے بنے ہوئے منقش مجسّمے بڑی بڑی آنکھوں والے.. ہاتھیوں اور بندروں کی شکلوں والے... مجھے حیرت میں مبتلا کرتے ہیں کہ پیدائش کے فوراً بعد میرے کان میں اذان دی گئی تھی جس کی گونج میں یہ دیوی دیوتا بہہ گئے تھے اور میں انہیں عقیدت سے نہیں دلچسپی سے دیکھتا تھا..جیسے ایک ہندو بچہ ہمیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوگا..گوروار جن نگر اور کرشنا گلی کی ہر منڈیر پر دیئے جھلملاتے تھے کہ یہ دیوالی کی رات تھی..اور بہت سے مسلمان گھروں کے چوباروں اور ممٹیوں پر بھی دیئے روشن ہو رہے تھے.. دیوالی بھی آگ کی پرستش کی ایک صورت تھی۔

لکشمی مینشن میں جو ہمارے پارسی ہمسائے تھے' ہم نے سن رکھا تھا کہ ان کے گھروں کے اندر ہمیشہ آگ جلتی رہتی ہے..جشنِ نوروز کے موقع پر اس آگ کی روشنی مینشن کی تاریک گلیوں میں لو دیتی تھی..یہ ایسی آگ تھی کہ آپ اس پر لاکھ پابندیاں لگائیں' ایران سے اسے

دربدر کردیں تو بھی یہ ہندوستان میں آباد ہو کر جلتی رہتی تھی۔ بلخ کا شہر.. مولانا رومؒ کا جائے پیدائش ہونے کے باوجود.. ایک آگ پرست زرتشت کا پیروکار ایک پارسی شہر اگرچہ قصۂ پارینہ ہو چکا ہے.. مٹی، ریت اور اینٹوں کے ملبے میں بدل چکا ہے.. صرف چند گنبد باقی رہ جاتے ہیں جن میں الو بسیرا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود آگ ہے جو سلگتی رہتی ہے.. اسی لیے امام خمینی بھی بالآخر جشنِ نوروز منانے کی اجازت دے دیتے ہیں.. ایسی آگ بجھائے نہیں بجھتی..

نمرود نے ایک اور قسم کی آگ کا بندوبست کیا تھا جو گل و گلزار میں بدلی۔ یہ آگ ہے جو عقیدوں کو کہیں نہ کہیں یکجا کر دیتی ہے..

ن۔م۔ راشد کو بہت مطعون کیا گیا.. کہ اس نے دفن ہونے کی بجائے آگ میں جلنا کیوں پسند کیا.. شاید صرف اس لیے کہ صرف آگ ہے جو لحاظ نہیں کرتی.. نہ عقیدے کا' نہ پارسائی کا.. نہ رندی کا.. شعلہ جس نے مجھے پھونکا میرے اندر سے اٹھا..

اس لیے مجھے یہاں بھی ایک بدھ مندر کے صحن میں آویزاں مقدس شمع دانوں میں آگ جلتی دیکھ کر حیرت نہ ہوئی.. سینکڑوں لوگ تھے اور وہ سب کے سب بدھ نہ تھے جو موم بتیاں جلا رہے تھے اور ان کا دھواں ایک دھند کی صورت منظر کو دھندلاتا تھا..

یہاں بھی میں نے اپنے حصے کی چند موم بتیاں روشن کیں لیکن ماحول کی یہ عقیدت مجھے مہنگی پڑی.. کیونکہ میں نے چین میں آمد کے بعد پہلی بار اپنی جیب میں محفوظ یوآنوں کو ہوا لگوائی.. چنانچہ چند یوآن راکھ کر کے میں نے وہ موم بتیاں روشن کیں..

میری شلوار قمیض اور واسکٹ سے اور تیکھی ناک سے بھی یہ صاف ظاہر تھا کہ میں کوئی چینی بدھ یا تبتی لاما نہیں ہوں۔ میرا لباس عقیدت مندوں کی نظروں میں آ رہا تھا کہ یہ کیسا بُدھ ہے جو بُدھو دکھائی دے رہا ہے.... یہ کچھ ایسے ہی تھا جیسے ایک گنجے سر والا کیسری چوغے میں ملبوس شخص نمازیوں کی صف میں دکھائی دے جائے... دو تین زائرین نے مجھ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی اور ان میں سے ایک انگریزی میں شُدھ بُدھ رکھتا تھا.. شُدھ تو کم رکھتا تھا لیکن بُدھ بہت رکھتا تھا کیونکہ وہ خود بُدھ تھا..

''یو انڈین؟''

''نو...''

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''پاکستان..''

''آ.. پاچستان.. آپ بدھسٹ ہیں؟''

''کچھ دیر پہلے تک تو نہیں تھا..''

''اگر آپ بیجنگ کے سب سے پرانے بدھ مندر میں موم بتیاں جلا رہے ہیں تو آپ بدھسٹ ہیں۔''

''پتہ نہیں.. لیکن میں گندھارا کی سرزمین کا باسی ہوں.. جو بدھ ذوقِ جمال کی وارث ہے.. یہاں تک کہ آپ کے مہایانہ فرقے کے بانی صوابی کے قریب جو پرانا لاہور ہے وہاں پیدا ہوئے تھے اور ان دنوں ایک جاپانی محقق وہاں اپنی ٹیم کے ہمراہ ان کا مدفن تلاش کر رہے ہیں اور ان کو امید ہے کہ وہ ان کی ہڈیاں ڈھونڈ نکالیں گے..''

اس چینی بدھ کو انگریزی میں جو شُدھ بُدھ تھی وہ بالکل ہی شُدھ ہو کر خلاص ہو گئی اور وہ میری اس تاریخی حقیقت پر مبنی معلومات سے استفادہ نہ کر سکا..

تتلی یہاں بھی میرے ساتھ تھی.. یا میں اس کے ساتھ تھا.. یا ہم باہم تھے.. چونکہ چینی نژاد تھی' اس لیے بدھ مندر کے صحن میں بے حد مؤدب ہو کر پر سمیٹے ایک کنگھی پام کے کنگری دار پتے پر بیٹھی تھی.. موم بتیوں کے قریب آنے کا وہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی کہ اس کے پر جلتے تھے اور اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے مجھ سے کہا ''تم نے کیا مانگا ہے؟''

''کس سے؟''

''اسی سے جس پر بدھ یقین نہیں رکھتے پھر بھی مانگتے ہیں..''

''میں نے تو کچھ نہیں مانگا...''

''تو پھر موم بتیاں کیوں جلائی ہیں؟''

''ایسے ہی..''

''نہ.. موم بتیاں ایسے ہی نہیں جلائی جاتیں کچھ نہ کچھ دل میں ہوتا ہے جس کی

طلب انہیں روشن کرتی ہے۔''

''بھلا ایک بدھ مندر میں موم بتیاں جلانے سے مجھے کیا حاصل ہوگا؟''

''تمہیں نیپال کے بھگت پور کا وہ جوگی یاد ہے جو پچھلے کئی برسوں سے ایک بدنما پتھر کے پاس دھونی رمائے بیٹھا تھا.. اس پر پھول اور تیل نچھاور کرتا تھا اور اپنے من کی مراد پانے کے لیے تپسیا کر رہا تھا..''

''ہاں یاد ہے۔''

''اور تم نے سوچا تھا کہ کیا احمق شخص ہے.. بھلا یہ پتھر اسے کیا دے گا.. نہ اس کی شکل خداؤں ایسی ہے اور نہ اس میں کوئی خاص بات ہے.. عام سا پتھر ہے اور یہ جوگی اس یقین میں ہے کہ یہ اسے وہ سب کچھ عطا کر دے گا جو اس کی خواہش ہے..''

''ہاں.. میں نے یہی سوچا تھا..''

''تمہاری سوچ صرف تمہارے عقیدے کی قید میں تھی.. تم اس سے باہر نہیں جا سکتے تھے..''

''اگر عقیدے میں پختگی ہو.. کسی بھی عقیدے میں.. تو ایک بے شکل پتھر بھی من کی مراد پوری کر سکتا ہے..''

''تتلی تم مجھے صراط مستقیم سے بھٹکانے کی کوشش نہ کرو۔''

''تو اسی طور.. اگر تمہارے اندر یہ یقین پختہ ہو کہ یہاں اس بدھ مندر میں موم بتیاں جلانے سے تم جو مانگو گے وہ ملے گا تو.. وہ مل جائے گا.. تم مانگو تو سہی..''

تتلی ایک بے دین اور لامذہب تتلی تھی۔ اس کے ساتھ بحث ممکن نہیں تھی..

صحن کے پار مندر کی عمارت تھی.. مہاتما بدھ کے چینی نقش و نگار کے بڑے بڑے مجسمے آسن جمائے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے صرف ایک پجاری تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا.. اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے من کی مراد پوری ہو گئی ہوگی کیونکہ صرف ایک مانگنے والا ہو اور اتنے بڑے بڑے جہازی سائز کے مہاتما بدھ ہوں اور پھر بھی اس کی مراد پوری نہ کر سکیں تو کیسے بدھ ہوں گے..

''شہرِ ممنوعہ... دُھند کے حجاب میں''

شہرِ ممنوعہ...

دے فاربڈن سٹی...

جس کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں.. پابندی ہے... ممنوع ہے..

جونہی آپ ''دے فاربڈن سٹی'' کے الفاظ سنتے ہیں تو ایک چینی ڈرم پر چوٹ پڑتی ہے اور ایک ''دھم'' کی آواز آتی ہے جو آپ کے تن بدن میں دھم دھم کرتی اترتی گونجتی ہے... ممنوع.. ممنوع کہتی خبردار کرتی ہے..

کسی شے کا ممنوع قرار دیا جانا ہی اس کی سب سے بڑی کشش ہے..

حضرت موسیٰ کوہ طور سے دس ممنوعات کی.. خدا کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی دس ممنوعات کی پتھریلی تختی سینے سے لگائے اترتے ہیں.. داؤ شل ناٹ سٹیل... داؤ شل ناٹ.. لیکن آل اسرائیل ان ممنوعات پر دھیان نہیں کرتے.. کہ لفظ ''ممنوع'' میں ہی اسے قبول نہ کرنے کا ایک چیلنج ہے جس کے سامنے انسان بے بس ہو جاتا ہے..

جس تختی پر ''شہرِ ممنوعہ'' کندہ کیا گیا تھا' وہ اب متروک ہو چکی تھی اور اب اس شہر میں دنیا بھر کے سیاح دندناتے پھرتے تھے..

اس کی فصیلوں کے دامن میں جو حفاظتی نہر تھی' وہ سویر کی ہلکی دھند میں ملفوف تھی۔

جب ہماری کوچ اس قصر کے مرکزی دروازے سے چند فرلانگ ادھر ہی ٹھہر گئی اور ہمیں

اترنے کا حکم دے دیا گیا. لیکن اس سے پیشتر میجر لیو نے نہایت مؤدب ہو کر اطلاع کی...

"معزز اراکین. شہرِ ممنوعہ کا کمپلیکس بہت بڑا اور بہت وسیع ہے.. آپ کو کئی کلو میٹر پیدل چلنا پڑے گا۔ اس لیے آپ تھکن اور مشقت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیے.."

"کس کے لیے تیار ہو جائیے.." عمر رسیدہ شاعر جس کے پیٹ میں ابھی تک پچھلی شب کے ڈنر کی مخدوش خوراکیں کلبلا رہی تھیں اور جو بیس ہوٹل سے روانگی پر کوچ میں بیٹھتے ہی ایک عمر رسیدہ اونگھ میں چلا گیا تھا۔ اس اونگھ سے واجبی طور پر باہر آیا اور بولا.. اور جب میجر لیو نے اسے پھر مطلع کیا کہ شہرِ ممنوعہ میں ایک طویل مسافت درپیش ہے تو اس نے آس پاس نگاہ کر کے ہم سے دریافت کیا "یارو یہ شہرِ ممنوعہ کیا ہے؟"

ہم کیا بتاتے کہ یہ کیا ہے.. سوائے اس کے کہ یہ ممنوعہ ہے..

"اچھا اچھا.. یہ فاربڈن سٹی ہے.. میں نے اس کی تصویریں دیکھ رکھی ہیں بلکہ اس کے بارے میں نیشنل جیوگرافک کی ایک دستاویزی فلم بھی دیکھی تھی.. تو میں جانتا ہوں کہ یہ کیسا ہے.. کیا یہ بہت ہی ضروری ہے؟" اس نے لیو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ دیوارِ چین کے بعد دنیا بھر میں ہماری سب سے بڑی پہچان ہے.. بیجنگ کے دل میں ایک اور شہر.. محلات.. درباروں.. مہمان خانوں.. شاہی نوادرات اور تفریح گاہوں اور تالابوں اور نہروں کا ایک ایسا قدیم شہر جس میں ہزاروں برس سے چین کے شہنشاہ قیام کرتے تھے اور عوام الناس کو اس کے اندر آنے کی ممانعت تھی.."

"اور اگر کوئی اسے نہ دیکھنا چاہے تو؟"

"تو وہ اسی کوچ میں بیٹھا رہے.. یہ کوچ شہرِ ممنوعہ کے پار اس عظیم گیٹ پر ہماری منتظر ہو گی جس میں سے تقریباً تین چار گھنٹے کے بعد ہم برآمد ہوں گے.. آپ نہیں جائیں گے؟"

"نہیں.." عمر رسیدہ شاعر نے خوش دلی سے کہا۔ "میں اس کی تصویریں دیکھ چکا ہوں.. اور جو تصویریں آپ لوگ اتاریں گے انہیں بھی دیکھ لوں گا.. مجھ میں سکت نہیں اتنا پیدل چلنے کی.. پھر ملیں گے.. خدا حافظ۔" اور یہ کہہ کر وہ اپنی نشست پر پاؤں پھیلا کر پھر اپنی عمر رسیدہ اونگھ کے مزے لوٹنے لگا..

شہرِ ممنوعہ کی دیواریں قابلِ فہم طور پر بہت بلند تھیں.. ان میں سرخ رنگ کے برج میناروں تک جاتے دیدہ زیب دروازے تھے جنہیں دیکھ کر پہلی بار یقین آیا کہ ہم ملک چین میں ہیں کہ ان کی قدامت.. سرخی اور سنہری پن کسی اور دیس کا نہیں ہو سکتا تھا.. ان دروازوں کے نیچے نہایت جدید تکنیک کے ٹکٹ گھر تھے جہاں سیاحوں کی قطاریں لگی تھیں۔ شہرِ ممنوعہ کو سیاحتی کتابچوں اور تاریخی کتب کے حوالے سے نہایت آسانی سے گھر بیٹھے بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک ہزار سے زائد کمرے ہیں.. متعدد ہال ہیں.. درجنوں صحن ہیں.. یہ یہ نوادرات ہیں.. اتنے کُبڑے پُل ہیں اور اتنے شاہی تخت ہیں.. لیکن یہ معلومات تو آپ انٹرنیٹ کی مدد سے اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک "چوہے" پر انگلی رکھے بھی حاصل کر سکتے ہیں..

تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ایک تتلی آنکھوں دیکھا حال بیان کرے..

ایک مخبوط الحواس.. اور.. بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ قسم کا آوارہ گرد اسے آپ کو اپنی آنکھوں سے دکھائے.. بے شک کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی.... وہ جو اس پہ گزری اس کا احوال رقم کرے.. یعنی.. جو ہم پہ گزری سو گزری مگر... ہمارے اشک نہیں کچھ لفظ آپ کی عاقبت.. اگر آپ اس پر یقین رکھتے ہوں تو.. اسے سنوار دیں..

شہرِ ممنوعہ..

فاربڈن سٹی..

میرے سامنے.. دیوار کے پار.. عظیم دروازوں میں سے ٹکٹ کی اذن بارگاہی حاصل کرنے کے بعد.. ایک دھندلکا تھا۔

پورے بیجنگ میں تیز دھوپ تھی۔

مگر شہرِ ممنوعہ پر ایک گرم دھند اتری ہوئی تھی۔ نہ وہ پوشیدہ ہوتا تھا اور نہ ظاہر ہوتا تھا۔

یہ دھند اس کا حجاب تھا... ایک پردہ تھا جس کے پیچھے وہ روپوش تھا.. اور ہمیں فی الحال نظر نہ آتا تھا...

یہ عین ممکن تھا کہ جو بھی ہم دیکھنے کو تھے وہ سراب تھا ایک خیال تھا اور شہرِ ممنوعہ

اب بھی ممنوعہ تھا۔

لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے دُھند ہلکی ہوگئی اور صحرا ایسی وسعتوں میں سے ڈھلوان سرخ چھتوں کے عظیم محل.. مہمان خانے‘ شاہی دربار اور تخت پوش نمودار ہونے لگے..ان عمارتوں اور ہمارے درمیان ایک ایسا صحن پھیلا ہوا تھا جس میں نہریں بہتی تھیں جن پر کُنگرے پُل اور محرابیں ایستادہ تھیں۔ شاہی تالاب اور نقارے تھے۔ سنگ مرمر کی گیلریاں تھیں اور ان شاہی رہائش گاہوں تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایک کلومیٹر کے لگ بھگ فاصلہ طے کرنا تھا... صحن کے گرد سینکڑوں کی تعداد میں شاہی حویلیاں اور ان کے صحن تھے..شہرِ ممنوعہ کے پہلے محلاتی مجموعے کو ایک طویل فاصلے پر دیکھ کر ہم پہلا قدم اٹھانے سے پیشتر ہی تھک گئے.. یہاں تو بسوں اور رکشاؤں کا بندوبست ہونا چاہیے تھا..لیکن اس صحرائی وسعت کے صحن میں سینکڑوں ملکی اور غیر ملکی سیاح تھے جو آہستہ آہستہ ان شاہی عمارات کی طرف بڑھ رہے تھے‘ اس لیے ہم نے بھی گہرے گہرے سانس لے کر کمرِ ہمت باندھی اور عازمِ سفر ہوگئے..

میں نے پُرشکوہ اور جلال و جمال کے آئینے منقش محل تو بہت دیکھے تھے..قصرالحمرا طوپ قپو کے محلات اور شیش محل کے معجزے دیکھے تھے لیکن وہ سب تو پہلے قدم کے ساتھ شروع ہو جاتے تھے..اور یہاں ایک اونٹ درکار تھا جو منزلیں مارتا ہوا مجھے ان محلات تک لے جائے..شاید اسی لیے انہیں چینی شہنشاہوں کے محلات نہیں کہا جاتا تھا بلکہ شہرِ ممنوعہ کا نام دیا گیا تھا اور شہروں میں فاصلے اور منزلیں ہوتی ہیں..

ایک بار میں نے ’’ہندوستان کے راجپوت محل‘‘ نامی ایک تصویری کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اپنی بیگم سے کہا تھا کہ ہم اتنے مختصر سے گھر میں رہ کر اپنی نگری کے سلطان ہوئے جاتے ہیں‘ متکبر ہوتے جاتے ہیں اور ان لوگوں کو جو ہم سے بھی چھوٹے گھروں میں رہائش رکھتے ہیں انہیں حقیر جاننے لگتے ہیں تو جو شخص ان محلات میں رہتا ہوگا.. تقریباً ایک کلومیٹر کے علاقے میں پھیلی ہوئی اپنی رہائش گاہ اور اس کے گلستانوں اور برج میناروں پر نظر ڈالتا ہوگا وہ دوسرے لوگوں کو کیا سمجھتا ہوگا..اور یاد رہے کہ یہ محل کسی ایک گمنام

سے راجہ صاحب کا تھا کسی بادشاہ یا شہنشاہ کا نہ تھا..

تو جو شخص اس پورے شہرِ ممنوعہ میں رہتا ہوگا وہ دوسروں کو کیا سمجھتا ہوگا..تکبر کی کس سیڑھی پر ہوگا..بلکہ وہ اس سیڑھی کو طے کر کے کہیں آگے ہوگا..خدائی سے بھی کہیں آگے..اور ہم اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ اگر ہم ایک بارہ مرلے کے گھر میں خدا ہو سکتے ہیں تو وہ اس پورے شہر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ نمرود اور فرعون کو برا بھلا کہنا اگرچہ عین ثواب ہے لیکن ان کے تکبر اور خدائی کو پیغمبروں کے سوا صرف وہی چیلنج کرے جو خود نمرود اور فرعون کی طاقت اور سلطنت رکھتا ہو۔ وہی اس عہد کے خدا تھے‘ وہی الوہی روپ اور آخری سچائی تھے...

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم پاکستان سے آئے ہوئے نہایت حقیر کیڑے مکوڑے ہیں جب ہم اس شہر میں داخل ہوئے تو ہمارے قد بڑھنے لگے.. ہمارے اردگرد خدام اور غلام جھکنے لگے..ہماری گردنیں اکڑ گئیں.. یہاں تک کہ میری شلوار قمیض ایک اطلس و کمخواب کے شاہانہ لبادے میں بدل گئی.... یہ شاہی چوغہ میرے پیچھے گھسٹتا چلا آ رہا تھا..

ہم محض سیاح تھے..چند یوآن کا ٹکٹ خرید کر چند لمحوں کے لیے اس شہر میں داخل ہوئے تھے اور پھر بھی اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگے..

تو ذرا چشمِ تصور میں لائیے کہ جو نسل در نسل یہاں رہتے تھے‘ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے تھے..وہ اپنے آپ کو جو کچھ بھی سمجھتے تھے درست سمجھتے تھے اور ہم انہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے..کہ یہی انسان کی خصلت ہے..وہ صرف انہیں تکبر اور خدائی کا طعنہ دیتا ہے جن کے مرتبے تک وہ نہیں پہنچ سکتا اور اگر پہنچ جائے تو وہ بھی وہی ہو جاتا ہے۔

شہرِ ممنوعہ ایک شہرِ شالیمار تھا..جو تہہ در تہہ..تختہ در تختہ اترتا تھا..

ایک بلند مرتبت پھاٹک کے پار منقش پتھریلے زینے...چینی اژدھے..شیر.. ایک بے انت میدان میں اتر رہے ہیں..جس میں ہم اتر چکے ہیں..اور ایک عظیم میدان کے آخر میں شہرِ ممنوعہ کے محل دھند میں نمودار ہوتے..ایک سرخ تاج محل کی صورت..لیکن بہت دور..کیا میری ساتھی تتلی میں اتنی قوت پرواز ہے کہ وہ تقریباً پون کلومیٹر کا یہ فاصلہ طے کر کے اس چینی تاج محل تک پہنچ کر اس کے دروازوں پر دستک دے اور یہ کہے کہ یہ

درکھول دو میرے ہمراہ ایک آوارہ گرد ہے جو بہت دور سے آیا ہے‘ شہرِ ممنوعہ کے اندر جو بھید ہیں انہیں جاننے کے لیے..

یقیناً سامنے نظر آتا یہ چینی محل.. تاج محل نہیں ہے..لیکن اگر چین میں کوئی شاہجہان تھا اور وہ تھا. تو اس کا ذوقِ جمال چین کے روایتی حسنِ تعمیر کو اوجِ کمال تک پہنچانے کے لیے اگر کوئی تاج محل تعمیر کرتا تو وہ ہوبہو ایسا ہی ہوتا جو مجھے اس لق و دق میدان کے آخر میں سرخ ستونوں پر آویزاں دھند میں ابھرتا نظر آ رہا تھا..

لق و دق میدان میں چینی اور غیر ملکی سیاح کیڑوں مکوڑوں کی مانند رینگتے اس تاج محل کی جانب سفر کرتے تھے..

اور ہم بھی رینگتے تھے..

ہمارے آگے ’’شوٹنگ‘‘ جاری تھی..ایک چھوٹی سی چینی گڑیا بچی جو اپنے ماں باپ کی لاڈلی تھی..صرف اس لیے لاڈلی تھی کہ چین میں صرف ایک بچہ پیدا کرنے کی اجازت ہے تو اگر ایک ہی بچہ ہوگا تو وہ لامحالہ لاڈلا ہوگا... یہ بچی پہلی بار شہرِ ممنوعہ میں لائی گئی تھی اور اس تاریخی اہمیت کے لمحے کو ریکارڈ کرنے کے لیے اس کے ماں باپ نے..ایک لیڈی وڈیو میکر کرائے پر حاصل کرلی تھی جو شہرِ ممنوعہ کی جانب اپنی مختصر پشت کیے اس بچی کو ’’شوٹ‘‘ کر رہی تھی.. پُرفخر ماں باپ کبھی کبھار منظر میں داخل ہو کر اپنی بیٹی کے بال سنوارتے..اسے ایک ٹافی یا سویٹ تھماتے اور پھر پیچھے ہٹ جاتے..تاکہ فلم بندی میں خلل نہ پڑے۔

یہاں میں ایک سانحے کا ذکر کرنا پسند کروں گا۔

ہم نے بھی ایک مقامی وڈیو میکر ہائر کر رکھا تھا..

شہرِ ممنوعہ میں داخل ہونے سے پیشتر ہمیں اطلاع کی گئی کہ ہم اس شہر سے ملاقات کو ایک ابدی روپ دے سکتے ہیں اور ایک وڈیو فلم تیار کروا سکتے ہیں۔اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا تو ہر بندے کے حصے کچھ بہت زیادہ یوآن نہیں آتے تھے اس لیے ایک عدد وڈیو میکر ہائر کر لیا گیا..

اس وڈیو میکر کو ہم لِن یُوتانگ کہہ سکتے ہیں..

اس لِن یوتانگ نے ہمیں بہت خوار کیا..

میں خود تصویر کشی سے بے حد رغبت رکھتا ہوں اور ایک زمانے میں سفر کے کسی بھی ایک لمحے کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا..اسے فوری طور پر قید کر لیتا تھا..اسی شوق کی خاطر اپنے دامن کو دریدہ کر کے ایک سونی ہینڈی کیم خریدا اور ’’کے ٹو کہانی‘‘ اور ’’یاک سرائے‘‘ کو اس میں قید کر لیا..میں بہت جلد اس مشغلے سے اکتا گیا کہ وڈیو میں کہیں نہ ہوتا تھا۔میرے ساتھی دانت نکالتے ہوئے‘ پوز بناتے..ہیرو بنتے ہوئے تو ہوتے تھے اور میں نہ ہوتا تھا اور میں اس کے لیے اتنی مشقت کرتا تھا کہ بہترین زاویوں کے پاگل پن میں سب سے پیچھے رہ جاتا تھا یا کسی چوٹی پر چڑھ جاتا تھا اور پھر نیچے نہیں اتر سکتا تھا..چنانچہ میں نے اس شغل کو ترک کر دیا..پھر نیپال نگری کی جانب سفر کرتے ہوئے میرا اسٹل کیمرہ بھی چوری ہو گیا..اور مجبوراً مجھے شمشال بے مثال اور نلتر کی وادیوں میں کیمرے کے بغیر سفر کرنا پڑا اور تب مجھ پر کھلا کہ ایک کیمرہ بردار کوہ نورد کتنا احمق ہوتا ہے..اس کی کوہ نوردی کا کوئی بھی لمحہ اس کے بدن میں نہیں اترتا..وہ ہمہ وقت اسی سوچ میں غرق رہتا ہے کہ اس منظر کی تصویر کس زاویے سے اتاری جائے...کس مقام سے ایک حیران کن تصویر بنے گی..وہ زاویوں اور مقامات کی تلاش میں رہتا ہے اور خالی الذہن ہو کر..لاپرواہ ہو کر کسی بھی منظر کو نہیں دیکھتا..وہ نابینا ہو جاتا ہے..وہ کیمرے کے ویو فائنڈر سے دنیا کو دیکھتا ہے اور یہ دنیا وہ نہیں ہوتی جو ایک خالی تصویر کے لالچ سے آزاد آنکھ کو نظر آتی ہے..چنانچہ اب میں تصویر کے طلسم سے آزاد ہو چکا تھا..کیمرے کی بجائے وہ طلسم اب میرے بدن میں تصویریں بناتا تھا..چنانچہ یہ لِن یُوتانگ وڈیو میکر جو تھا اس کی موجودگی مجھے ڈسٹرب کر رہی تھی..یہ ہر منظر میں حائل ہوتا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ جب کیمرے کی آنکھ کھلتی ہے تو اس کے سامنے بے شک ایک وزیراعظم ہو یا میرے جیسا عوام الناس...وہ چوکنے ہو جاتے ہیں..نروس اور ابنارمل ہو جاتے ہیں...

یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا...

ہم سب ابنارمل ہو گئے...

ہر کوئی ذاتی کوشش کرتا تھا کہ وہ ویڈیو کیمرے کی زد میں رہے.. شہرِ ممنوعہ جائے بھاڑ میں لیکن تصویر اتر جائے..

چنانچہ.. گیانی.. جو بعد میں گیانی گگلی کے نام سے مشہور عالم ہوا.. اپنی تیکھی مونچھیں سنوارتا.. ٹائی کی گرہ درست کرتا کیمرے کے لینز کے سامنے جا کر تادیر ٹھہرتا ہے..

گیسو دراز صرف اس ستون کو غور سے دیکھتا ہے جس پر کیمرہ مرکوز ہے..

دہقان ایک بدھا مسکراہٹ کے ساتھ.. بس وہاں ہوگا جہاں ویڈیو میکر ہوگا۔

حسرت ناک کی ناک کیمرے سے باہر نکل جاتی ہے مگر وہ اپنے آپ کو اسی مقام پر تعینات رکھتا ہے جہاں کیمرہ زم اِن کر رہا ہے..

لیڈر اپنے گرے کوٹ کا کالر مسلسل درست کر رہا ہے..

یہاں تک کہ سفید ریش بھی اپنی ریش کو تب سنوارتا ہے جب لن یُوتا نگ اپنے ویڈیو کیمرے کا رخ اس کی جانب کرتا ہے..

اور میں بھی ایک بوسیدہ اور آؤٹ ڈیٹڈ اداکار کی حیثیت سے کوشش کرتا ہوں کہ قدرے بے اعتنائی سے.. کیمرے کے فوکس میں رہوں..

یہ لن یُوتا نگ بھی عجیب تماشا تھا.. وہ کبھی یکدم بھاگتا ہوا کسی ستون کے پیچھے روپوش ہو کر آہستہ آہستہ اپنا کیمرہ ظاہر کرتا اور کوئی کمال کا ''شاٹ'' لیتا.. کبھی کسی سوکھے ہوئے تالاب میں لیٹ جاتا اور کبھی کسی پتھریلے شیر کے پنجوں میں سے برآمد ہو کر اپنے تئیں ایک شاہکار زاویہ بناتا.. وہ اتنے پینترے بدلتا تھا.. اپنے آپ کو ایسی ایسی مشکلوں میں مبتلا کر کے گردن توڑ قسم کے زاویے بنا کر فلم بندی کرتا تھا کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ فلم ''دے لاسٹ ایمپرر'' سے بھی کہیں بڑھیا اور عالی شان ہوگی اور کین یا برلن کے کسی بین الاقوامی فلم فیسٹیول میں ہر صورت گولڈن بیئر یعنی سنہری ریچھ ایوارڈ وغیرہ حاصل کر کے رہے گی.. اس لیے ہم جو اس کے کردار تھے' اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے اور لن یُوتا نگ کے کیمرے کی تُوتھی جدھر جاتی تھی' اُدھر ہم جاتے تھے۔ جدھر گھومتی تھی' اُدھر ہم لٹو ہونے لگتے تھے.. بھلا ایک بین الاقوامی سطح کی فلم میں اداکاری کرنے

کا اعزاز روز روز کہاں نصیب میں ہوتا ہے..

اُس شب جب ہم نے اس ویڈیو فلم کو نہایت اشتیاق سے ملاحظہ کیا تو اس میں نہ ہم تھے اور نہ شہرِ ممنوعہ تھا.. کچھ سیاہ بُھتنے سے تھے جو دانت نکال رہے تھے.. چند ہیولے بار بار حرکت کرتے تھے.. لرزتے ہوئے سائے اور کچھ عمارتیں سی تھیں.. اور بہت سارا آسمان تھا.. شاید یہ ویڈیو میکر کا پہلا پروجیکٹ تھا اور وہ اس سے پیشتر بیجنگ کے فٹ پاتھوں پر مینڈک فرائی کرتا تھا کہ اس کے جتنے بھی شاٹس تھے' وہ سب کے سب اچھلتے تھے.. ایک جگہ قیام ہی نہ کرتے تھے.. اور فلم میں سے مسلسل ایسی آوازیں بھی آتی تھیں جیسے برسات کے بعد مینڈک ٹرّا رہے ہوں.. اس فلم کو سنہری ریچھ ایوارڈ تو نہیں مل سکتا تھا' البتہ سنہری جوتا ایوارڈ ضرور پڑ سکتا تھا..

جی تو قصۂ لن یُوتا نگ سے پیشتر ہم کہاں تک پہنچے تھے.. ہم شہرِ ممنوعہ میں داخل ہو کر اس سرخ تاج محل کی جانب عازمِ سفر تھے جو ایک تالابوں' جھیلوں' پلوں اور مجسموں کے صحرا کے آخر میں ہلکی دھند میں سے ابھرتا تھا..

خدا خدا کر کے اس عظیم اور وسیع میدان کا سفر اختتام کو پہنچا اور ہم اس کے بیس کیمپ میں پہنچ گئے.. اس کے دامن میں بالکونیوں اور خوش نظر زینوں کا ایک پُرپیچ کمپلیکس تھا جس کے اوپر کہیں وہ چینی شہنشاہیت کا تاج محل تھا.. ہم نے ذرا دم لے کر.. کمر ہمت کس کر باندھی اور ان زینوں پر چڑھنے لگے.. اور بالآخر اس کے ستونوں کے سائے میں آ گئے.. وہ اتنا بلند' پُرشکوہ اور پُرہیبت تھا کہ گویا ایک ہزاروں برس قدیم برگد تھا جس کی داڑھیاں اس کے گھنے وجود میں سے اتر کر زمین میں پھر سے جڑیں پھیلاتی تھیں اور اپنا ہی ایک ذاتی جنگل تخلیق کرتی تھیں.. اور ہم اس کے مقابلے میں گھاس کی ایک پتی تھے جو ہوا کے چلنے سے ہولے سے سرسراتی ہے اور منہ اٹھا کر اس برگد کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے اور سوائے چند پتوں کے دو چار ڈالیوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا..

یہ سرخ تاج محل اتنا بڑا تھا..

اس کے دروازے مقفل تھے.. اس کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی.. یہ ابھی تک

ممنوعہ تھا..البتہ شیشے کی چند دیواریں تھیں جن کے پیچھے ایک عظیم ہال نظر آتا تھا..
وہ تخت نظر آتا تھا جس پر چینی خدا بیٹھتے تھے...

ریشم واطلس کی وہ پوشاکیں نظر آتی تھیں جو چینی شہزادیوں کی زردی کو ڈھکتی تھیں۔ملبوس بے شک کھدّر کا ہو اگر چینی شہزادی کے بدن سے چھو جائے تو ریشم واطلس کا ہو جاتا ہے..ہم شیشے کی دیواروں سے ناکیں چپکائے شہرِ ممنوعہ کے پہلے محل..جس کے اندر بہت سے چھوٹے محل اور ہال بھی تھے.. پہلے کمپلیکس کے اندر چینی تاریخ کی کڑیاں جوڑنے کی کوشش کرتے رہے..ہماری ناکیں اتنی دیر تک چپکی رہیں کہ چپٹی ہو گئیں اور یقین کیجیے کہ ایک گجراتی ستواں ناک کو صرف چینی تاریخ ہی چپٹا کر سکتی ہے..اور پھر بھی یہ کڑیاں نہ جُڑ سکیں کہ ان کی تعداد بے انت تھی..چین کی قدیم ترین تاریخ تک کا سفر تو بے حد طویل ہے..چلیئے اس کڑی کو دیکھتے ہیں جس میں قبلائی خان اسی شہرِ ممنوعہ میں اسی تخت پر براجمان تھا اور اطالوی سیّاح مارکو پولو اس کا درباری تھا..

''اگر قبلائی خان سے پوچھا جاتا کہ وہ تمام مذاہب کو ایک جیسی تکریم کے لائق کیوں سمجھتا ہے تو وہ جواب دیتا ''کل چار پیغمبر ہیں جن کے مذاہب کی دنیا بھر میں پیروی کی جاتی ہے۔عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی عبادت کرتے ہیں۔عربی حضرت محمدؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔یہودیوں کا حضرت موسیٰؑ پر ایمان ہے جبکہ بُت پرست شاکیہ منی کو مانتے ہیں۔میں ان چاروں کی تہہ دل سے عزت کرتا ہوں۔ان کے ذریعے دراصل میں خدا سے مدد کا طالب گار ہوتا ہوں جو تمام آسمانوں اور زمین کا فرمانروا ہے..میں خود بھی اس کی عبادت کرتا ہوں..''

مارکو پولو اپنے سفرنامے میں قبلائی خان کو یوں بیان کرتا ہے..

''آقاؤں کا آقا قبلائی خان درمیانے قد کاٹھ' چوڑے چکلے جسم کا مالک ہے۔اس کی رنگت گلاب کی مانند سرخ وسفید ہے۔آنکھیں سیاہ ہیں۔اس کی چار بیویاں ہیں۔اس کا سب سے بڑا بیٹا چنگیز فوت ہو چکا ہے لیکن چنگیز کا ایک بیٹا تیمور اس کا ولی عہد ہے۔''

مارکو پولو شہرِ ممنوعہ کو بھی بیان کرتا ہے۔

''ہر سال میں تین مہینے قبلائی خان کیتھے کے دارالحکومت خان بلگ (بیجنگ) میں گزارتا ہے۔اس کے عالی شان محل کے گرداگرد ایک چاردیواری ہے جس کی تمام اطراف ایک ایک میل طویل ہیں۔محل کی اندرونی دیواریں سونے اور چاندی سے بھری ہوئی ہیں۔ان پر گھڑسواروں' اژدھوں اور پرندوں کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہیں۔محل کے مرکزی مہمان خانے میں چھ ہزار سے زائد افراد قیام کر سکتے ہیں..چین میں شہتوت کے درخت کی چھال سے کاغذی نوٹ تیار کیے جاتے ہیں۔ہر نوٹ پر قبلائی خان کی مہر ثبت ہوتی ہے۔اس کرنسی نوٹ کی اتنی ہی وقعت ہے جو سونے چاندی کے سکّوں کو حاصل ہے..یہ نوٹ اتنی تعداد میں تیار کیے جاتے ہیں کہ قبلائی خان ان کی مدد سے دنیا بھر کے سکّے خرید سکتا ہے۔ان نوٹوں سے موتی' قیمتی پتھر' سونا چاندی سمیت ہر شے بآسانی خریدی جا سکتی ہے..یہ کرنسی وزن میں بھی کم ہے اور کوئی انہیں لینے سے انکار کرے تو اسے موت کی سزا دی جاتی ہے۔''

قبلائی خان کے بعد کی تمام کڑیوں کو نظرانداز کر کے ہم اس کی آخری کڑی پر آ جاتے ہیں..چین کے آخری شہنشاہ تک آ جاتے ہیں۔

ہنری پویی..مانچو خاندان کا دسواں حکمران اسی شہرِ ممنوعہ میں پروان چڑھا اور 1908ء میں صرف تین برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔صرف تین برس کی شہنشاہی کے بعد ایک انقلاب کے نتیجے میں اس تخت سے نیچے آ گیا' البتہ بارہ برس شہرِ ممنوعہ میں قیام نصیب ہوا اور پھر فرار ہو گیا..دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپانی چین پر قابض ہوئے تو انہوں نے اسے پھر سے تخت پر بٹھا دیا۔پھر روسیوں کا ورود ہوا اور وہ اسے گرفتار کر کے روس لے گئے۔

1950ء میں انہوں نے اسے چین کے حوالے کر دیا تاکہ عوام الناس اسے بوٹی بوٹی کر کے دل کی بھڑاس نکال سکیں..چینیوں نے دانش مندی دکھائی اور اسے قتل کرنے کی بجائے جیل میں ڈال دیا..جہاں ایک روایت کے مطابق اس نے پہلی بار اپنے دانتوں کو اپنے ہاتھوں سے برش کیا..پہلی بار خود غسل کیا اور بوٹوں کے تسمے اپنے شاہی ہاتھوں سے

باندھنے بھی سیکھ لیے.. 1960ء میں اسے آزاد کر دیا گیا اور بیجنگ کے بوٹانیکل گارڈن میں ایک مالی کی ملازمت سے نواز دیا گیا جہاں اس نے بقیہ زندگی پودوں کو پانی دینے' گوڈی کرنے اور بندگوبھیاں اگانے میں گزاری.. یہ بوٹانیکل گارڈن اس کے آبائی گھر شہرِ ممنوعہ کی قربت میں واقع تھا.. اپنی پانچویں بیوی کے ہمراہ وہ ایک بوسیدہ صحن والے ایک ایسے گھر میں رہتا تھا جس کی چھتیں ٹپکتی تھیں.. 1967ء میں کینسر کے عوامی مرض سے چین کا آخری شہنشاہ انتقال کر گیا.. البتہ 1995ء میں اس کی حیثیت اس حد تک تسلیم کر لی گئی کہ اس کی خاک اور ہڈیاں قنگ شہنشاہوں کے قدیم مقبروں میں اس کے آباؤاجداد کے پہلو میں دفن کر دی گئیں...

''فاربِڈن سٹی کا سُرخ تاج محل''

ہم نے اس محل کی کھڑکیوں اور شیشے کے روزنوں میں سے جھانک کر اس کی زیارت مکمل کی اور اس کے پہلو سے نکل کر ذرا آگے ہوئے تو..

ایک اور دریا کا سامنا تھا..

یہ تو شہرِ ممنوعہ کا آغاز تھا.. پہلی عمارت تھی اور ہمارے سامنے ایک اور طویل میدان تھا جس میں سیاح رینگتے ہوئے ایک اور سرخ تاج محل کی جانب بڑھ رہے تھے.. گویا شالیمار کا ایک اور تختہ نظر کے سامنے تھا... ہم بھی ان سیاحوں میں شامل ہو کر نصف کلومیٹر سے زائد فاصلے پر واقع ایک اور محل کی جانب رینگنے لگے..

ہمارے دائیں بائیں بھی محلات' مہمان خانوں اور بارہ دریوں کی ڈھلوان سرخ چھتوں کی اتنی بہتات تھی کہ ہم ان پر نظر کرتے تھے تو صرف ایک نظر کرتے تھے اور چلتے جاتے تھے..

اور اس وسیع صحن میں چلتے ہوئے جب میں اپنے رفیقوں سے ذرا الگ ہوا تو ایک ایسا لمحہ آیا جب حیرت انگیز طور پر سب کچھ ویران ہو گیا..

یکدم بائیں ہاتھ پر محلات کا جو سلسلہ تھا وہاں ایک بھی ٹورسٹ نہ تھا... کوئی ایک شخص نہ تھا جو ادھر آیا ہو..

یہیں پر میری ایک تصویر ہے..

تصویر میں شہرِ ممنوعہ کی تہہ در تہہ سرخ ڈھلوان چھتوں کے محل نظر آتے ہیں اور ان کے عقب میں سے سرو کے چند تنہا درخت اپنے تکونے چہروں سے صحن میں جھانکتے ہیں۔ ایک سنگِ مرمر کی قید میں خوش نما آبی گزرگاہ ہے جس کے سفید پُل کی کمان پر کوئی نہیں..اور ایک بے رنگ آسمان ہے..فرش سلیٹی رنگ کا ہے اور ایک میدان ہے جس کی وسیع تنہائی میں..بیگ کندھے پر ڈالے گرے شلوار قمیض میں ایک شخص حیران کھڑا ہے کہ قبلائی خان کے سحرزدہ محلات میں رہنے والے کیا ہوئے...

نہ وہاں خدام کی فوج ظفر موج ہے..نہ پالکیاں ہیں جن میں سوار چینی شہزادیاں اس شہرِ ممنوعہ کی وسعت میں اپنے محل سے کسی اور محل کی جانب سفر کرتی ہیں..نہ غلام دکھائی دیتے ہیں اور نہ ریشم کے طویل لبادوں کو سمیٹتے چگی داڑھیوں اور منگول آنکھوں والے وزیرِ کبیر ہیں..صرف ایک شخص ہے..صرف میں ہوں۔

وقت نے مجھے... چند روزہ حیات رکھنے والی ایک ناتواں تتلی کو..ان سب پر غالب کر دیا ہے..ان سے برتر کر دیا ہے..صرف اس لیے کہ میں سانس لیتا ہوں...اور وہ...مر چکے ہیں۔ فنا...بے شک کُل کائنات کی بادشاہت ہو لیکن وہ ایک زندہ سانس کے آگے ہار جاتی ہے..

دو آہنی شیر اپنے سنگھاسنوں پر بیٹھے دم بخود ہیں...شاہکار سفید ٹیلوں پر کوئی نہیں صرف میں ہوں..

صرف ایک دم کی بدولت جس کا کوئی بھروسہ نہیں میں شہرِ ممنوعہ کے ماضی کے تمام مکینوں پر سبقت لے گیا تھا..

اس تصویر کے بعد سفر پھر شروع ہو گیا..صحرائے سنگ میں چلتے گئے۔ سامنے جو ایک اور خوش نظر جادوئی محل تھا‘ اس کی جانب چلتے گئے..

آخر منزل آ گئی.. چوڑے زینوں کے سنگِ مرمر پر تھکے ہوئے جوگروں سے تھپ تھپ کرتے اوپر گئے اس محل کے ستونوں تک پہنچے...اس کے اندر کچھ تانک جھانک کی اور پھر اس کے پہلو سے نکل کر ذرا آگے ہوئے تو..

ایک اور دریا کا سامنا تھا۔

ایک اور میدان تھا جس کے آخر میں پچھلے دونوں محلات کا ایک اور فوٹو سٹیٹ دکھائی دے رہا تھا..ہماری ٹانگیں جواب دینے لگیں..

ہم تکلا مکان یا صحرائے گوبی عبور کرنے کے ارادے سے تو نہیں آئے تھے لیکن اسی قسم کا سفر درپیش تھا..

’’حضور ادھر کوئی ٹیکسی میسر نہیں ہے؟‘‘ میں نے ہانپتے ہوئے لیو سے کہا۔

’’نہیں..‘‘ وہ میری تھکاوٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ وہ مختلف غیر ملکی وفود کے ہمراہ یہاں آتا رہتا تھا اور ان مسافتوں کا عادی تھا..

’’تو پھر کوئی پالکی ہی منگوا دیجیے..کہاروں کا خرچہ میں اپنے پلّے سے ادا کر دوں گا..میں نے کہیں پڑھا تھا کہ شہرِ ممنوعہ میں معمولی قسم کے شہزادے بھی صرف پالکیوں میں سفر کرتے تھے..اور اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ کیوں کرتے تھے..‘‘

’’شہنشاہیت کا خاتمہ ہو چکا..اب عوام کی حکومت ہے اور عوام پیدل چلتے ہیں..‘‘

لیو نے اپنے آس پاس گرتے پڑتے وفد کے اراکین کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ فضا میں بلند کیا اور گرج کر کہا ’’فالومی...‘‘ اور پھر شرمندہ ہو کر ہنسنے لگا..

شروع شروع میں تو ہم نے لیو کی اس حرکت کا سخت مائنڈ کیا کہ وہ ہوٹل کی لابی میں یا کسی عمارت میں داخل ہوتے ہوئے ہم سب کو بھیڑوں کی مانند جمع کرتا اور پھر اپنی عینک درست کر کے فضا میں ہاتھ لہرا کر ’’فالومی‘‘ کی کمانڈ دیتا اور ہمارے آگے کوئک مارچ کرنے لگتا...ہم اس قسم کے ڈسپلن کے عادی نہ تھے اور یوں بھی دانشور تھے...اپنی مرضی سے چلتے تھے..اپنی مرضی سے کنویں میں چھلانگ لگا دیتے تھے لیکن کسی کا کہنا نہیں مانتے تھے..لیو کی یہ عادت اس کی فوجی زندگی کا شاخسانہ تھی..پھر آہستہ آہستہ ہم نے اس کی اس عادت سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا..اور اگر وہ اپنی اس کمانڈ کو فراموش کر دیتا تو ہم سب مل کر ہاتھ اٹھا کر ’’فالومی‘‘ کا نعرہ لگا دیتے..بلکہ اب وہ قدرے جھجکتا تھا کیونکہ ہم میں سے کوئی ایک غسل خانے کا رخ کرتا تو مڑ کر لیو سے کہتا ’’فالومی‘‘....یا کسی خاتون کو دیکھ کر

آنکھوں میں چمک آتی تو لیو سے مخاطب ہو کر خاتون کی طرف اشارہ کر کے کہا جاتا ''فالومی...''

چنانچہ ہم نے بخوشی لیو کے پیچھے ''فالومی'' کیا اور چلنے لگے..

ہم تیسرے محل تک پہنچ گئے.. پھر اس کے پہلو میں سے نکل کر دوسری جانب جاتے ہیں اس امید پر کہ ہر شہر کی طرح یہ شہر بھی ختم ہو جائے گا..ہم اس کے مضافات میں داخل ہو جائیں گے...کالا شاہ کاکو یا منڈی مرید کے آ جائیں گے لیکن یہ چینی لاہور ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا...جہاں اس کے خاتمے کی توقع ہوتی تھی وہاں پہنچتے تھے تو نئے سرے سے پھر شروع ہو جاتا تھا..

شاید میرے بیان سے یہ ظاہر ہو رہا ہو کہ شہرِ ممنوعہ نری بُری مشقت تھی...مجبوری کی مسافت تھی..

نہیں... یہ تاثر درست نہیں..صرف عجزِ بیان ہے جو وہ کچھ نہیں دکھا پاتا جو میں دیکھ رہا تھا..

شاہ گوری تک پہنچنے کے لیے..جھیل کرومبر اور سنولیک کا دیدار کرنے کے لیے بھی تو مشقّت کرنی پڑتی ہے اور وہ رائیگاں نہیں جاتی..

یہ مشقّت بھی قطعی رائیگاں نہیں تھی۔

اس لیے کہ یہ ایک اور پیدائش تھی...ایک اور کائنات ایک اور جہان تھی...میرا بدن اور میرا پہناوا پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور میں اپنی تھکن سے لاپرواہ چلتا جا رہا تھا اور میرے آس پاس اور سامنے چینی ہُنرمندی اور کرشمۂ تعمیر کے معجزے رونما ہوتے جاتے تھے..

تہہ در تہہ سرخ چھتیں..

سنہری جالی دار دروازے..میری سرخ آنکھیں اور ڈھلوان سرخ چھتیں...تہہ در تہہ..کیا پتہ ہم کتنے جہانوں..کتنے چینی تاج محلوں میں سے گزرے..

اس بے انت وسعت اور صحرا کشادگی کے بعد ہم پلک جھپکتے ہی ایک مختصر گلستانِ سنگ میں داخل ہو گئے..ہر شے قریب آ گئی.. پودے' جھاڑیاں' تالاب' روشیں' پھول'

چٹانوں سے ترتیب شدہ باغ' تالابوں میں تیرتی سرخ مچھلیاں..شہرِ ممنوعہ کی ویران وسعتیں سمٹ کر ایک آغوش میں بدل گئیں..آسمان کم ہو گیا اور اشیاء حاوی ہو گئیں..

یہ ایک باغ تھا..

ایک عجوبہ باغ تھا..

اسے مسام دار چٹانوں کی بناوٹوں سے سجایا گیا تھا..جیسے جاپانی راک گارڈنز ہوتے ہیں..لیکن ان مسام دار پتھروں سے صرف گل بوٹوں کی تزئین ہی نہیں کی گئی تھی بلکہ ان کی مدد سے محرابیں اور خوبصورت پوشیدہ کنج بھی تخلیق کیے گئے تھے..

یہ چینی شہنشاہوں کی خلوت گاہ تھی..

وہ شہرِ ممنوعہ کی وسعت سے تنگ آ کر تنہا ہونا چاہتے تو یہاں آ جاتے..

ہر شخص کبھی نہ کبھی تنہا ہونا چاہتا ہے..

ہر شخص..چاہے وہ کوڑے کے ڈھیروں میں سے رزق تلاش کرنے والا ہو یا لمبے لمبے بانسوں سے صاحب لوگوں کے رکے ہوئے گٹر صاف کرنے والا..وہ کبھی نہ کبھی تنہا ہونا چاہتا ہے..اپنی کسی چُوڑی محبوبہ کے ساتھ..کسی برتن دھونے والی نوکرانی کی چاہت میں..اور یہ بھی درست کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق کسی کوڑے کرکٹ کے ڈرم کے عقب میں تنہائی تلاش کرتا ہے یا گندگی کے کسی ڈھیر کے پیچھے رُوپوش ہوتا ہے لیکن وہ اپنے عشق کے ساتھ تنہا ضرور ہونا چاہتا ہے۔

چنانچہ شہنشاہوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر مین سے خوراک تلاش کرنے والوں اور گٹر صاف کرنے والوں کی اس معاملے میں خصلت ایک ہی ہوتی ہے..بس یہ ہے کہ شہنشاہ اس قسم کے عجوبہ باغوں میں اپنے عشقِ خاص کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں..اور سینکڑوں بار ہوتے ہیں لیکن ہر مرتبہ ایک الگ عشقِ خاص کے ساتھ...

یہ پتھریلا پوشیدہ باغ ایک حیرت کدہ تھا..چین کے ذوقِ جمال کا عروج تھا..

اس باغ کی قربت میں ایک عجوبہ درخت بھی تھا..

درخت دو تھے..ان کے تنے دو تھے..پھر وہ ذرا بلند ہو کر آپس میں یوں مل گئے

تھے۔ ایک دوسرے کو یوں قبول کر لیتے تھے۔ آغوش میں لے لیتے تھے کہ ایک ہو جاتے تھے.. دور سے ایک ہی درخت دکھائی دیتا تھا' لیکن قریب آنے پر احساس ہوتا تھا کہ بدن دو ہیں اور قالب ایک ہے.. اس میں ظاہر ہے رومان کی گہری رمزیت تھی اور اسی لیے عام چینیوں کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی شخص ان دونوں کے تنوں کے درمیان بیٹھ کر کسی بھی محبوب کے وصل کی خواہش کرے تو وہ پوری ہو جاتی ہے..

چینی سیاح صرف اس لیے کہ یہ خواہش سندر ہے' ان درختوں کے درمیان بیٹھ کر تصویریں اتروا رہے تھے... اور اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ دھکم پیل ہو رہی تھی۔ ان جڑواں درختوں کے دیومالائی کرشمے کا اثر ہم سب پر ہوا.. یہاں تک کہ لیڈر پر بھی ہوا اور سب نے یہاں تصویریں اتروائیں.. ہر شخص کے ذہن میں ظاہر ہے کوئی نہ کوئی شکل تھی جس کے وصل کی خواہش میں وہ یہ تصویر اترواتا تھا.. یعنی..

وصل اس کا خدا کرے نصیب
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

چنانچہ شرطِ اوّل تو وصل کے نصیب کی تھی اور پھر اس کے بعد کیا کیا کچھ..

میں وفد کے اراکین کا بغور جائزہ لے رہا تھا کہ اگر اسے وصل نصیب ہو جائے تو یہ کیا کیا کچھ کرے گا اور کرتے ہوئے کیسا لگے گا.. مثلاً سفید ریش' لیڈر یا حسرت ناک..

البتہ میرے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی.. میں دونوں تنوں کے درمیان بیٹھ کر ابھی یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ کس کے ساتھ وصل کی خواہش کی جائے کہ وفد کے متعدد اراکین ایک گروپ فوٹو بنوانے کے چاؤ میں میرے اردگرد تعینات ہو گئے... اور لاکھ منت سماجت کرنے کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوئے.. اب ان کی موجودگی میں مَیں کیسے وصل کی خواہش کر سکتا تھا.. چنانچہ دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے اور ہم تڑپتے رہ گئے وغیرہ وغیرہ۔

شہرِ ممنوعہ کی وسعتوں میں سفر کرتے ہوئے جب آپ اس مختصر عجائبات سنگ باغ کے مختصر سراپے میں داخل ہوتے ہیں تو ایک عجیب سا اطمینان محسوس کرتے ہیں. قرار آ جاتا ہے.. اور پھر اس باغ کے ایک دروازے میں سے نکلتے ہیں تو گویا ماضی کی ایک غار

میں سے نکلتے ہیں اور حال کی تیز روشنی آپ کی آنکھیں چُندھیا دیتی ہے.. کوسٹر اور کوچیں نظر آتی ہیں... بیجنگ کی ٹریفک چنگھاڑنے لگتی ہے.. آپ کے حواس شہرِ ممنوعہ میں سانس لیتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے شہرِ بیجنگ ہوتا ہے اور آپ کچھ کچھ فاترالعقل ہو جاتے ہیں کہ یہ کیا ہے جو میرے سامنے ہے اور وہ کیا تھا جہاں سے ابھی میں آیا ہوں..

اور اس لمحے ایک خستہ حال چینی آپ کا بازو تھام کر نہایت مؤدب ہو کر انگریزی میں التماس کرتا ہے "سر فاربڈن سٹی میں سفر کرتے ہوئے آپ تھک چکے ہوں گے.. آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیے میں صرف پانچ یوآن میں آپ کی مُٹھی چاپی کر کے آپ کو تروتازہ کر دوں گا.. سب تھکن اتار دوں گا۔"

آپ اس کی پیش کردہ فٹ پاتھ پر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں..

وہ آپ کی گردن کے پٹھوں پر انگلیاں جما کر انہیں حرکت میں لاتا ہے.. اور ریڑھ کی ہڈی پر مالش کرتا ہے.. پنڈلیوں کو مٹھی میں لے کر یوں آہستہ آہستہ دباتا ہے کہ نیند آنے لگتی ہے.. اور اس دوران عمر رسیدہ شاعر جو شہرِ ممنوعہ کے سفر سے انکاری ہو گیا تھا اور کوچ میں بیٹھا رہا تھا.. اور اسی کوچ میں بیٹھا بیٹھا فصیل کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہم سے بہت پہلے یہاں پہنچ کر سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا' کوچ سے باہر آیا اور مجھ سے کہنے لگا: "کیوں تارڑ صاحب.. میں نے کچھ مِس تو نہیں کیا؟."

"ناں جی.." میں نے مٹھی چاپی کے زیرِ اثر غنودگی کے عالم میں جواب دیا۔
"کچھ بھی نہیں تھا.. ایک سفر رائیگاں تھا."

''تھیان من سکوئر کے آسمان پر تتلی اور تارڑ''

چینی برادران خوب جانتے ہیں کہ بیجنگ ایسے شہرِ پُرآثار کے طلسم کی موت آئی شراب اگر پوری کی پوری مہمانانِ گرامی کے حلق میں یکدم انڈیل دی گئی تو یہ اس کے نشے کی تاب نہ لا کر غتربود ہو جائیں گے' اس لیے انہوں نے احتیاطاً چند جرعے.. دیوارِ چین.. کوچہ و بازار اور شہرِ ممنوعہ کے پلائے اور بیجنگ مسجد اور سمر پیلس کو آئندہ کے لیے بچا کے رکھ لیا۔ ہمیں شی آن' شنگھائی اور ہانگ چُو کی زیارت کے بعد اسی سنگِ آستاں پر دوبارہ حاضری دینی تھی اور کچھ مزید قیام کرنا تھا۔

لیکن ہم کوچ سے پیشتر صرف ایک نظر تھیان من سکوئر پر ڈالنا چاہتے تھے۔ صرف ایک نظر..

چین کی پہلی پہچان بے شک دیوارِ چین ہے لیکن تھیان من سکوئر کی یاترا کے بغیر اس کی تصویر مکمل نہیں ہوتی..

لیکن ہمارے ساتھ ہوتا یہ آیا تھا کہ ہم بدھ مندر کی جانب جا رہے ہوتے تو وانگ لی اپنی منگول آنکھیں سکیڑ کر کہتی ''یہ سڑک سیدھی تھیان من سکوئر کو جاتی ہے لیکن ابھی ہم بائیں جانب بدھ مندر کو جائیں گے کہ یہی شیڈول ہے۔''

اور اس پر مجھے استاد امام دین گجراتی کا وہ مشہور زمانہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ..

یہ سڑک... سیدھی جلال پور جٹاں کو جاتی ہے..

حاسدین معترض ہوئے کہ استاد یہ شعر تو وزن سے خارج ہے.. پہلے مصرع میں صرف یہ سڑک... اس پر استاد نے معترضین کو ایک دندان شکن جواب دیا تھا کہ میاں جلال پور جٹاں جانے والی سڑک بے حد طویل ہے۔ آپ سڑک کو وہاں تک لے جائیں جہاں پہنچنے پہ وزن برابر ہو جائے..

چنانچہ تھیان من جانے والی سڑک.... ہمیشہ وہ... یہ سڑک رہی۔

کبھی شہرِ ممنوعہ کا سفر درپیش ہوتا تو کسی موڑ پر لیوا اعلان کرتا ''ادھر تھیان من سکوائر ہے لیکن ابھی ہم شیڈول کے مطابق اُدھر نہیں ادھر جائیں گے..''

چلیئے ہم ماؤزے تنگ کی گریٹ لیپ فارورڈ کے سٹائل میں کچھ دیر کے لیے چین کے دورے کے آخری دنوں میں پہنچ جائیں اور تھیان من سکوئر دیکھ لیں۔

یعنی جب کوچ کا دن قریب آیا تو ہم سب نے شیڈول سے بغاوت کر دی... بھوک ہڑتال کی دھمکی دے دی اور تھیان من کے پرچم بلند کر دیئے کہ ہم بیجنگ سے تھیان من سکوئر دیکھے بغیر ہرگز رخصت نہ ہوں گے..... بھلا کسی ماسکو سے ریڈ سکوئر دیکھے بغیر رخصت ہوا جا سکتا ہے۔ پیلس ڈی کنکورڈ کی زیارت نہ ہو تو پیرس جانے کا کیا جواز.. اور کون ہے جو لنڈن میں ہو اور ٹرافلگر سکوئر میں قدم نہ رکھے..

میجر لیو نے ہماری دھمکی آمیز التماس پر غور کیا اور کہا: ''فالومی..''

رات کا سماں تھا جب ہم تھیان من سکوئر کی دنیا میں داخل ہوئے اور کھو گئے... دنیا کے سب سے بڑے سکوئر میں کھو جانا ہی تو اس کے بڑے ہونے کی دلیل ہے..

شہرِ ممنوعہ کے ماتھے پر ماؤزے تنگ کی ایک عام سی تصویر آویزاں تھی اور اسی مقام پر یکم اکتوبر 1949ء کو اس نے لاکھوں چینی عوام کے پھنکارتے ہوئے جاپان اور چیانگ کائی شیک اور سامراجی طاقتوں کو شکست فاش دینے والے پھنکارتے ہوئے اژدھے کو مخاطب ہو کر ایک سادہ سا فقرہ کہا تھا: ''عوامی جمہوریہ چین کی مرکزی حکومت کا قیام عمل میں آ گیا ہے...''

مافنگ.. ان لاکھوں چینیوں میں سے ایک تھا جس نے اس تقریب کو اپنی

آنکھوں سے دیکھا..

''سٹیج پر جہازی سائز کی سرخ چینی لالٹینیں لٹک رہی تھیں اور ان کے درمیان میں سنہری رنگ کا قومی نشان آویزاں تھا.. یکدم چوک میں صبح جم غفیر نے بے پناہ تالیاں بجانی شروع کر دیں.. معلوم ہوا کہ ماؤزے تنگ آ رہے ہیں.. وہ سٹیج پر نمودار ہوئے تو تالیوں اور نعروں کا شور بپا ہو گیا.لن باؤ جو مرکزی حکومت کے سیکرٹری جنرل تھے انہوں نے تقریب کا آغاز کیا..اور پھر ہمیں ماؤ کی بلند اور واضح آواز سنائی دینے لگی..قومی پرچم فضا میں بلند ہوا..قومی ترانہ بجایا گیا اور جب میں نے ماؤ کی آواز سنی تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے کبھی گمان بھی نہ تھا کہ کمیونسٹ اتنی جلدی فتح سے ہمکنار ہو جائیں گے اور میں اس تاریخی لمحے کا شاہد ہوں گا..ہم نے جاپانیوں کو شکست دے دی تھی اور چیانگ کائی شیک کو فنا کر دیا تھا۔اس لمحے صرف ایک خیال ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم نے تباہ شدہ شہروں اور آبادیوں کو از سرِ نو تعمیر کرنا ہے...ہمیں جنگ لڑتے ہوئے دس برس سے زیادہ ہو گئے تھے..اور مجھے وہ پرانے کڑوے دن یاد تھے جب ہم بھوکے اور بے آسرا تھے...میں گھر واپس گیا تو گلیاں اور بازار لوگوں سے بھرے ہوئے تھے..وہ ڈھول اور گھڑیال بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کر رہے تھے..آتش بازی چھوڑ رہے تھے اور لالٹینیں روشن کر رہے تھے..''

''یہ تم وعدہ خلافی کر رہے ہو..'' ایک عجیب سی مہین سی آواز میرے کانوں کے قریب پھڑ پھڑائی..

''کون ہے بھئی..'' میں نے بھنّا کر کہا۔ ''میں جدید چین کی بنیاد کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا ہوں اور تم میرے کانوں کے قریب پھڑ پھڑا کر میری مرکوز توجہ کو منتشر کر رہے ہو..کون ہو بھئی..''

''میں تتلی ہوں..''

''ہائیں..تم یہاں بھی چلی آئیں؟''

''میں نہیں..تم چلے آئے..میں کتنی بار تمہیں یاد دلاؤں کہ ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ میں تم ہو..یا تم میں ہوں...''

''اگر میں تم ہوں تو پابندِ گل کیوں ہوں....زمین سے قدم چھڑا کر پرواز کیوں نہیں کرتا؟''

''اگر تم چاہو تو...''

''میں اگر کیا چاہوں تو..''

''تم اگر چاہو تو ایسا کر سکتے ہو..لیکن اس سے پیشتر تمہیں میرے سوالوں کا جواب دینا ہو گا کہ تم نے وعدہ خلافی کیوں کی؟'' تتلی بے حد ناراض لگتی تھی.. پر پھڑ پھڑاتی ہوئی مجھ سے روٹھی ہوئی لگتی تھی۔ ''تم نے کہا تھا کہ تم چین کی تاریخ کی تفصیل میں نہیں الجھو گے کیونکہ یہ سب کچھ تو کتابوں اور گائیڈ بکس میں درج ہے.. ہر سیّاح.. ہر سفرنامہ نگار یہی حوالے دیتا ہے تو تم نے ایسا کیوں کیا.تم تو چین کی روح کے متلاشی تھے..اسے چھونے کی کوشش میں تھے..''

''سوری...''

''صرف..سوری...''

میں اس لمحے اتنا شرمندہ تھا کہ تتلی کے پاؤں چھو کر معافی کا طلبگار ہو سکتا تھا لیکن پرابلم یہ تھی کہ میں نہیں جانتا تھا کہ ایک تتلی کے پاؤں کہاں ہوتے ہیں اس لیے میں نے اس کے پَروں کو ہلکا سا چھوا اور ایک اور سوری کہہ کر اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔ ''میں تاریخ کے بہاؤ میں بہہ گیا تھا..آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔''

''پرامس؟'' تتلی بولی..

''بالکل پرامس..'' میں نے ایک ننھے بوائے سکاؤٹ کی مانند ہاتھ اٹھا کر ہتھیلی کھول دی۔ ''لیکن مجھ میں ایک خواہش ہے کہ میں تھیان من سکوئر کو ایسے دیکھوں جیسے آج تک کسی اور نے نہ دیکھا ہو..تم نے کہا تھا کہ اگر تم چاہو..تو میں چاہتا ہوں کہ اس کے اوپر پرواز کروں..فضا سے ہواؤں میں بلند ہو کر اوپر سے اس کا نظارہ کروں..''

''میں وعدہ نہیں کر سکتی۔'' تتلی رنجیدہ ہو گئی۔ ''مجھ میں بھی جبلی طور پر پرواز کی خواہش ہے..لیکن یہ دنیا کا سب سے بڑا چوک ہے اور کیا پتہ میں اس پر پرواز کرتی ہوئی دم

توڑ جاؤں کیونکہ ایک تتلی کی حیات چند روزہ ہوتی ہے..اس کی توانائی تمہاری پلکوں کے جھپکنے کی قوت سے بھی کم ہوتی ہے..لیکن میں کوشش کروں گی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی..یا تم مجھے ساتھ لے جاؤ گے کہ ابھی تک فیصلہ نہیں ہوسکا..''

رات کا سماں تھا جب ہم تھیان من سکوائر میں داخل ہوئے..

میکڈونلڈ کی نیون لائٹس اگرچہ ماؤ کے مقبرے تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتی تھیں لیکن ایک طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ یہ پیغام بھی دیتی تھیں کہ اے عظیم رہنما تم نے ہمیں ''پیپر ٹائیگر'' کہا تھا..ہم تمہیں اپنی خدائی طاقت کے بل بوتے پر زیر تو نہ کرسکے لیکن آج ہم کاٹھ کباڑ کے سہارے یعنی جنک فوڈ کے زور پر تمہارے پہلو میں آ بسے ہیں..اور تم کچھ نہیں کرسکتے..ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے..کہ تم اس عظیم مسولیم میں ایک شیشے کے صندوق میں مردہ پڑے ہو اور ہمارے ریستوران کے اندر تمہاری وہ مخلوق جو کبھی سرخ کتاب لہرایا کرتی تھی..اس کی حافظ اور شیدائی تھی اور چینی زبان میں ''مرگ بہ امریکہ'' کے نعرے لگایا کرتی تھی..اب وہی مخلوق ہمارے رنگ میں رنگی گئی ہے..اور تمہاری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور تمہیں..فراموش کرچکی ہے..

یہ ایک حیرت انگیز جیت تھی..جہاں انکل ٹام کی مہلک ہتھیاری برتری شکست کھا گئی تھی...کوریا..ویت نام' کمبوڈیا میں ذلت آمیز پسپائی اس کا مقدر ٹھہری تھی وہاں جنک فوڈ نے..ایک ہیمبرگر' ایک سینڈوچ' فرائیڈ چکن اور برف سے بھری پیپسی کے ایک پیپر گلاس نے اس پیپر ٹائیگر کو برتری دلوا دی تھی اور اس کے بھڑکتے نیون سائن ماؤ کے مقبرے کے سنگ مرمر پر پھسلتے روشن ہوتے تھے..اسے چھیڑتے تھے اور ماؤ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا..

پیپر ٹائیگر بیجنگ میں راج کرتا تھا..

خاور' لیو اور وانگ لی وفد کے اراکین کو دنیا کے سب سے بڑے سکوئر کے کناروں پر بلند ہوتی عجوبہ اور متاثر کن عمارتوں کی تفصیل بتا رہے تھے کہ وہ کیسے چند مہینوں میں تعمیر کر دی گئی تھیں..گریٹ ہال آف پیس..عوامی جدوجہد کا عجائب گھر..لیکن مجھے ان سے کوئی غرض نہ تھی کہ میں نے تتلی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ میں تاریخ کے حساب کتاب کی

تفصیل میں نہیں جاؤں گا..صرف چائینیز سپرٹ کو چھونے کی سعی کروں گا..ان لوگوں کی روحوں میں اترنے کی کوشش کروں گا جو اس عظیم اور کھلے میدان میں تفریح کے لیے جمع تھے..پکنک منا رہے تھے' پتنگیں اور کنکوے اڑا رہے تھے..نہ کسی کو ماؤ کے مقبرے کی پرواہ تھی نہ کوئی شہرِ ممنوعہ کی جانب دیکھتا تھا۔ وہ صرف اپنی پتنگوں اور کنکووں کو دیکھتے تھے جو میدان کی روشنیوں میں سے بلند ہوکر بیجنگ کے نیم تاریک آسمان میں حرکت کر رہے تھے..

ایک لاہوریئے کے لیے اس سے زیادہ مسحور کن نظارہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ ہر جانب پتنگ بازی ہورہی ہے..

البتہ یہ پتنگیں لاہوری سٹائل میں جنسی انداز میں مٹکتی کندھے مارتی بلند نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی یہاں پیچ لڑائے جا رہے تھے اور نہ ''بوکاٹا'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے..

بلکہ نہایت شانتی سے..اطمینان سے ہر فرد اپنی اپنی گڈی اڑاتا تھا..

تھیان من سکوئر پر پھیلا نیم تاریک بھید بھرا آسمان ایک ایسا چڑیا گھر تھا جس میں اژدھے' تتلیاں' عفریت اور لمبی دموں والے جانور حرکت کر رہے تھے..

سکوئر میں ان کی فروخت کی جا رہی تھی..ہر قدم پر کوئی پتنگ فروش سامنے آ جاتا اور پلاسٹک کی بنی ہوئی مختلف شکلوں کی پتنگیں اور گڈیاں مع ڈوری فروخت کرنے کی پیشکش کرتا..اور میرے اندر کا پتنگ باز بے چین ہونے لگتا..

لیڈر..بیجنگ کی اس شب میں..تھیان من سکوئر میں نہایت متانت سے اپنے گرے سوٹ اور میچنگ ٹائی میں سفید بالوں کو سنوارتا عینک درست کرتا اپنے لرزش شدہ سر کو مزید ہلاتا مسکراتا چلا جا رہا تھا اور وفد کے ہر رکن کو باری باری بتا رہا تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو لاکھوں لوگ ماؤ کی ریڈ بک لہراتے چینی مخصوص انداز میں نعرے لگاتے تھے اور اب یہاں میکڈونلڈ ہے..کینٹکی فرائیڈ چکن ہے اور پتنگیں ہیں..ماؤ کی ریڈ بک ایک زمانے میں نہ صرف چین میں بلکہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں مقدس صحیفوں سے بھی بڑھ کر پاپولر تھی..میں نے بھی ان زمانوں کے جوش اور ایک نئی دنیا کے خواب میں اسے

تقریباً ازبر کر رکھا تھا اور جابے جا اس کے حوالے دیا کرتا تھا.. اب یہ سرخ کتاب چین میں کہیں دکھائی نہیں دیتی.. بیجنگ میں کتابوں کے ایک بہت بڑے سٹور میں اس کا ایک نسخہ بھی نہیں تھا.. چونکہ میں اپنے سفرنامے میں اس کے کچھ حصے نقل کرنا چاہتا تھا اس لیے میں خاور اور لیو سے مدد کا خواستگار ہوا کہ ماؤ کے واسطے اس کی سرخ کتاب کی صرف ایک جلد کہیں سے پیدا کر دو اور وہ اسے پیدا نہ کر سکے تھے کہ یہ مردہ ہو چکی تھی۔

تو یہ تھیان من سکوئر کی رات تھی.. اس کی وسعت ایک صحرا کی وسعت تھی جس کا کوئی انت نہ تھا اور اس میں چینی عوام پکنک مناتے تھے۔ بچوں کے ساتھ اگرچہ وہ تعداد میں بہت ہی قلیل تھے' ان کے ساتھ چہلیں کرتے تھے۔ بے فکرے اور آزاد تھے' اژدھوں اور تتلیوں کی شکل کی پتنگیں اڑاتے تھے جو نیم تاریک آسمان میں سے کبھی ظاہر ہوتی تھیں اور کبھی روپوش ہو جاتی تھیں..

''لیڈر صاحب...'' میں نے لیڈر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی ابتدا کرنے کی نہایت مؤدب ہو کر اسے مخاطب کیا ''اگر آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے ان چینی بھائیوں کی مانند ذرا ریلیکس کریں.. اس سکوئر میں سے کوئک مارچ کا ارادہ قدرے موقوف کر دیں.. رک جائیں تو میں آپ کی اجازت سے ایک اژدھا شکل کی پتنگ خرید کر ذرا تھیان من سکوئر میں تھوڑی سی پتنگ بازی نہ کر لوں...''

''کیوں؟'' لیڈر نے خشمگیں عینک سے مجھے گھورا..

''بس سر ماحول ہی ایسا ہے.. ان چینیوں کے ساتھ کچھ پیچے ہو جائیں.. میں ہاتھ مار کر ان کی متعدد پتنگیں کاٹ دوں تو یہ پاکستانیوں کی پتنگ بازی کے قائل ہو جائیں.. دھاک بیٹھ جائے ان پر..''

''نہیں..'' لیڈر ماؤ سے بھی زیادہ سخت گیر ہو گیا۔ ''سکوئر کے آخر میں شہر ممنوعہ کے قریب ہماری کوچ ہمارا انتظار کر رہی ہے.. ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے..''

''صرف پانچ منٹ عنائت کر دیجیے.. میں نے تو سنو لیک کے قریب دنیا کے طویل ترین برفانی راستے کے گلیشیرز کے اوپر بھی گڈی اڑائی تھی.. یہاں بھی دل کا یہ ارمان

پورا کر لینے دیجیے..''

''آپ واقعی سنجیدہ ہیں..'' لیڈر کے باریک لبوں پر ایک نہایت تیکھے طنز کی مسکراہٹ تھی۔ ''میں سمجھا آپ مذاق کر رہے ہیں.. اپنا نہیں تو کچھ ہمارا ہی خیال کیجیے۔ ہم معزز لوگ ہیں. بُوٹ پہنے ہوئے ہیں.. چلئے ہمارا نہیں کچھ قومی وقار کا ہی خیال کیجیے..''

''قومی وقار پتنگ اڑانے سے مجروح ہو جائے گا؟''

''نہ صرف مجروح ہو گا بلکہ اس کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔''

قومی وقار کی عصمت بچانے کی خاطر میں نے اپنے آپ پر جبر کر کے ہتھیار ڈال دیئے اور اس خواہش سے دستبردار ہو گیا..

تتلی میرے چہرے پر پھڑ پھڑاتی اور اس پر مایوسی کی جھرّیوں کو دیکھ کر میری ڈھارس بندھانے لگی ''دیکھو.. مجھ میں تمہاری روح ہے.. اس لیے تم مجھے دیکھو..''

اور میں اسے دیکھنے لگا..

میرے دیکھتے دیکھتے تتلی اڑی.. تھیان من سکوئر میں بلند ہوئی اور پتنگوں اور جہازی سائز کی تتلی نما گڈیوں کے ساتھ کندھے ملا کر نیم تاریک آسمان میں اڑنے لگی..

اگرچہ اس کی کوئی ڈور نہ تھی..

لیکن میں اور وہ ایک ہی ڈور میں بندھے تھے..

وہ شاہ عنایت کی طرح یہ ڈور لُک چھپ لُک چھپ کھینچنے لگی.. مجھے اپنے پاس بلانے لگی۔

''نیچے کیا کر رہے ہو.. اوپر آ جاؤ..''

''میں زمیں زاد ہوں.. اوپر.. آسمان پر کیسے آ سکتا ہوں..''

''اس لیے کہ ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا کہ ہم میں سے تتلی کون ہے اور تارڑ کون.. تم یقین کی ڈوری تھام کر سیدھے اوپر آ جاؤ.. میں منتظر ہوں..''

تو میں اس لمحے تتلی ہو گیا.. اپنے خوش رنگ پر پھیلائے پھڑ پھڑائے اور پرواز کرنے لگا.. اوپر اٹھنے لگا.. چوک کا شور نیچے رہ گیا اور نیم تاریک آسمان کی خاموشی قریب آ گئی.. میرے

آس پاس اژدھے اور تتلیاں اور لمبی دموں والے جانور تھے جنہوں نے کندھے ہلا ہلا کر مجھے خوش آمدید کہا اور اپنے کھیل میں شامل کرلیا۔ تتلی نے مجھے ایک تھپکی دی۔

''ویل ڈن.. کیپ فلائنگ۔''

اور میں اڑتا رہا..

میں بن پتنگ اڑ جاؤں رے..

ہوا کے سنگ لہراؤں.. میں بن پتنگ..

میرے بہت نیچے تھیان من سکوئر روشن تھا۔ اس میں جو ہزاروں پُرمسرت لوگ تھے وہ یہاں سے پُتلیاں لگتے تھے.. ایک روشن سٹیج پر حرکت کرتے ہوئے اداکار لگتے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ڈوریاں تھیں جو پتنگوں اور گڈیوں کی پرواز متعین کرتی تھیں.. یہ پتنگیں میرے دائیں بائیں شرلاٹے بھرتی اڑتی اور ڈولتی تھیں.. یہاں سے شہرِ ممنوعہ تاریکی میں ڈوبی ہوئی ایک ایسی بستی تھا جس میں ایک چراغ بھی روشن نہ تھا.. البتہ اس کے سرخ تاج محل ہیولوں کی صورت.. گئے زمانوں کی کہانیاں کہتے ایسے داستان گو تھے جن کی کہانی صرف میں سن رہا تھا... بیجنگ شہر کی روشنیوں میں پیس ہوٹل کی عمارت بھی نمایاں نظر آ رہی تھی۔

چوک کے ایک جانب ماؤ کے مقبرے کی چھت ویران تھی..

پاکستانی وفد کے اراکین لیڈر کی سرکردگی میں شہرِ ممنوعہ کے سائے میں منتظر کوچ کی جانب چلتے جا رہے تھے اور ان میں سے کسی کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ میں ان سے بچھڑ کر مائل پرواز ہو چکا ہوں اور وہ میرے نیچے ایک فضائی منظر کا حصہ ہیں..

''تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' تتلی ہلکورے لیتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

''تم ایک تتلی سے پوچھتی ہو کہ وہ اڑان میں کیسا محسوس کر رہی ہے.. تم بتاؤ کہ ایک زمین زاد تارڑ ہونے کی حیثیت سے پہلی بار پرواز کرتے ہوئے تم کیسا محسوس کر رہے ہو..''

''چین میں آ کر تم بھی سیانے ہو گئے ہو.. ہاں یہ ابھی طے نہیں ہو سکا کہ ہم میں سے تارڑ کون ہے اور تتلی کون. لیکن وطن واپسی پر جب تم تھیان من سکوئر پر اپنی اڑان کو بیان کرو گے تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا..''

''ہاں.. ایسا پہلے بھی ہوا ہے کہ میں نے اپنے سفر کی داستان بیان کی تو لوگوں نے اسے محض میرے تخیل کی کارستانی سمجھا.. مجھ پر یقین نہیں کیا.. کیونکہ ان کی دانش اور ادب کی پتنگیں بندھی ہوئی ہیں.. جکڑی ہوئی ہیں.. وہ کیسے ایک ایسی پتنگ پر یقین کر لیں گے جو تھیان من سکوئر پر پرواز کر چکی ہے..''

''وہ یہ بھی تو نہیں جانتے کہ تم تتلی ہو چکے ہو..''

''سنو تتلی.. میں ہمیشہ سے تتلی تھا. تمہاری آمد سے بہت پہلے سے.. لیکن میں نے اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا.. شاید تم بھی یقین نہ کرو لیکن میں نے افغانستان کے صحراؤں اور ایران کے دشت مرگ اور جھیل جنیوا اور سویڈن کے جنگلوں اور لبنان کے دیوداروں اور نانگا پربت' کے ٹو' جھیل کرومبر اور فیئری میڈو کو بھی ان سے بلند ہو کر آسمان پر اڑتے... انہیں اپنے قدموں میں بچھے دیکھا ہے. تم یقین کرو یا نہ کرو لیکن یہ پہلی بار نہیں کہ میں تتلی ہوا ہوں...''

''بہرحال تم اب فوراً تتلی سے تارڑ ہو جاؤ کیونکہ تمہارے ساتھی شہرِ ممنوعہ کی اس دیوار کے قریب پہنچ رہے ہیں جہاں ایک کوچ انہیں ہوٹل واپس لے جانے کے لیے منتظر ہے..''

''کوچ آ گئی ہے؟''

''نہیں.. لیکن وہ ابھی نہیں جانتے کہ کوچ وہاں موجود نہیں ہے اور انہیں ابھی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا ہوگا.. تم نیچے چلے جاؤ ورنہ تمہیں اپنی غیر موجودگی کا سبب بتانا پڑے گا اور وہ یقین نہیں کریں گے اور تمہیں فاترالعقل سمجھیں گے..''

''وہ تو اب بھی سمجھتے ہیں..''

''بحث نہ کرو.. جب تک تم ایک تتلی ہو تم اپنی پرواز کو موقوف کر کے ہوا کے دوش پر بہت نیچے اتر سکتے ہو.. اور اگر یکدم تارڑ ہو گئے تو دھڑام سے تھیان مین سکوئر میں جا گرو گے اور ماؤ کے مقبرے کے برابر میں ایک گمنام پاکستانی کا مقبرہ بن جائے گا..''

میں نے پر سمیٹے اور کاغذ کے ایک جہاز کی مانند بل کھاتا نیچے اترتا گیا..

میرے ہم وطنوں اور ہم جنسوں کو میری غیر موجودگی کا احساس تک نہ ہوا تھا.. شاید

میں صرف ایک لمحے کے لیے ان سے جدا ہوا تھا..ایک پل کے لیے رخصت ہوا تھا..اور آنکھ جھپکنے سے پیشتر واپس آ گیا تھا..

ہم چلتے چلتے بے حال ہو چکے تھے..

میں زیادہ بے حال تھا کیونکہ مجھ میں اڑان کی تھکن بھی شامل تھی..

میرے ساتھی چینیوں کو نامناسب القابات سے نواز رہے تھے کہ اگر ایک چوک ہی تعمیر کرنا تھا تو ایک ریگل یا لکشمی چوک..تین تلوار چوک یا گھنٹہ گھر چوک کیوں نہ بنایا... ایک بے حساب وسعت کا ایک صحرا شہر کیوں بنا دیا..

بالآخر چوک کا اختتام ہوا اور شہرِ ممنوعہ کے دروازوں کے اوپر ہمیں چیئرمین ماؤ کی ایک تصویر نظر آئی جو چیئرمین کی پہلی تصویر تھی جو پورے بیجنگ میں ہمیں نظر آئی..

تتلی نے درست کہا تھا..وہ غیب کے علم کی ماہر تھی...وہاں کوئی کوچ ہماری منتظر نہ تھی..ہم پیاسے اور تھکاوٹ سے ریزہ ریزہ شہرِ ممنوعہ کے بند دروازوں کے سائے میں فٹ پاتھ کی گھنی باڑھ کے برابر میں بیٹھ کر اپنے اکھڑتے ہوئے سانس درست کرنے لگے.. اور کوچ کا انتظار کرنے لگے..

ہم جس تھیان من سکوئر کی دید کے لیے باؤلے ہوئے جاتے تھے وہ اب ہمیں زہر لگنے لگا اور ہم جلد از جلد اپنے کمروں میں پہنچ کر اپنے تھکن آلود بدنوں کو بستروں میں ڈھیر کرنا چاہتے تھے..

ہم فٹ پاتھ پر بیٹھے باڑھ کے سائے میں بے چینی سے کوچ کا انتظار کر رہے تھے اور ہمارے عین اوپر جو ایک لیمپ پوسٹ تھا اس کے تیز بلب کی گرمی سے بھسم ہوتے پتنگے ہم پر مردہ ہو کر گرتے تھے..

''بوڑھا کنفیوشس اور گیت گانے والا جھینگر''

تب میں نے اپنی زندگی کا پہلا ''بینڈا کیچر'' دیکھا..

جھکا ہوا..جھاڑیوں کے ساتھ کان لگائے..از حد چوکنا اور وار کرنے کے لیے تیار پہلا ''بینڈا کیچر'' دیکھا..

جھاڑیوں اور باڑھ کے اندر پوشیدہ جو بینڈے..یا بیٹلز..یا جھینگر بے پناہ غل مچا رہے تھے انہیں ایک خاص تکنیک سے جھاڑیوں میں سے برآمد کر کے..انہیں قابو کر کے...جیم کی خالی بوتل میں بند کرتے دیکھا..

میں نے اگرچہ ہانگ چو کے ایک مقدس تالاب میں کنڈیاں ڈالے ایک چینی جوڑے کو نہایت خوش رنگ اور زیبائشی مینڈک...اس رات کے ڈنر کے لیے..شکار کرتے بھی دیکھا تھا..

وفد کے اراکین جن کے پاس انتظار کی کوفت کے سوا اور کچھ نہ تھا' نہایت دلچسپی سے ان..''بینڈا کیچرز'' کو دیکھنے لگے..

سفید ریش نے ایک کھچری سے مسکراہٹ اپنی مردہ مونچھوں کے تلے سے برآمد کر کے کہا: ''لو جی تارڑ صاحب..یہ جو چینی بھائی اتنے تردد سے بینڈے کیچ کر کے بوتلوں میں بند کر رہے ہیں تو یقیناً گھر جا کر انہیں نہایت اہتمام سے فرائی کریں گے اور ان کا ''بینڈا پلاؤ'' پکائیں گے..''

اس پر مجھے شفیق الرحمٰن کی وارننگ یاد آ گئی..

چین روانگی سے پیشتر میں نے 26- ویسٹ رِج کے اُس کمرے میں جہاں شفیق صاحب ایک مدت سے تنہا اور الگ تھلگ تھے' حاضر ہو کر کہا ''مرشد.. میں نے آپ کو پہلا فین لیٹر آج سے چالیس برس پیشتر انگلستان سے تحریر کیا تھا اور آپ کی زنانہ ہینڈ رائٹنگ اور نیلے لفافے میں اس کا جواب آیا تھا اور پھر آپ نے میرے پہلے سفرنامے کے عنوان ''نکلے تری تلاش میں'' کو بھی پسند فرمایا تھا تو اب یہ ہے کہ یہ خاکسار عازم ملکِ چین ہے.. کوئی نصیحت عطا ہو.. کچھ راہنمائی فرمائیے..''

''بس لومڑ پلاؤ سے پرہیز کیجیے گا..'' شفیق صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے مجھے تھپکی دے کر کہا اور مسکراہٹ میں ان کے لب دانتوں سے ہٹتے گئے۔

''ہیں...؟ لومڑ پلاؤ بھی ہوتا ہے؟''

''ہاں ہوتا ہے..'' شفیق الرحمٰن اپنی اس تصویر کے نیچے بیٹھے تھے جس میں وہ اپنے پہلے بچے کو گود میں اٹھائے اپنی بیگم کی خوبصورتی کے ہمراہ کھڑے ہیں اور اس لمحے نہیں جانتے تھے کہ یہی بچہ جب بڑا ہوگا.. بھوری مونچھوں والا ڈیشنگ ینگ مین ہوگا تو ریل کی پٹڑی پر سر رکھ کر خودکشی کر لے گا..'' دوسری جنگ عظیم کے دوران جب میں برما میں تھا تو مجھے اپنے ایک پائلٹ دوست کے ہمراہ بارڈر کے پار چینی علاقے میں ایک حسّاس مشن کے لیے روانہ کیا گیا۔ جب ہم دونوں جہاز میں سوار ہو کر دوسری جانب پہنچے تو چینی فوجیوں نے ہمارے اعزاز میں ایک نہایت پُرتکلف ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا.. دوسری ڈشوں کے علاوہ میز پر بے حد خوش ذائقہ دکھائی دیتی چاول اور گوشت کی ایک ڈش تھی.. میں نے احتیاطاً دریافت کیا کہ اس پلاؤ میں گوشت کس جانور کا ہے.. بکرے کا ہے یا گائے کا.. کیونکہ میں بڑا گوشت کم کھاتا ہوں.. اس پر چینیوں نے بڑے فخر سے کہا کہ آپ فکر ہی نہ کریں۔ ہم نے آپ کے لیے خصوصی طور پر ایک لومڑ ذبح کیا تھا اور یہ... لومڑ پلاؤ ہے۔''

''کیا لومڑ پلاؤ مزیدار تھا شفیق صاحب؟''

''یہ نہیں پوچھا کرتے.. بس آپ چین میں احتیاط کیجیے گا کھانے کے معاملے میں۔''

چنانچہ اگر لومڑ پلاؤ ممکن تھا تو بینڈا پلاؤ بھی خارج از امکان نہ تھا..

ان متعدد بینڈا کیچرز میں سے... جو شہرِ ممنوعہ کے سائے میں فٹ پاتھ کے کنارے لگی باڑھ میں سے جھینگر شکار کر رہے تھے' ایک کنفیوشس شکل کا چینی بوڑھا بھی تھا.. اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور شاید اس کی گردن کی رگیں اکڑ چکی تھیں کیونکہ وہ بہت آہستگی سے چہرے کو دائیں یا بائیں موڑتا تھا.. ایک بدرنگ قمیض' ڈھیلا پاجامہ اور پاؤں میں چپل.. وہ ہر بینڈے کو جو اس کے ہاتھ لگتا تھا' پکڑ کر اپنی بوتل میں نہیں ڈالتا تھا بلکہ ابھی تک اس کی جیم کی بوتل کسی بھی بینڈے کے بغیر تھی.. وہ نہایت تردّد سے جھاڑیوں کو ٹٹولتا.. اور جب کوئی بینڈا پکڑتا تو اسے مٹھی میں بند کر کے کان کے قریب لے جاتا. تھوڑی دیر تک اسے وہیں رکھتا اور پھر سر ہلا کر اسے چھوڑ دیتا.. وہ باڑھ کو الٹ پلٹ کر کے ان میں پوشیدہ ٹرّاتے ہوئے جھینگروں کو اچھلنے پر مجبور کر دیتا اور پھر انہیں دبوچ لیتا.. کان کے قریب لے جا کر کچھ غور کرتا اور پھر آزاد کر دیتا.. بالآخر ایک بینڈے کو اس نے بہت دیر تک کان سے لگائے رکھا.. یہ بینڈا اسے پسند آ گیا.. اسے جیم کی بوتل میں ڈال کر ڈھکن لگایا اور جھکا ہوا اپنے آپ میں اپنے بڑھاپے میں مگن چپل گھسیٹتا تھیان من سکوئر میں سے نکلنے والی ایک تاریک گلی میں غائب ہو گیا..

تتلی نے پھڑ پھڑا کر میرے کان کی لو کو ہلکے سے چھوا..'' میں ابھی آتی ہوں۔''

''تم کہاں جا رہی ہو؟'' اگرچہ میں نے سرگوشی میں کہا لیکن گیسو دراز کے اندر وجود زن کا جو جذبہ موجزن تھا وہ بیدار ہو گیا۔'' قبلہ یہ کون ہے اور وہ کہاں جا رہی ہے؟''

''صاحب میں خودکلامی کا مریض ہوں... یونہی بڑبڑا رہا تھا..'' وفد کے کسی رکن کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ میرے ہمراہ ایک تتلی بھی سفر کرتی ہے..

تتلی اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور اب میری آنکھوں کے سامنے ایک نازک اندام بیلے رینا کی مانند رقص کر رہی تھی'' میں اس بوڑھے کا پیچھا کرنا چاہتی ہوں۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ اس جھینگر کے ساتھ جو اس نے بڑے تردد سے تلاش کیا ہے' کیا سلوک کرتا ہے..''

''وہ اس کا جھینگر پلاؤ بنائے گا اور کیا کرے گا۔''

''ایک جھینگر کے ساتھ جھینگر پلاؤ تو نہیں بنایا جا سکتا بے وقوف..''

''یہ بھی درست ہے..تو پھر وہ اس ایک جھینگر کا کیا کرے گا؟''

''یہی جاننے کے لیے تو میں اس کا تعاقب کرنا چاہتی ہوں..میں جانتی ہوں کہ تمہارے وفد کو پک کرنے کے لیے جس کوچ نے آنا ہے وہ ابھی بہت دیر میں آئے گی' اس لیے اگر تم میرے ہمراہ آنا چاہتے ہو تو بے شک آ جاؤ۔''

آئیڈیا برا نہ تھا..

میں تتلی کے ہمراہ اس بوڑھے کنفیوشس کے تعاقب میں چلا گیا..

کنفیوشس ایک مدت تک چلتا رہا..

میں بھی ایک مدت تک تتلی کا پیچھا کرتے کرتے کنفیوشس کو نظر میں رکھے چلتا گیا...

بالآخر وہ جیم کی اس بوتل کو سینے سے لگائے جس میں اس کا پسندیدہ جھینگر قید تھا' شہر بیجنگ کی ان گلیوں میں داخل ہوا جو امریکی بیجنگ کی ہائی رائز عمارتوں' نیون سائنز اور روشن شاہراہوں کے اندر کہیں پوشیدہ ابھی تک سانس لیتا تھا..ٹین کی چھتوں کے جھونپڑے..بوسیدہ دیواریں..ٹوٹے ہوئے سائیکل اور ریڑھیاں..تیل کی بو..اور نیم تاریکی..

وہ اپنے جھونپڑے میں چلا گیا..بدتمیز تتلی اجازت لیے بغیر اس کے پیچھے چلی گئی..

اور چونکہ میں تتلی کا بغل بچہ تھا' اس لیے میں بھی بے دھڑک جھونپڑے کے صحن میں داخل ہو گیا..وہاں پیس ہوٹل کی بلندی سے نیچے دکھائی دینے والے صحن کی مانند رسیوں پر بوڑھے کی ایک نیکر اور دو پاجامے سوکھ رہے تھے..کونے میں نوڈلنز کا ایک دیگچہ انگیٹھی پر رکھا تھا' جس میں آگ بجھ چکی تھی' صرف راکھ تھی..

ایک لرزتی ٹانگوں والی تپائی پر جیم کی بوتل رکھی تھی اور جھینگر اس کی گولائی سے چمٹنا چاہتا تھا اور گر جاتا تھا..یہ جھینگر ہی ہوگا کیونکہ اس سے پیشتر میں نے صرف اس کی آواز سنی تھی' دیکھا نہ تھا..ہمارا بوڑھا اسے نہایت الفت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا..

''اے بزرگ..آپ اس جھینگر کا کیا کریں گے..'' تتلی اس سے مخاطب ہوئی۔

اور یہ حیرت انگیز بات تھی کہ تتلی کی آواز سن کر بوڑھے نے اچنبھے کا اظہار نہیں کیا..چونک کر اِدھر اُدھر نہیں دیکھا کہ اس کے جھونپڑے میں یہ کون ہے جو سوال کرتا ہے' اسی حالت میں سر جھکائے بیٹھا رہا اور ڈھکن کو تھپکتا رہا۔''میرا پہلا جھینگر مر گیا تھا..'' اس نے کہا۔''اس کے گیت بھی مر گئے..میں یہ تنہائی اور خاموشی کتنے دن برداشت کرتا..مجھے ایک اور جھینگر چاہیے تھا..جو میرے دیرینہ رفیق اور تنہائی کے واحد ساتھی کی مانند..مجھ سے باتیں کرے..مجھے گیت سنائے..''

''اسی لیے ہر جھینگر آپ کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا؟''

''ہاں تتلی..میں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی ایسا جھینگر ملے جو مجھے اُسی انداز میں اُسی لَے میں ٹرّاتے ہوئے گیت سنائے جس ردھم میں میرا پرانا جھینگر ٹرّاتا تھا..اسی لیے تو میں ہر جھینگر کو اپنے کان کے ساتھ لگاتا تھا..اس کی آواز سنتا تھا..ہر جھینگر کی لَے مختلف ہوتی ہے..اور مجھے ایک ایسا جھینگر درکار تھا جو میرے پرانے دوست کا متبادل ثابت ہو..''

''تو وہ مل گیا..''

''ہاں..میں خوش قسمت ہوں..شہرِ ممنوعہ کی دیوار کے سائے میں ایک جھاڑی میں ٹرّانے والا یہ جھینگر...میرے مر جانے والے جھینگر کا دوسرا جنم ہے..تم اس کے گیت سننا پسند کرو گی؟''

''ہاں..''

بوڑھے نے بوتل الٹ کر جھینگر کو اپنی مٹھی میں لیا اور تتلی نہایت اشتیاق سے اس کی مٹھی پر جا بیٹھی' ''بہت مدھر گیت ہے..لیکن یہ ہے کیا؟''

''یہ تو وہی کچھ ہے جو تم سننا چاہتی ہو..یہ تمہارے ساتھ باتیں بھی کر سکتا ہے..تمہیں قدیم چینی گیت اور شاعری بھی سنا سکتا ہے..جو کچھ تمہارے ذہن میں ہو یہ اس کی ترجمانی کرتا سنائی دیتا ہے..تم بھی سنو گے؟'' بوڑھا یکدم مجھ سے مخاطب ہو گیا اور میں اس غلط فہمی میں تھا کہ وہ میری موجودگی سے مکمل طور پر بے خبر ہے...

''میں چینی نہیں ہوں..''

''تو پھر...''

''یہ جھینگر ظاہر ہے چینی زبان میں باتیں کرتا ہوگا.. چینی گیت گاتا ہوگا..''

''نہیں.. یہی تو ان جھینگروں کا کمال ہے.. تم ان کے ٹرّانے پر تھوڑی دیر دھیان کرو. غور کرو تو تمہیں احساس ہوگا کہ یہ تو وہی کچھ ہے جو تم سننا چاہتے ہو.. یہ تمہاری زبان بول رہا ہے.. بے شک تجربہ کرلو.'' بوڑھا کنفیوشس اپنی مٹھی میرے کان کے قریب لے آیا.

جھینگر محض ٹرّا رہا تھا.. ایک مخصوص لَے میں ٹرٹر کیے جا رہا تھا.. پھر یوں ہوا کہ اس کے ٹرّانے سے کچھ لفظ جنم لینے لگے.. ایسے لفظ جن سے میں آشنا تھا. ے مائے نیں میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا ایہہ حال نیں.. وہ شاہ حسین الاپنے لگا.. پھر اس نے فریکوئینسی بدلی اور... ے ابن مریم ہوا کرے کوئی... گاتا ہوا محسوس ہوا.. جو کچھ میرے لاشعور میں پنہاں تھا اسی کی ترجمانی کرنے لگا.. کبھی وارث شاہ کو گنگنانے لگتا... ے تِلّی پیکنے دی تے نقش روم والے..

میں نے بوڑھے کی مٹھی کو اپنے کان سے پرے کر دیا. ''یہ تو میرے دل کا حال جانتا ہے..''

''اور تم اسے ظاہر کرنا نہیں چاہتے..''

''نہیں..'' میں نے ہراساں ہو کر تتلی کی جانب دیکھا. ''تتلی یہ کیا تماشا ہے.. بوڑھے کنفیوشس نے تمہاری آواز سن کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا.. میری موجودگی سے آگاہ تھا لیکن ظاہر نہیں کرتا تھا.. یہ کیسا کھیل ہے۔''

''تمہارا خیال تھا کہ صرف تم ہو جس کے ہمراہ ایک تتلی سفر کرتی ہے. تم نہیں جانتے کہ یہ بھی تو ایک چوانگ چُو ہو سکتا ہے جس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک تتلی ہے اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ وہ سچ مچ ایک تتلی تھا چوانگ چُو ہوا.. یا وہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ چوانگ چُو ہے.. ہر چینی بوڑھے کے آس پاس ایک ایسی ہی.. میرے جیسی تتلی ہوتی ہے۔''

''کیوں؟''

''یہ تمہید قدرے طولانی ہے.. اگر سننا چاہتے ہو تو..''

''میں سننا چاہتا ہوں۔''

''چین.. ایک بچے.. ایک ماں باپ کا ملک ہے.. تھوڑا سا حساب کتاب کرو کہ ایک بچے کا کیا مطلب ہوتا ہے.. اگر تمہارا حساب کتاب کمزور ہے تو میں عرض کیے دیتی ہوں.. اگر آپ کو صرف ایک بچہ پیدا کرنے کی اجازت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس ایک بچے کا کوئی بہن بھائی نہیں ہے.. اور اس کے والدین بھی اکلوتے ہیں' اس لیے کسی خالہ' پھوپھی' ماموں یا چاچا جی کا امکان نہیں ہے.. جس کے نتیجے میں خالہ زاد' پھوپھی زاد' ماموں زاد اور چچازاد' بہن بھائیوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.. یعنی کزن کا رشتہ بھی ناپید ہے.. چنانچہ ایک چینی بس اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتا ہے.. اسے ان تمام رشتوں کے وجود کا علم ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ان سے جنم لینے والی محبت اور نفرت کے جذبات سے آگاہ ہوتا ہے.. اسی لیے چین میں ہر بچہ ایک وی آئی پی ہو جاتا ہے.. ماں باپ اس ایک پر وہ تمام تر توجہ اور لاڈ پیار نچھاور کرتے ہیں جو پاکستان میں کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ درجن بچوں پر تقسیم کرتے ہیں.. ادھر جو دادا جان اور دادی جان ہیں' ان کا بھی ایک ہی پوتا یا پوتی ہوتی ہے اور نانا اور نانا جان کے حصے میں ایک ہی نواسا یا نواسی آتی ہے.. تو یہ سب لوگ ہمہ وقت اس ایک بچے سے نہ صرف لاڈ پیار کرتے ہیں بلکہ اسے ہر قسم کی خوراک' مٹھائیوں اور آئس کریموں سے ٹھونستے چلے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں چین کا یہ اکلوتا بچہ اتنا موٹا اور بدوضع ہو جاتا ہے کہ چلنا بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ محلے والوں کے سامنے بھی ہمارے ملک کی طرح درجنوں ننگ دھڑنگ ناکیں پونچھتے بچے پریڈ نہیں کرتے صرف ایک آدھ بچہ ہی کبھی کبھار دکھائی دیتا ہے' اس لیے وہ بھی تاک میں رہتے ہیں کہ جونہی یہ بچہ دکھائی دے اسے خوب چومیں چاٹیں اور آئس کریم اور چاکلیٹ کھلائیں.. یہی ایک بچہ جب بوڑھا ہوتا ہے.. تو اس کے آس پاس کچھ بھی نہیں ہوتا.. وہ دنیا کا سب سے تنہا بوڑھا ہوتا ہے.. اگرچہ دنیا کا ہر بوڑھا تنہا اور لاچار ہوتا ہے لیکن کبھی نہ کبھی اس کا کوئی اسی عمر کا کزن.. کوئی بہن بھائی اسے ملنے کے لیے آ جاتا ہے.. اپنی زندگیوں میں

کھوئے ہوئے بچوں میں سے ایک نہ ایک اس کے قریب آ بیٹھتا ہے.. چینی بوڑھے کو کوئی پوچھنے والا ہوتا ہی نہیں اور اسی لیے وہ دنیا کا تنہا ترین بوڑھا ہوتا ہے..اس کے ساتھ باتیں کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور وہ ایک جھینگر پال لیتا ہے جو اس سے باتیں کرتا ہے اور اس کی باتیں سنتا ہے۔''

''تتلی.. یہاں سے نکل چلو میرا جی گھبرا رہا ہے..''

''تمہیں یہاں شاید اپنے مستقبل کا شائبہ نظر آ رہا ہے.. ہاں ہم چلتے ہیں.. یہ بوڑھا کنفیوشس اپنے پرانے جھینگر سے جدا ہونے کے بعد بہت دن سے تنہا اور چپ تھا اسے جی بھر کر اپنے نئے رفیق کے ساتھ باتیں کرنے دو۔''

ہم باہر آ گئے..

باہر.. بیجنگ کے پچھواڑے میں..اس کی بیک سٹریٹس کی آزردگی اور غربت میں اور بھی کنفیوشس بوڑھے تھے..

تنہائی اور بے چارگی میں..کسی ایک جھونپڑے میں..فٹ پاتھ پر کرسی ڈالے.. اپنے آخری سانس کے منتظر اور بھی بوڑھے تھے..

اگرچہ چین کے عقیدوں میں بزرگوں کو خداؤں کی قربت میں رکھا جاتا ہے..ان کی پرستش کی جاتی ہے لیکن یہ بوڑھے نہ خدا بننا چاہتے تھے اور نہ پرستش کے خواہش مند تھے..صرف رفاقت چاہتے تھے..بہن بھائی اور پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں چاہتے تھے..اب وہ نہیں تھے تو وہ جھینگروں کے ساتھ باتیں کرتے تھے..

اپنے جھونپڑوں میں..فٹ پاتھوں پر..کئی ایسے بوڑھے نظر آتے تھے جو جھینگروں کو مٹھی میں لیے یا جیم کی بوتلوں میں بند انہیں کان سے لگائے ان کی ٹرٹر سنتے تھے..

وہ سب بچوں ایسی معصومیت چہروں پر سجائے..بھولپن کی مسکراہٹوں کے ساتھ اپنے آپ میں مگن اپنے اپنے جھینگروں کی آوازیں سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے..غور سے سنتے رہتے تھے اور جب کبھی جھینگر چپ ہو جاتا تھا تو وہ بوتل کو ذرا جھٹکا دے کر اسے بیدار کرتے تھے اور پھر سے کان سے لگا لیتے تھے..

''تتلی.. یہاں سے بھی نکل چلو..میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

''سنو..'' تتلی میرے دائیں کان کی قربت میں ہو کر اڑتی جاتی تھی۔'' کیا تم نے اپنے حصے کا جھینگر پکڑ لیا ہے؟''

''میں نے؟..'' مجھے احساس ہوا کہ ہم تھیان من سکوئر سے بہت دور نکل آئے ہیں..کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم وہاں پہنچیں اور ہماری کوچ روانہ ہو چکی ہو..نہیں فکرمندی کی بات نہیں میری جیب میں پیس ہوٹل کا کارڈ موجود ہے اور میں کسی نہ کسی طرح واپس پہنچ ہی جاؤں گا..'' مجھے جھینگر کی کیا ضرورت ہے؟''

''کیا تمہیں بھی ایک ساتھی کی..ایک گیت کی ضرورت نہیں؟''

''نہیں..ابھی نہیں..''

''لیکن تم پر بھی وہ وقت آیا چاہتا ہے..''

''کون سا وقت...'' میں نے اپنی رفتار تیز کر دی..

''جب تم تنہا اور لاچار ہو جاؤ گے..اپنے باپ کی طرح ایک پلنگ پر بیٹھے.. سر جھکائے..ٹانگیں لٹکائے اپنی وہیل چیئر کو اس حسرت سے دیکھ رہے ہو گے کہ کوئی بیٹا اپنی مصروف زندگی میں سے وقت نکال کر آئے اور مجھے باہر کی دنیا میں لے جائے..وہیل چیئر کو دھکیلتا قریبی مارکیٹ میں لے جائے..جُوس کا ایک ڈبّہ پلائے..دوسرے ہاتھ میں سگریٹ سلگا کر تھما دے..تب تمہیں بھی ایک جھینگر کی ضرورت ہو گی..''

''تتلی..'' میں نے اپنے غصّے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔'' چار دن کی تمہاری حیات ہے اور میں ساٹھ برس کا ہونے کو آ رہا ہوں اور تم مجھ سے بحث کرتی ہو..مجھ سے زیادہ سیانی بنتی ہو..میرے ماشاءاللہ پانچ بہن بھائی ہیں..ان کے بال بچے ہیں..پھوپھی زاد اور خالہ زاد ہیں..مجھے کسی جھینگر کی کوئی ضرورت نہیں..

''کیا وہ سب باقاعدگی سے تمہیں ملتے ہیں؟''

''نہیں..'' میں ذرا پشیمان سا ہوا..'' شادی بیاہ یا سوگ پر ملاقات ہو جاتی ہے.. لیکن بہنیں کبھی کبھار فون کر لیتی ہیں... بھائی بھی پوچھ لیتے ہیں..اور میں جانتا ہوں کہ

میرے بچے بھی شادی کے بعد مجھے پوچھتے رہیں گے..''

''یہ تمہاری امید ہے..کیا تم نے تمہارے بہن بھائیوں نے اپنے باپ کو پوچھا تھا؟''

''ہاں..جب بھی وقت ملتا تھا ہم ان کے پاس جا بیٹھتے تھے..''

''سنو... بڑھاپے میں ایک چینی اکلوتا بچہ اور پاکستانی بے شمار بچے برابر ہو جاتے ہیں۔ایک جیسے ہو جاتے ہیں..بڑھاپا ایسی شے ہے..پاکستانی بوڑھا اس آس میں رہتا ہے کہ کوئی آئے گا..جب کہ چینی بوڑھا جانتا ہے کہ کوئی نہیں آئے گا..اس لحاظ سے چینی بوڑھا بہتر رہتا ہے اور ایک جھینگر پال لیتا ہے...میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنے حصے کا جھینگر تلاش کر لو..''

''چلو میں مان لیتا ہوں کہ بالآخر بڑھاپے کی تنہائی میں مجھے ایک جھینگر کی رفاقت درکار ہوگی..لیکن ایک ایسا جھینگر جسے میں بیجنگ میں کیچ کروں گا وہ تو چینی ہوگا..اور اپنی زبان میں ٹرائے گا تو فائدہ...''

''تم بھول گئے ہو..ابھی ابھی کنفیوشس بوڑھے نے تمہارے کان کے ساتھ جس جھینگر کو لگایا تھا کیا وہ تمہاری زبان نہیں بولتا تھا؟..ایک جھینگر کی یہی تو خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر بوڑھے کے کان میں اس کی مادری زبان میں گیت گاتا ہے..''

''کیا پتہ یہ صرف کنفیوشس کا جھینگر تھا جو میری زبان میں دسترس رکھتا تھا..باقی تمام جھینگر بنیاد پرست چینی ہوں..''

''تم جس جھینگر کو بھی کان کے قریب کرو گے وہ تمہیں.. الف اللہ چنبے دی بوٹی مُرشد من وچ لائی ہو..الا پتا سنائی دے گا..''

تتلی سے بحث فضول تھی۔وہ انہونی باتیں کر رہی تھی۔''تتلی' تھیان من سکوئر میں..شہرِ ممنوعہ کے سائے میں میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے..لیڈر اپنے گرے سوٹ میں خشمگیں ہو چکا ہوگا..آؤ واپس چلتے ہیں۔''

''لیکن اس سے پیشتر ہم کسی اور بوڑھے سے درخواست کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں ایک لمحے کے لیے اپنا جھینگر ادھار دے..ہم سنیں تو سہی کہ وہ کیا کہتا ہے..''

ایک اور کنفیوشس بوڑھے نے تتلی کی درخواست کے جواب میں چپکے سے اپنی جھینگر بوتل ہمیں پیش کر دی..میں نے اسے کان سے لگایا تو جھینگر ٹرّا رہا تھا..الف اللہ چنبے دی بوٹی...وہ ٹرّا رہا تھا...

اور تب میں نے اپنی زندگی کا پہلا ''بینڈا کیچر'' دیکھا..

وفد کے اراکین جن کے پاس انتظار کی کوفت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔نہایت دلچسپی سے ان..بینڈا کیچرز کو دیکھنے لگے..جھینگر پکڑنے والوں کو دیکھنے لگے..

اور سفید ریش نے ابھی ابھی کہا تھا کہ لو جی تارڑ صاحب..یہ جو چینی بھائی اتنے تردّد سے بینڈے کیچ کر کے بوتلوں میں بند کر رہے ہیں تو یقیناً گھر جا کر انہیں نہایت اہتمام سے فرائی کریں گے اور ان کا ''بینڈا پلاؤ'' پکائیں گے...

وہاں ایک کنفیوشس شکل کا بوڑھا بھی تھا جس کی بوتل میں ابھی تک کوئی جھینگر نہ تھا..اس بوڑھے کی شکل جانی پہچانی معلوم پڑتی تھی..شاید میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا..لیکن کہاں..اور کب؟..

ہم فٹ پاتھ پر کوچ کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے' بیزار ہو گئے..

تھیان من سکوئر کی رونق گھٹتی جا رہی تھی..

اس کی بے انت وسعت میں ویرانی پھیل رہی تھی اور آسمان پر اژدھا اور تتلی شکل پتنگیں اور کنکوے کم ہو رہے تھے..

بیجنگ ساری رات جاگنے والے شہروں میں سے نہیں تھا اور اب اس کے سونے کا وقت آن پہنچا تھا..

''تم اپنے حصے کا جھینگر ابھی سے پکڑ لو..ورنہ پچھتاؤ گے..'' یہ تتلی کی مدھم سرگوشی تھی...

مقام....شی آن

"شی آن..شی آن..شی آن"

ثوریا..ثوریا..ثوریا...

اوراب...

شی آن...شی آن...شی آن...

چین کا قدیم ترین دارالسلطنت..اولین شہنشاہوں کا مسکن..وہ شہر جہاں سے چین کی تاریخ اور ثقافت کا آغاز ہوا...جہاں سے شاہراہ ریشم شروع ہوتی تھی..سلک روٹ کا پہلا قدم..اور اس شہر کے نام میں بھی اسی نغمگی کی چھن چھن باجے پائل ردھم تھی جو ہسپانیہ کے ایک دورافتادہ قصبے ثوریا..ثوریا..ثوریا کے نام میں تھی..

اس شہر نے چین کی تنہائی اور ثقافتی اور تہذیبی برتری کو یورپ سے جاملایا..
شاہراہ ریشم کے راستے..اس شاہراہ کا ایک اہم پڑاؤ ترکی کا شہر ترابزان تھا جہاں ان زمانوں کی ایک سرائے کے کھنڈرابھی تک موجود ہیں..میں نے ترابزان میں ایک شب قیام کیا تھا.. شی آن سے شروع ہو کر یہ شاہراہ اطالیہ کے شہر وینس میں اختتام کو جا پہنچتی تھی..وینس..وہی شہرِ آب جہاں مارکوپولو نے چین کی سیاحت سے واپسی پر ایک ضیافت میں اپنے چوغے کو اتار پھینکا تھا اور اس کے نیچے جو لبادہ تھا' اس پر سینکڑوں ہیرے اور جواہر ایسے تھے کہ اطالوی شاہی خاندانوں کے افراد کی آنکھیں ان کی چمک سے چندھیا گئی تھیں...میں نے گویا اپنا سفر الٹا شروع کیا تھا..ایام جوانی میں شاہراہ ریشم کے نقطۂ اختتام

وینس میں چند روز بسر کیے تھے..وینس جہاں موت بھی خوبصورت تھی اور اب تیس برس بعد میں اس کے نقطۂ آغاز شی آن میں آن پہنچا تھا..

میرے لیے یہ امر ہمیشہ دکھ کا باعث رہا ہے کہ اصل سلک روٹ..شاہراہ ریشم شی آن کاشغر' مرو اور موجودہ پاکستان سے بالا ہی بالا وسطی ایشیائی ریاستوں میں سے گزر کر تبریز اور ترابزان سے ہوتی ہوئی وینس چلی جاتی تھی.... پاکستانی علاقوں کو چھوتی بھی نہیں تھی اور اس کے باوجود ہم قراقرم ہائی وے کو اکثر شاہراہ ریشم کا نام دیتے ہیں...جو چاہے ہمارا حسن کرشمہ ساز کرے..

ہم شی آن..شان سے گئے..نہایت ستھری اور نکھری ہوئی ایک مقامی ایئر لائن سے گئے..

سوا دو بجے بیجنگ سے روانگی اور..دو گھنٹے بعد..شی آن میں..

ہمارے ڈیلی گیشن کے ایک ممبر..جو کنفیوشس کی عمر تک بس پہنچا ہی چاہتے تھے اور ایک پرائیویٹ جھینگر کے لیے نہایت مناسب امیدوار تھے..عارضۂ دل و جگر و گردہ و کلیجی وغیرہ میں بخوبی مبتلا تھے لیکن ان عوارض کو عارضی جان کر خاطر میں نہیں لاتے تھے..خوب ڈٹ کر کھاتے تھے اور کیا خوب جی بھر کے پیتے تھے۔ جہاز کے بیجنگ ایئرپورٹ سے بلند ہوتے ہی سانس کی کمی کا شکار ہو گئے..انہوں نے ایئر ہوسٹس کو اپنی دبنگ انگریزی میں آکسیجن ماسک مہیا کرنے کے لیے کہا..ایئر ہوسٹس چونکہ مسافروں کو لنچ سرو کرنے میں مصروف تھی' اس لیے اسے قدرے تاخیر ہو گئی اور وہ اس پر برس پڑے..برسنے کے دوران انہوں نے ایئر ہوسٹس پر انگریزی کی جو بوچھاڑ کی اس میں انہوں نے دھمکی آمیز لہجے میں یہ بھی کہا کہ یو نو آئی ایم اے جرنلسٹ..اس سادہ سے فقرے کو سن کر ایئر ہوسٹس لرزہ براندام ہو گئی..اس کی گھگھی بندھ گئی اور وہ جھک جھک کر معذرت کی خواستگار ہوئی اور بقیہ تمام عملے کو بھی چوکنا کر دیا..ایک کھلبلی سی مچ گئی..اور پھر متعدد آکسیجن ماسک اور پتہ نہیں کیا کیا مشینیں ان کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ جب اس آکسیجن امداد کو ایک نقاب کی صورت اوڑھ کر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگے اور یہ امید بندھ گئی کہ وہ فی الحال کنفیوشس کے پاس نہیں جائیں

گے تو ایئر ہوسٹس نے وفد کے دیگر ممبران کے پاس باری باری جھک کر معذرت کی کہ.. آئی ایم سوری.. ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اس پرواز سے ایک پاکستانی جنرل بھی سفر کر رہے ہیں..

"کون جنرل..." تقریباً ہر ایک کا منہ کھل گیا..

"یہ جو آپ کے بزرگ ساتھی ہیں.. انہوں نے بتایا ہے کہ وہ پاکستانی جنرل ہیں اور ہم چینی عوام تو پاکستانی فوج کے بے حد مداح ہیں.. سوری.."

ہم چپ ہو گئے کہ مفت میں عزت افزائی ہو رہی تھی.. اگر ایئر ہوسٹس اپنی یا ہمارے بزرگ ساتھی کے انگریزی لہجے سے مار کھا کر.. جرنلسٹ کو جنرل سمجھ بیٹھی ہے تو اس نادان کو سمجھانے سے فائدہ..

"وری سینئر جنرل.. وری سینئر جنرل.." ہم سب نے تائید کی۔

شی آن ایئرپورٹ نہایت دیہاتی سا ایئرپورٹ.. یوں لگتا تھا جیسے کسی زراعتی فارم کا مال گودام ہے.. جہاں غیرملکی سیاحوں کے انبار تھے جو نہایت ہی سُست رفتاری سے حرکت کرتی ہوئی بیلٹ پر سے اپنے بھاری سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے باہر جا رہے تھے.. ہم بیجنگ سے یہاں تک تو آسانی اور سہولت سے آ گئے تھے لیکن یہاں ہمیں تقریباً پرواز کے دورانیے جتنا ہی وقت سامان کے انتظار میں لگا... سب مسافر رخصت ہو گئے.. ایئرپورٹ بھائیں بھائیں کرنے لگا اور ہم اس کی ویرانی میں سامان لانے والی متحرک بیلٹ کے خالی وجود کو گھورتے رہے۔ یہاں تک کہ ایئرپورٹ کا جمائیاں لیتا عملہ بھی ہمیں گھورنے لگا.. کہ یہ غیرملکی یہاں سے اب دفع کیوں نہیں ہوتے.. یہ دفع ہوں تو ہم بھی گھر جائیں...

ہم تو دفع تب ہوں جب ہمارا سامان آئے.. اور خدا خدا کر کے وہ آ ہی گیا اور ہم اسے ایک گمشدگی کے بعد ملنے والے بچے کی طرح غصے سے گھسیٹتے ایئرپورٹ سے باہر آ گئے..

اور باہر.. ایک آفت ہماری منتظر تھی..

شاید پہلے وہ کچھ اور تھی اور ہمارا انتظار کرتے کرتے وہ آفت ہو گئی تھی..

اس کی شکل ایسی ہرگز نہ تھی کہ ہم اس سے یہ کہتے کہ.. کاش تم میرے لیے ہوتے!..

بیجنگ سے روانگی پر ہمارے مترجموں کی مثلث.. لیُو خاور اور وانگ لی نے ہمیں

خبردار کر دیا تھا کہ جناب ہماری بادشاہت صرف بیجنگ تک محدود ہے۔ جونہی آپ یہاں سے کوچ کر کے اگلے شہر میں قدم رنجہ فرمائیں گے تو وہاں تمام تر انتظامات اور آپ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس شہر کی ادیبوں کی انجمن کے عہدے داروں کی ہوگی اور ہم بھی آپ کی طرح مہمان ہو جائیں گے کیونکہ یہی شیڈول ہے.. یہی سسٹم ہے.. ہم آپ کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے...

یہ آفت پتہ نہیں کس انجمن کی عہدے دار تھی.. ادیبوں کی تو نہیں کسی عفریتی انجمن کی نمائندہ لگتی تھی.. اور اگر یہ ادیب تھی تو یقیناً یہ بھوت پریت کی کہانیاں لکھتی ہوگی..

یہ آفت جو شی آن ایئرپورٹ کے باہر ہماری منتظر تھی نہایت.. نو نان سینس.. میٹر آف فیکٹ.. کرخت چہرے اور صرف ناشتے پر دو چار بندوں کا آملیٹ بنا کر کھا جانے والی خصلت کی مالک ایک خاتون تھی جس نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو امریکی سفید فام اپنے حبشی غلاموں کے ساتھ کیا کرتے تھے.. ہمیں محض سکول کے بچے گردانتے ہوئے ایک جنسی ناآسودگی کا شکار استانی کی طرح.. بغیر کسی خوش آمدیدی مسکراہٹ کے کوچ میں سوار ہونے کا حکم دیا..

ہم اتنی بے رُخی کے عادی نہ تھے..

ہمیں لیو کی تنظیم اور "فالومی.." .. خاور کے کھلنڈرے پن اور وانگ لی کی منگول مسکراتی آنکھوں کی عادت ہو چکی تھی.. ان تینوں کے لاڈ پیار نے ہمیں بگاڑ دیا تھا.. اور ان کے بعد یہ خاتون ہماری نگران ہو گئی تھی جسے خاتون کہنے سے ہی کلیجہ منہ کو آتا تھا..

فربہ.. سُوجی ہوئی بُوتھی.. سائبیریا کے کسی بیگار کیمپ کی کمانڈنٹ.. یہ کیسا شہر شی آن تھا جہاں کسی روایتی چینی اژدھے کی پھپھی جان کو ہماری نگران مقرر کر دیا گیا تھا۔

شی آن ایئرپورٹ سے مرکزی شہر ایک طویل فاصلے پر تھا۔

ہم سب.. یہاں تک کہ لیڈر بھی اس ماسی مصیبتے کی رفاقت میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے اور کوچ چین کے دیہی علاقوں میں سے گزر رہی تھی۔

دونوں جانب افق تک نہ کوئی شہر تھا اور نہ کوئی گاؤں.. صرف کھیت تھے اور کہیں

کہیں ٹیلے تھے..کہیں قبریں تھیں۔

میں نے مکّی کی بلند اور ہریاول سے بھری فصلیں دیکھیں...اچھا تو چین میں بھی بھٹے ہوتے ہیں..مکّی ہوتی ہے..اور پھر یاد آیا کہ چکن کارن سوپ کی کارن نے یہیں سے جنم لے کر پورے پاکستان کو اپنی روایتی خوراکیں بھلا کر اپنا گرویدہ کرلیا تھا..

ان کھیتوں میں کہیں کہیں پگوڈا نما قبریں تھیں..جن پر ڈھلوان سرخ چینی طرز کی چھتوں کے سائے تھے اور کچھ پہاڑیاں تھیں جو قدرتی نہیں لگتی تھیں...کہیں ہموار میدان میں ٹیلے نظر آتے تھے..یہ ایک عجیب سی اداس اور رنجیدہ اور خاموش لینڈ سکیپ تھی جس کے آخر میں کسی خوش نظر اور دل کو مسرت سے بھرنے والی بستی کا امکان کم تھا..

''تم اتنے دل گرفتہ اور روٹھے ہوئے سے کیوں بیٹھے ہو..'' تتلی بولی..

وہ کھڑکی کے چوکھٹے پر سلوموشن میں اپنے پر کھولتی سمیٹتی مجھ سے مخاطب تھی..

''میرا خیال تھا تم وہیں بیجنگ میں ہی رہ گئی ہو..میں نے تمہیں ہوائی جہاز میں سوار ہوتے تو نہیں دیکھا..''

''میں خود پرواز کر سکتی ہوں تو مجھے کسی اور کی پرواز کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے..میں جہاز کے اندر اپاہج ہو کر کیوں بیٹھ جاتی..میں خود اڑ سکتی ہوں..''

''تم کہاں تھیں؟''

''میں تمہارے ہوائی جہاز کے ساتھ اڑان کرتی آ رہی تھی..میں چاہتی تھی کہ چین کی وسیع ہریاول اور دریائے زرد کے اوپر تم بھی میرے ہمراہ پرواز کرو لیکن تم دھیان ہی نہیں دیتے تھے..میں بار بار تمہاری کھڑکی پر اپنے پروں سے دستک دیتی تھی لیکن تم تو اپنے چاول اور مینڈک کھانے میں اتنے محو تھے کہ میری جانب دیکھتے ہی نہیں تھے..''

''نہ تتلی نہ..پرواز کے دوران میں نے لنچ تو کیا تھا لیکن چاولوں کے ساتھ مینڈک ہرگز نہیں کھائے..حلال گوشت کا ایک مرکب سا نوش کیا تھا..مجھے خود ایئر ہوسٹس نے گارنٹی دی تھی کہ وہ گائے کا حلال گوشت ہے..''

''اگر تم ایک ایئر ہوسٹس کی بات کا یقین کر لیتے ہو تو تم ایئر ہوسٹسوں کو نہیں

جانتے..ان کی ٹریننگ میں شامل ہے کہ وہ ہر مسافر کو اس کی پسند اور عقیدے کے مطابق خوش کرتی ہیں..''

''ہاں شنید ہے کہ ایک ایئر ہوسٹس اپنے محبوب کے ساتھ بھی ایک مسافر ایسا سلوک کرتی ہے..فکر نہ کرو میں ایئر ہوسٹسوں کو جانتا ہوں..بہر حال جو ہوا سو ہوا..لیکن جو کچھ بھی ہوا اس میں مینڈک شامل نہ تھا..''

''میں مذاق کر رہی تھی..''

''چنانچہ یہ ایک مینڈک مذاق تھا..''

''ہاں..'' یہ ''ہاں'' تتلی نے نہایت بیٹھی ہوئی جنسی آواز میں کہا اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ تتلیوں میں بھی تو مرد و زن ہوتے ہیں..اور جسے میں تتلی سمجھ بیٹھا تھا وہ تتلا بھی ہو سکتی تھی..

''دیکھو تتلی..یا تتلے..میں نے تم میں ایک تبدیلی نوٹ کی ہے..میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پروں کا رنگ بدل چکا ہے..بیجنگ میں یہ سرخ تھے چلبلے تھے اور یہاں ان کا رنگ سلیٹی دکھائی دے رہا ہے..''

''اس لیے کہ ہم اب ٹانگ خاندان کی ثقافت کے دائرے میں آ گئے ہیں..بیجنگ سرخ ہے اور شی آن کی چھتیں اور مزاج دھیمے اور سلیٹی ہیں...بیجنگ شوخ ہے اور شی آن سوبر ہے..ان دونوں شہروں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے....شی آن والے اپنے آپ کو قدیم چینی تہذیب کے نمائندے سمجھتے ہیں...اہل بیجنگ کو اگر حقیر نہیں جانتے تو انہیں زیادہ لفٹ بھی نہیں کرواتے..اسی لیے میں نے اپنے پروں کو سلیٹی کر لیا ہے تاکہ وہ یہ نہ جان پائیں کہ میں بیجنگ سے آئی ہوں..لیکن تم میری باتوں پر دھیان نہیں دے رہے۔کچھ بجھے ہوئے اور رنجیدہ سے لگتے ہو..کیا بات ہے؟''

''یار تم نے یہ عورت دیکھی ہے جو شی آن میں ہماری نگران مقرر کی گئی ہے..ایک تو یہ مرد ہوتے ہوتے بچی ہے..یا نہیں بچی..اور پھر یہ ہمیں بھیڑوں کی طرح ہانک رہی ہے...ہماری آمد پر نہ کوئی خوش آمدیدی مسکراہٹ نہ کوئی ہینڈ شیک وغیرہ...اس کا شہر بھی ایسا ہی

ہوگا..کرخت اور بدمزاج..."

"اسے معاف کردو..یہ اپنی خصلت سے مجبور ہے..ابھی تک پرانے کمیونسٹ نظام کے شدید ڈسپلن میں کوئک مارچ کر رہی ہے..نئے چین سے مفاہمت نہیں کر پائی اور دل ہی دل میں کھولتی ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے..چین میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو موجودہ تبدیلیوں سے ناخوش ہیں..یہ انسان کو نہیں نظام کو اہم سمجھتے ہیں...."

"لیکن یہ بی بی ہے کون..اللہ تعالیٰ چاہے بھی تو اتنا کرخت چہرہ نہیں بنا سکتا...یہ اس نے خود ہی بنایا ہے..کیسے بنایا ہے؟"

"میں بتاتی ہوں." تتلی نے آواز کو مزید مدھم کر لیا۔شاید وہ بھی اس خاتون سے قدرے خوفزدہ تھی "یہ اپنے زمانے میں ماؤ کے ثقافتی انقلاب کی ایک دلیر اور پُرتشدد ریڈ گارڈ رہی ہے..ریڈ گارڈ ہر اس شے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے جو ماضی سے متعلق تھی..چاہے یہ ایک عمارت ہو یا ایک خیال..اور فیصلہ ان کا ہوتا تھا.....بے شمار بزرگ انقلابیوں کو اسی الزام میں بازاروں میں گھسیٹا گیا...ادیبوں' اساتذہ' اداکاروں اور حکومتی اہلکاروں کو زدوکوب کیا گیا..ملازمتوں سے نکال کر کھیتوں میں کام کرنے پر مجبور کر دیا گیا..ہر شے کو تباہ کر دیا گیا تاکہ کھنڈروں پر ان کی من مرضی کی عمارت تعمیر ہو سکے...اور ہر جانب صرف اور صرف ماؤ کا راج ہو..یہ عورت بھی ایک ریڈ گارڈ تھی..اس نے جانے کتنے کتب خانے اور قدیم مزار تباہ کیے..اور کتنے دانشوروں کو رسیوں سے باندھ کر انہیں لیکچر دیئے..اب یہ کیسے نئے چین کے ساتھ مفاہمت کر سکتی ہے..اسے معاف کر دو."

میں نے ایک نظر کوچ کے ڈرائیور کے برابر میں ایک مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی اس آسمانی آفت کو دیکھا اور کسی حد تک اس کی مجبوری سمجھ گیا..چین آگے نکل گیا تھا اور وہ پیچھے رہ گئی تھی...

تتلی پھر گویا ہوئی "اس کی موجودگی کو بھول جاؤ اور باہر کھیتوں میں ابھرے ہوئے جو ٹیلے نظر آ رہے ہیں..انہیں غور سے دیکھو..یہ قدرتی نہیں ہیں' انسان کے بنائے ہوئے ہیں..اتنے غور سے دیکھو کہ ان کے اندر جو چینی شہنشاہ اور ملکائیں دفن ہیں' ان کے

تابوت تمہیں نظر آنے لگیں اور ان کے ہمراہ دفن کر دیئے جانے والے خزینے..اور غلاموں اور کنیزوں کی ہڈیاں دکھائی دینے لگیں..."

"کیا واقعی؟" میں نے حیرت سے پوچھا..

"ہاں یہ پوشیدہ مقبرے ہیں.چینی جانتے ہیں کہ ان کے اندر ان کے قدیم شہنشاہ اور شاہی افراد دفن ہیں..زیرزمین مقبروں کا ایک سلسلہ ہے لیکن انہوں نے جان بوجھ کر ان کی کھدائی نہیں کی کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی حیرت اور دریافت کے کچھ خزینے چھوڑ جائیں..ویسے بھی جو کچھ زیرزمین ہے وہ محفوظ ہے اور جو کچھ دریافت ہو جاتا ہے' اسے زمانے کی ہوا لگ جاتی ہے اور وہ رُوبہ تنزل ہو جاتا ہے.."

"جیسے موہنجوداڑو اور ہڑپہ ریزہ ریزہ ہو رہے ہیں..ٹیکسلا اور تخت بائی کے کھنڈرات کو ہمارے زمانوں کی ہوا چاٹ رہی ہے." میں بڑبڑایا."یہ دریافت نہ ہوتے تو محفوظ رہتے.."

کھیتوں کا حوصلہ جواب دینے لگا اور وہ پیچھے رہنے لگے۔ان کی جگہ نئے سٹیڈیم' پارک اور نہایت شاہانہ قسم کی بستیاں وجود میں آنے لگیں..یہاں سوئمنگ پول' گاف کورس اور امریکی کلب تھے..یہ ولاز برائے فروخت تھے۔اُن چینیوں کے لیے جنہوں نے ایک ملک دو نظام کے تحت کاروبار کو فروغ دے کر امریکی کروڑ پتیوں کے شانہ بہ شانہ جگہ بنائی تھی۔

کوچ شہر میں داخل ہوگئی..

شی آن کی بھیڑ اور گہماگہمی نے اسے رینگنے پر مجبور کر دیا اور وہ ٹریفک کے اشاروں پر تادیر رکتی بالآخر ایک سپاٹ چہرے والے شاندار ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوگئی..یہ گرینڈ نیو ورلڈ ہوٹل تھا جس کی گیارہ منزلہ عمارت میں مستطیل کھڑکیوں کی سینکڑوں آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں سے کچھ روشن ہو رہی تھیں..

ہم اس کے وسیع اور بلند و بالا ستونوں کے ریسیپشن ہال میں داخل ہوئے تو پہلے فرش پر بچھے ایک فرلانگ طویل قالین سے متاثر ہوئے۔پھر اس کی ایک دیوار پر آویزاں فرلانگ بھر ہی لمبی چوڑی چینی مصوری کی تصویر سے متاثر ہوئے اور جب ہم نے استقبالیہ

کاؤنٹر کے عقبی شیشے کی دیوار کو دیکھا اور اس کے پار دیکھا.. تو ہم تقریباً گنگ ہو گئے.... اس کے پار شی آن کے ایک شہنشاہ اور اس کے وزیر کے بھی فرلانگ بھر اونچے مجسمے کھڑے تھے یعنی ہوٹل کی کم از کم پانچویں منزل تک تو وہ جاتے تھے.. اور ان کے عقب میں ان کی غضیلی سپاہ جنگ کے لیے تیار کھڑی تھی.. چٹان میں سے تراشی ہوئی.. یہ شاہی مجسمے اتنے اونچے.. اتنے شاندار اور اتنے بارعب تھے کہ ہم بولنے کی کوشش کرتے اور پھر گنگ ہو جاتے کیونکہ ہماری نظر ان سے ہٹتی نہ تھی۔ ہم منہ کھولے انہیں حیرت سے تکتے تھے اور ہمیں شکوہ تھا اپنے میزبانوں سے کہ انہوں نے ہمیں اس کولاسس آف رہوڈز کے چینی ماڈل کے لیے ذہنی طور پر تیار کیوں نہیں کیا تھا.. یہ تو ایسے ہی ہے کہ آپ اپنے بیڈروم میں داخل ہوں اور کھڑکی کے باہر بامیان کے عظیم الشان بدھا کے مجسمے کھڑے ہوں..

شی آن میں صرف ان مجسموں کو دیکھنے کے لیے ہی آنا جائز ٹھہرتا تھا اور اس خوشی میں ہم نے آسمانی آفت کی پچھلی تمام غلطیوں کو معاف کر دیا اور اسے پہلی بار پیار بھری نظروں سے دیکھا.. اب آپ جان گئے ہوں گے کہ وہ مجسمے کتنے پُرشکوہ تھے جن کے لیے ہم نے اس خاتون کو بھی پیار سے دیکھ لیا..

پتھریلے لبادوں میں.. داڑھیوں اور عباؤں میں.. تلواروں پر ہاتھ رکھے آسمان کو بلند ہوتے ان مجسموں کو دیکھ کر اگر ہم گنگ ہوتے تھے تو وہ بھی ہمیں دیکھ کر گنگ ہو گئے تھے کہ ہماری سلطنت کے پایۂ تخت شی آن سے نکلنے والی شاہراہ ریشم تو ان پاکستانیوں کے علاقے کو چھو کر بھی نہیں گزرتی تو یہ کون سے راستوں پر چلتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں.. اور یہ حقیر عوام الناس ہو کر.. محض کیڑے مکوڑے ہو کر زندہ کیوں ہیں اور ہم خاقان چین ہو کر بھی پتھر کیوں ہو چکے ہیں.. زندگی کا ایک سانس یہاں بھی ہمیں ان چینی شہنشاہوں سے ممتاز کرتا تھا..

استقبالیہ خاتون نے ہمیں یہ بھی اطلاع کی کہ اس گرینڈ نیو ورلڈ ہوٹل کو محض ہوٹل نہ سمجھنا.. یہاں گیارہ سو نشستوں والا ایک گرینڈ تھیٹر ہے.. متعدد ریستوران اور سوئمنگ پول ہیں اور پانچ سو کے قریب آرام گاہیں ہیں..

استقبالیہ کاؤنٹر پر ہمیں الاٹ شدہ کمروں کی چابیوں کا ایک ڈھیر لگا تھا اور آسمانی آفت ہر چابی کو اٹھا کر اور پھر اپنے رجسٹر پر درج وفد کے رکن کا نام بلند آواز میں پکار کر چابی اس کی جانب اچھالتی تو نہیں تھی' البتہ یوں غضیلی ہو کر تھماتی تھی جیسے کہہ رہی ہو... تم لوگ اتنے شاندار ہوٹل میں ٹھہرنے کے لائق تو نہیں ہو لیکن کیا کروں بیجنگ سے یہی احکامات آئے ہیں کہ ان پاکستانیوں کی عزت کرو..

کمرے البتہ اتنے گرینڈ نہ تھے لیکن بنیادی سہولتوں کو بخوبی پورا کرتے تھے..

کمرے کی کھڑکی چینی شہنشاہوں کے روشن مجسموں کی جانب کھلتی تھی... اور ایک شہنشاہ ایک بر چھاپی کیپ قسم کا تاج پہنے.. لمبی لمبی مونچھوں والا نہایت خشونت سے مجھے گھورتا تھا.. اس عالی مرتبت شہنشاہ کے پاؤں پہلی منزل کے کمروں کی کھڑکیوں کے سامنے تھے اور پھر یہ بلند ہوتا ہوا پانچویں منزل پر میری کھڑکی کے سامنے آن پہنچا تھا اور اس کا چہرہ جو روبرو تھا.. میرے قد سے بھی کئی گنا بڑا دکھائی دیتا تھا.. اور نہ وہ آنکھیں جھپکتا تھا اور نہ اپنی شہنشاہیت کے جلال میں کوئی کمی آنے دیتا تھا..

جیسے شب بھر رہا چرچا ترا.. ایسے شب شی آن میں وہ عظیم چینی شہنشاہ.. جب بھی میں کروٹ بدل کر کھڑکی پر نگاہ کرتا.. تو وہ مجھے گھور رہا ہوتا.. اور ہر بار مجھے یوں محسوس ہوتا کہ اس نے... ان لمحوں میں جب میری پشت کھڑکی کی جانب ہوتی تھی' اپنی مونچھوں کو تاؤ دے لیا تھا..

اس کے پتھریلے لباس خسروانہ کی ایک سلوٹ میں میری تتلی براجمان تھی.. اور اپنے دونوں پر جھپک جھپک' جیسے مجھے آنکھیں مارتی کہتی تھی..'' سویٹ ڈریمز ان شی آن..''

"مٹی کے سپاہیوں کی فوج..دنیا کا آٹھواں عجوبہ"

ایک دہقان زادے نے..جو کہ میں تھا..دیکھے..
مٹی کے سپاہی دیکھے..
میدان جنگ میں حالت جنگ میں..
قطار اندر قطار..بے شمار..
پہلے تیر کے منتظر...
تیار...
تیر انداز..نیزہ باز..سپہ سالار..تیار..
سب کے سب تیار..
ہر سپاہی اس خوف میں کہ..
پہلا تیر ہوگا اس کے سینے کے پار..
سپہ سالار ہاتھ باندھے..ترچھی آنکھوں تلے مونچھیں پھڑکنے کو..
زرہ بکتر کے باوجود وہ بھی پہلے تیر کے خوف میں..لیکن تیار..
سامنے نظریں جمائے..
بال آراستہ کنگھی کیے ہوئے..مینڈھیاں بنی ہوئیں..
آہنی خود اور ٹوپیاں..بالوں کی چٹیا میں چھلے..

بال..ایک پونی ٹیل کی طرح کاسہ سر پر لہراتے ہوئے..
گھڑ سوار...اپنے گھوڑوں کے پہلو میں کھڑے...تیار..
طبل جنگ بجنے کے منتظر...
سوائے شہنشاہ کے..
وہی شہنشاہ جو میرے کمرے کی کھڑکی میں سے مجھے گھورتا تھا..
وہی شہنشاہ یہاں چھ گھوڑوں کی رتھ میں سوار..کانسی کے بند کمرے میں..
رتھ پر ایستادہ کانسی کے بند کمرے میں محفوظ..
ایک چوکور کھڑکی سے اپنی سپاہ کو حالت جنگ میں دیکھتا ہوا..
کانسی کی دیواروں پر کوئی تیر کوئی نیزہ اثر نہیں کرسکتا..اس لیے محفوظ..
صورتِ شکست میں رتھ کے چھ گھوڑے شہنشاہ کو میدانِ جنگ سے دور لے جائیں گے..
اور شہنشاہ جنگ کا شاہد ہوتا ہے صرف اتنی دیر..
جتنی دیر میں جنگ جیتی جاتی ہے..یا ہار دی جاتی ہے..
جیت شہنشاہ کے نام..اور ہار سپاہی کے کھاتے میں...درج!
ترچھی آنکھوں والی خوش شکل سپاہ...منتظر اور تیار..
تاحدِ نظر بے حس و حرکت سپاہ..اور آگے سپہ سالار..تیار!
کہ کب..پہلا تیر آئے گا..
طبل جنگ کب بجے گا..
سب منتظر..
ایک ہزار برس سے منتظر..
ایک ہزار برس سے سکوت میں گم..تیار..
اور اس ہزار برس میں..نہ طبل جنگ بجتا ہے..
نہ پہلا تیر ادھر سے آتا ہے..

اور نہ جنگ کا آغاز ہوتا ہے..

کیسے ہو؟

کہ سب مٹی ہے.. سپاہ' تیر انداز' گھڑ سوار... سپہ سالار..

سب مٹی کے ہیں..

ٹیرا کوٹا آرمی.. مٹی کی فوج!

لیکن یہ ہمیشہ سے مٹی کے نہیں تھے.. زندہ تھے..

زندہ سپاہ' زندہ گھڑ سوار اور ان کے گھوڑے سب زندہ تھے..

پھر انہی کے چہروں کے سانچے بنے.. ان کے بُت بنے..

ہر سپاہی کی شباہت الگ الگ سانچوں میں ڈھلی...

کہ شہنشاہ مرتے ہوئے اپنی فوج اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مجسموں کی صورت...

مٹی کے سپاہیوں کی فوج اپنے شہنشاہ کے جاگنے کی منتظر اور وہ جاگتا ہی نہیں...

اور میں.. جاگتا ہوں..

ایک دہقان.. ایک کسان کا پوتا..

بے حیثیت' بے نام..

لیکن چین کے سب سے قاہر شہنشاہ کی سپاہ کے سامنے کھڑا.. تنہا..

ان کے مقابلے میں.. تنہا..

مگر مجھے ان پر ترس آ گیا ہے..

میں ان پر پہلا تیر نہیں چلاؤں گا..

اگرچہ میں اپنی ابرو کے ایک اشارے سے.. یہ سکوتِ سپاہ منہدم کر سکتا ہوں..

یہ ہزاروں سپاہی.. تیغ انداز.. سپہ سالار.. گھڑ سوار.. اور شہنشاہ..

میرے رحم و کرم پر ہیں..

یہ شہنشاہ چین میرے تاش کے جوکر سے بھی کمتر ہے..

اس کی رتھ کی نقل میرے ڈرائنگ روم میں بھی دھول جمع کرتی ہے..

اگرچہ یہ سب جب زندہ تھے تو مجھ پر ذرّہ رحم نہ کرتے تھے..

ترس نہ کھاتے تھے..

بے دریغ مجھے تہہ تیغ کرتے تھے.. اور میرے کھیت اجاڑتے تھے..

لیکن میں.. دہقان زادہ ہوں.. مٹی کی توقیر کرتا ہوں..

مٹی میری ماں ہے..

اس لیے مٹی کے سپاہیوں کی بھی توقیر کرتا ہوں..

ان سب کو مسمار کر کے میرے کھیتوں میں بچھا دیا جائے تو..

ان کی زرہ بکتروں اور ہتھیاروں سے..

مونچھوں کے اکڑپن اور شاہانہ لبادوں سے..

گھوڑوں سے اور نخوت کی مٹی سے.. ایک فصل تیار ہو سکتی ہے..

ان کی مٹی سے میں بوٹے اور شجر اُگا سکتا ہوں۔

صرف اس لیے میں ان کی توقیر کرتا ہوں..

توقیر کرتا ہوں مگر ان پر اعتماد نہیں کرتا..

سپاہیوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کب...

ایک ہزار برس کی نیند سے بیدار ہو جائیں..

سکوت سے حرکت میں آ جائیں.. اور مجھے پھر تہہ تیغ کر ڈالیں..

سپاہیوں کے بارے میں میرا تجربہ زیادہ خوشگوار نہیں ہے..

فی الحال.. مجھے ان پر فوقیت حاصل ہے..

اس لیے کہ... میں ہوں.. اور وہ نہیں ہیں..

وہ مٹی ہیں.. اور میں ابھی مٹی نہیں ہوا..

اگرچہ میں ان پر اعتماد نہیں کرتا..

وہ کسی بھی لمحے حرکت میں آ کر مجھے ہلاک کر سکتے ہیں..

اس کے باوجود..

میں پہلا تیر نہیں چلاؤں گا..

کہ میں ایک دہقان زادہ ہوں..

اور دہقان کو مٹی سے پیار ہوتا ہے..

میں ٹھٹک گیا. مٹی کے سپاہیوں نے.. ٹیراکوٹا آرمی نے مجھے حیران کر دیا.. اپنے سامنے ایک عظیم اور ایک قصبے کی وسعت جتنے ہال کی اونچی چھت کے نیچے مٹی کے گڑھوں میں آراستہ ہزاروں قدِ آدم سپاہیوں کو دیکھ کر مجھ میں اس منظر کی بے یقینی نے شدید حیرت کو جنم دیا..

میں اس مٹی کی یلغار کے لیے تیار نہ تھا..

وہ سب جیسے صرف مجھ سے مقابلے کے لیے ہی صف آرا ہوئے تھے۔ ہزاروں بت بنے سپاہی اور ان کی ترچھی آنکھیں صرف مجھ پر تھیں‘ اس لیے میں ٹھٹک گیا..

سب کے سب تیار.. مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار..

عظیم ہال میں.. ایک نمبر گڑھے کی چھت تلے سینکڑوں سیاحوں کی باتوں کی بھنبھناہٹ تیرتی تھی کہ وہ بھی میری طرح اس عجوبے کو دیکھ کر حیرت میں غرق تھے..

سیاحوں کا ہجوم تھا لیکن کوئی بھی کیمرہ بلند نہیں کرتا تھا. فلیش نہیں چمکتا تھا..

اس ٹیراکوٹا آرمی کے عجائب گھر میں تصویر کشی کی ممانعت تھی..

اگر اجازت ہوتی تو اتنے فلیش چلتے کہ ان ہزاروں سپاہیوں کی ہزار برس سے کھلی آنکھیں ان کی تیز روشنیوں سے چندھیا کر بند ہو جاتیں..

ہم شی آن سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ٹیراکوٹا آرمی کے عجائب گھروں میں تھے اور پہلے ہال میں داخل ہوئے تھے..

مٹی کی فوج گڑھوں میں ساکت کھڑی تھی اور اس کے اوپر متعدد گیلریاں پُلوں کی صورت گزرتی تھیں جن پر سیاح حیرت اور اچنبھے سے گزرتے تھے.. گیلریوں پر سے نیچے جھانکتے تھے.. جیسے پُل پر کھڑے ہو کر نیچے بہتے دریا کو دیکھتے ہیں.. اور نیچے موج در موج

مٹی کے سپاہی کھڑے نظر آ رہے تھے..

کوئی بھی سیاح ان تین عظیم ہالوں تلے کھڑے ہزاروں چپ چاپ کھڑے سپاہیوں کی یک لخت نمودادی کے لیے تیار نہ تھا.. اسی لیے وہ بھی ان سپاہیوں کے سکوت کی مانند مبہوت گیلریوں پر جھکے انہیں دیکھتے تھے.. اور آگے بڑھتے جاتے تھے..

دنیا میں جتنے بھی انسانی ہاتھوں کے معجزے ہیں.. اہرام مصر‘ تاج محل‘ اکروپلس‘ پرس پالس‘ کمبوڈیا کے مندر‘ دیوار چین یا موہنجوداڑو کے کھنڈر..... ایک پُرتجسس اور متلاشی سیاح جب ان تک پہنچتا ہے تو وہ بچپن سے ہی ذہنی طور پر ان کے سامنے پہنچ کر حیرت زدہ اور گنگ ہونے کے لیے تیار ہوتا ہے.. وہ ان کی تصویریں دیکھ چکا ہوتا ہے.. فلمیں دیکھ چکا ہوتا ہے.. ان کی تاریخ اور عظمت سے آگاہ ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں مکمل علم رکھتا ہے‘ اس لیے جب پہلی بار وہ ان معجزوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پاتا ہے تو وہ مرعوب ہونے کے لیے تیار ہوتا ہے..

اس کی مرعوبیت کا مجسمہ ایک مدت سے تراشا جا رہا ہوتا ہے اور وہ اس عمارت یا عجائب کے خدوخال سے واقف ہوتا ہے.. طلوع اور غروب میں جو رنگ اس پر اترتے ہیں‘ ان سے آشنا ہوتا ہے.. ہر زاویے سے اس کی تصاویر دیکھ چکا ہوتا ہے.. یہ عین ممکن ہے کہ اگر وہ اس منظر کے لیے پیشگی ذہنی اور حسیاتی طور پر ایکسائٹ نہ ہو چکا ہو تو وہ منظر اس پر کچھ اثر نہ کرے.. اسے ٹھنڈا چھوڑ دے.. اس کے بدن میں حرارت اور حیرت کا ایک بھی بلبلہ نہ چھوڑے.. یہ عین ممکن ہے.. آپ اپنی زندگی میں مدھو بالا‘ میڈونا‘ مارلن منرو اور ایشوریا رائے سے کہیں بڑھ کر خوشنما اور اشتعال انگیز عورتیں دیکھتے ہیں اور نارمل رہتے ہیں لیکن اگر آپ ان خواتین میں سے کسی ایک کو یکدم اپنے سامنے پائیں تو آپ کی سٹّی گم ہو جائے گی۔ ہونٹ لٹک جائیں گے‘ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی.. صرف اس لیے کہ وہ بار بار ایڈورٹائز ہو چکی ہیں کہ بس یہی خوشنما اور اشتعال انگیز ہیں۔

تو اسی طور دنیا بھر میں انسانی ہاتھوں کے جو معجزے اور عجوبے ہیں‘ وہ سب کے سب ایڈورٹائز ہو چکے ہیں.. آپ بچپن سے ہی ان سے مرعوب ہونے کی ٹریننگ

حاصل کرنے لگتے ہیں..

ٹیراکوٹا آرمی.. مٹی کے ان سپاہیوں کا معاملہ بالکل الگ ہے... یہ ایڈورٹائز نہیں ہوئے۔ان کے اشتہار نہیں لگے اس لیے نہ آپ مرعوبیت کے لیے پہلے سے تیار ہوتے ہیں اور نہ حیرت کے لیے..

نہ آپ نے ان کا نام کبھی سنا ہوتا ہے اور نہ کوئی خاص تصویر دیکھی ہوتی ہے..اور جب پہلی بار آپ کے میزبان نہایت سرسری انداز میں آپ کو مطلع کرتے ہیں کہ آج ہم ٹیراکوٹا میوزیم دیکھنے جائیں گے تو آپ کے اندر قطعی طور پر کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا..

اسی لیے جب آپ تین میں سے پہلے عظیم ہال میں داخل ہوتے ہیں اور ہزاروں قد آدم... جدا جدا شکلوں کے مٹی کے سپاہیوں کو صف آرا دیکھتے ہیں تو آپ کی احتیاط' لاپروائی' سنجیدگی اور دانشوری کے سارے فیوز بھک سے اڑ جاتے ہیں اور آپ میں روشنی نہیں رہتی..

یہ سپاہِ گِل آپ کے ہر احساس کو ہر حیرت کو شکست دے دیتی ہے..

تو جو سیاح پہلے ہال میں..ایک چھوٹے سے گاؤں کے سائز کے ہال میں داخل ہوتے ہیں تو وہ تھوڑے سے بے وقوف ہو جاتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کا ردعمل کیا ہونا چاہیے کہ وہ ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے....خاموشی اور حیرت سے حنوط ہو جاتے ہیں۔

باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی...

لیکن ہال کی چھت بے آواز تھی..

آپ ٹیراکوٹا میوزیم میں براہ راست اس پہلے ہال میں داخل نہیں ہوتے...

شہنشاہ چنگ کے اس پورے قصبے پر محیط زیر زمین مقبرے میں داخل ہونے سے پیشتر ایک مختصر سے عجائب گھر میں جاتے ہیں جہاں دو سنہری رتھیں گھوڑوں سمیت ایک ہزار برس کی قدامت کے سکوت میں کھڑی ہیں..انہیں جب دریافت کیا گیا تو یہ ہزاروں ٹکڑوں میں منقسم بوسیدہ حالت میں مٹی تلے دبی ہوئی تھیں..پھر چینی کاریگری اور ریاضت کے کئی برسوں نے انہیں جوڑا اور پھر سے ثابت اور زندہ کر دیا..

ان میں سے ایک رتھ سپہ سالار کی ہے..رتھ کے پہیے کانسی کے ہیں..ان پر ایک نشست رتھ چلانے والی کی اور اس کے پیچھے ایک سنہری چھتری تلے سپہ سالار کی نشست..
رتھ میں جتے ہوئے کانسی کے ہی چار شاندار گھوڑے..ہر گھوڑا حرکت کے ایک مختلف انداز میں..کوئی نتھنے پھلائے ہنہنا رہا ہے اور کوئی سکون سے کھڑا ہے..

شاہی رتھ کے دونوں پہیوں پر کانسی کا بنا ہوا ایک ڈھکا ہوا چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں صرف ایک چھوٹی سی چوکور کھڑکی ہے... یہ شہنشاہ کی محفوظ آماجگاہ ہے جس میں بیٹھ کر جنگ کا جائزہ لیا جا سکتا ہے..اس کے آگے بھی چار گھوڑے ہیں جو باگیں کھینچے جانے کے منتظر دکھائی دیتے ہیں..

اصلی زندہ سپاہیوں کی شکل شباہت سے مٹی کے سپاہی تخلیق کیے گئے تو ان شاہانہ رتھوں کے اور اصلی گھوڑوں کے بھی بت بنائے گئے تاکہ شہنشاہ اپنی ابدی نیند سے ذرا پہلے جب بیدار ہو تو فوری طور پر اپنی پسندیدہ رتھ میں سوار ہو جائے..اور بُت بنے گھوڑے زندہ ہو جائیں..

میں نے کبھی بھی ان دونوں رتھوں سے زیادہ مکمل..پُرشکوہ اور پُرجلال قدیم شواہد نہیں دیکھے..

شیشے کے بڑے شوکیسوں میں محفوظ ان رتھوں کے اردگرد سیاح اک حالتِ بے یقینی میں طواف کرتے رہتے ہیں..ان کی صناعی کی کشش انہیں دیر تک روکے رکھتی ہے..

رتھوں کا ہر گھوڑا ایک وینس ڈی میلو سے بڑھ کر متناسب اور زندہ دکھائی دیتا ہے..

رتھوں کے اس عجائب گھر سے نکل کر ہی آپ کو پہلی بار مٹی کے سپاہیوں کی فوج صف آرا نظر آتی ہے..

میرے لیے ہر سپاہی عجوبہ تھا..مکمل تخلیق..بھرپور شخصیت تھا..آپ تھوڑی دیر اس امر پر غور کریں کہ چونکہ ہر سپاہی ایک اصلی سپاہی کی نقل ہے تو ہزاروں میں سے کسی ایک تیرانداز کے چہرے کا تاثر..کسی زمانے میں بلکہ ایک ہزار برس پیشتر ایک سچ مچ کے زندہ انسان کا ہوگا... یہ سب زندہ تھے..انہی شکلوں کے تھے..ان سب کا وجود تھا..یہ مجسمہ

سازوں کے ذہن کے کرشمے نہیں ہیں.. یہ میری اور آپ کی طرح کے لوگ تھے.. جب آپ
اس حقیقت پر غور کرتے ہیں تو آپ کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک ٹھنڈک کی برفیلی لہر جنم لینے لگتی
ہے.. تو یہ سامنے کھڑا سپاہی جو شکل سے نوخیز لگتا ہے اور شکل کو بہادر بنانے کی کوشش میں ہے
تو یہ کون تھا... یہ فوج میں کیوں بھرتی ہوا.. کیا یہ کسی کی محبت میں گرفتار تھا.. یہ کیا کھاتا تھا.. کیا
موسیقی کا شیدائی تھا.. اور یہ کتنے برس زندہ رہا.. اس گھڑسوار کے بچے ہوں گے.. کتنے ہوں
گے.. جب شاہی مجسمہ ساز اس کو ماڈل بنا کر یہ مجسمہ بنا رہا تھا۔ ایک ہزار سال پہلے تو یہ کیا
سوچ رہا تھا.. کیا یہی کہ اپنا مجسمہ بنوانا کتنا اکتا دینے والا ئش ہے.. میری تو خیر ہے کہ میں ایک
غلام کی طرح ہوں لیکن بے چارے گھوڑے کو جو اتنی دیر سے کھڑا کر رکھا ہے۔ یہ کہیں یہیں
اپنے آپ کو فارغ نہ کر دے.. اور یہ شہنشاہ کے دل میں آئی کیا کہ پوری فوج کے مجسمے بنوا رہا
ہے.. کیا کرے گا ہمارے مجسّموں کو؟

ممکنات کا ایک وسیع سمندر ہے جس میں آپ ایک مرتبہ پھر غوطہ زن ہوتے ہیں..

یہ کیسا خیال ہے کہ آج کا کوئی حکمران ہم سب کے ہو بہو مجسمے بنوائے اور پھر آج
سے ایک ہزار برس بعد وہ کھدائی میں برآمد ہو جائیں تو 3000ء کا ایک سیاح میرے مجسمے
پر غور کرتا ہوا کیا سوچے گا...

میں اپنے گروپ سے بچھڑ چکا تھا.. لیکن اس میں گھبراہٹ اور سراسیمگی کی کوئی
بات نہ تھی۔ ہماری پیاری آسمانی آفت اور ریڈ گارڈ نے میوزیم کے اندر داخل ہوتے ہوئے
ہمیں یہ الٹی میٹم دے رکھا تھا کہ ہم سب بھیڑیں جہاں کہیں بھی ہوں، پورے تین گھنٹے بعد
واپس داخلے کے گیٹ کے قریب جمع ہو جائیں ورنہ... وہ ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی.. کیونکہ
شیڈول میں یہ بھی درج ہے کہ ٹیراکوٹا میوزیم کے بعد ہم جنت کے محل اور جھیلیں دیکھنے کے
لیے جائیں گے..

مٹی کے سپاہیوں سے آراستہ پہلے ہال سے باہر آتے ہیں اور جب دوسرے نسبتاً
چھوٹے ہال میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں بھی حیرتوں کے سلسلے منقطع نہیں ہوتے.. یہاں
گیلریوں پر کھڑے ہو کر آپ نیچے دیکھتے ہیں تو آثارِ قدیمہ کے متعدد ماہران گھوڑوں کو جوڑ

رہے ہیں جو شکستہ حالت میں دریافت ہوئے تھے.. ان کی تھوتھنیاں الگ پڑی ہیں اور بقیہ
جسم الگ کھڑے ہیں.. یہ کام صرف محبت اور عرق ریزی سے تکمیل کو پہنچا ہے.. ایک ماہر کے
لیے یہ سب سے بڑا اعزاز ہے کہ وہ آئندہ برسوں میں اس میوزیم میں کھڑے کسی ایک
گھوڑے کی نشاندہی کرے اور کہے... اسے میں نے جوڑا تھا..

مٹی کے سپاہیوں اور گھوڑوں اور ہتھیاروں کی یہ فوج جب تخلیق کی گئی تھی تو یہ
رنگین تھی.. ان میں رنگ بھرے ہوئے تھے.. ان کی وردیاں، چہرے اور گھوڑے سب قدرتی
رنگوں میں پینٹ کیے گئے تھے لیکن اب یہ رنگ اتر چکے ہیں اور وہ سادہ مٹی ہو چکے ہیں.. لیکن
اس کھدائی کے دوران ایک گڑھا ایسا تھا جس میں نکلنے والے تمام مجسّموں کے رنگ قائم
تھے.. سپاہیوں کے چہرے فروغِ مے سے نہیں، کسی مصوّر کے برش سے رنگین ہوئے تھے..
یہاں بھی ماہرین نہایت باریک برشوں کی مدد سے انہیں صاف کر رہے تھے..

تیسرے ہال میں.. اگرچہ برآمدوں میں شیشے کے شوکیسوں کے اندر چند نایاب
اور مکمل مجسمے محفوظ تھے لیکن درمیان میں ایک عجیب حیرت ناک منظر تھا.. جب ایک انتہائی
وسیع علاقے میں مٹی کی یہ فوج برآمد ہوئی تو صورتحال کچھ یوں تھی کہ کھدائی کرتے کرتے
بانسوں کی چھتیں دریافت ہوئیں۔ ان چھتوں کے نیچے یہ ہزاروں سپاہی کھڑے تھے.. یعنی
جب پوری فوج دفن کی گئی تو انہیں پہلے بانسوں کی چھتوں سے ڈھکا گیا اور پھر ان پر مٹی
ڈال کر انہیں نظروں سے اوجھل کر دیا گیا اور ان پر کھیت اگائے گئے.. اس تیسرے ہال
میں صرف یہ چھتیں دکھائی دے رہی تھیں اور ان کے نیچے جو مجسمے پوشیدہ تھے، انہیں وہیں
رہنے دیا گیا تھا.. البتہ کہیں کہیں سے کسی گھوڑے کا دھڑ یا کسی سپاہی کے بدن کا کوئی حصہ
نظر آتا تھا..

ان ہالوں میں روشنیوں کا تناسب اور امتزاج ایسا تھا کہ ماحول چین کی قدامت
میں سانس لینے لگتا تھا..

اہلِ چین کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ٹیراکوٹا آرمی کو دریافت کر کے اسے... اس
کے سپاہیوں اور گھوڑوں کو کسی اور شہر میں.. کسی میوزیم میں منتقل نہیں کیا بلکہ جس مقام پر وہ

برآمد ہوئے تھے' اس پورے علاقے کو لوہے کی کماندار بلند چھتوں سے ڈھک دیا تاکہ وہ موسمی تبدیلیوں سے بھی متاثر نہ ہوں اور ان کا قدیم ماحول بھی جوں کا توں برقرار رہے... جیسے پورے موہنجوداڑو یا ہڑپہ کو ڈھک دیا جائے.. ان کے اوپر چھت ڈال دی جائے... بے شک چینی کوشاں ہیں کہ وہ ایک سپر پاور کی حیثیت اختیار کر جائیں.. غربت کا خاتمہ کر دیں.. دریائے زرد کو قابو میں لے آئیں.. پانڈے کی نسل کو نابود نہ ہونے دیں لیکن ان کی ترجیح اوّل اپنے ماضی کو سنبھالنا ہے..

شاید انہوں نے پسماندہ اور افلاس زدہ رہنا قبول کر لیا لیکن اپنے ماضی کے کسی ایک پتھر.. ایک مورتی.. ایک زیور.. ایک تصویر.. خطاطی کے ایک نمونے.. یا ایک قدیم درخت سے جدا ہو جانا قبول نہیں کیا.. سوائے ثقافتی انقلاب کے چند روز پاگل پن کے..

اور ان کے برعکس ہم ہیں.. ہم نے متمول حیات اور بابر بہ عیش کوش کو پسند کیا.. اور اپنے ماضی کی ہر شے کو ناپسند کیا.. موہنجوڈارو کو کلرزدہ ہونے دیا.. ٹیکسلا کے یونانی آثار کی عظمت پر ایک سٹیڈیم تعمیر کرنے کی سعی کی جس میں ہم کبڈی کھیل سکتے تھے.. مہر گڑھ اور ہڑپہ کو ٹھیکریوں میں بدل جانے دیا.. گندھارا کے مجسموں کو یا تو سمگل ہو جانے دیا اور ان پر بہت ہی کرم کیا تو ان کی ناکیں توڑ کر بت شکن ہونے کی سعادت حاصل کر لی...

اپنی اپنی پسند اور اپنی اپنی ترجیح اوّل ہے...

مٹی کے سپاہی میرے سفرِ چین کا حاصل تھے...

میں اگر انہیں نہ دیکھتا تو چین کو نہ دیکھتا..

ان کے سامنے دیوارِ چین' شہرِ ممنوعہ اور ماؤزے تنگ کی کوئی حیثیت نہ تھی..

تیسرے ہال سے باہر آنے پر ہلکی پھوار نے چہرہ بھگو دیا.... اور یہ اچھا ہوا کہ باہر بارش ہو رہی تھی.. میں جو ماضی کے خمار میں تھا مجھ پر جب یہ ہلکا چھڑکاؤ ہوا تو میں ہوش میں آ گیا.... ورنہ مٹی کے سپاہی میرے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے...

"چینی دہقان جس نے مٹی کے سپاہی دریافت کیے"

ٹیراکوٹا میوزیم سے باہر... ابھی ہماری کوچ اور آسمانی آفت کی آمد میں کچھ وقت تھا اور وہاں ایک اور شہر آباد تھا...

اس شہر کا رزق مٹی کے سپاہیوں سے وابستہ تھا..

سینکڑوں دکانیں.. کھوکھے.. شوروم.. جن کے مالک اور مالکائیں.. مٹی کے سپاہیوں کے نقلی مجسمے... ان کی شبیہوں کی ٹی شرٹیں.. رتھوں کے سنہری نمونے.. اس عہد کے لباس' ٹوپیاں' ریشمی سکارف' کتابچے اور پکچر پوسٹ کارڈ تھامے غل کر رہے تھے.. ہر سیاح کو گھیر رہے تھے.. اسے نرغے میں لے رہے تھے..

جہاں کبھی صرف کھیت تھے.. وہاں مٹی کے سپاہیوں کی بدولت ایک شہر آباد ہو چکا تھا.. اور یہاں ایک نمائش گاہ تھی.. جہاں چینی دستکاریاں' قالین' فرنیچر' پنکھے' منی ایچر تصاویر سیاحوں پر ڈورے ڈالتی تھیں اور اس نمائش میں مٹی کے سپاہیوں کی دریافت اور تاریخ کے بارے میں رنگین باتصویر مہنگے رسائل اور کتابوں کے ایک سٹال کے پیچھے ایک ایسا بوڑھا اور تقریباً مخبوط الحواس شخص بیٹھا تھا جسے شاید اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے بیس پچیس برس پیشتر ایک افلاس زدہ دہقان کی حیثیت سے اپنے کھیت میں ایک کنواں کھودنے کے دوران زیرِ زمین دفن مٹی کی فوج کے پہلے سپاہی کو دریافت کیا تھا.. اور پہلے اپنے قصبے کے حکام کو.. اور پھر بیجنگ کو اطلاع کی تھی کہ جنابِ عالی.. یہ حقیر پُر تقصیر ایک کنواں کھود رہا تھا اور

اس جستجو میں زمین سے ایک سپاہی ایک گھوڑا برآمد ہو گیا ہے تو فدوی کیا کرے...

وہ اس لمحے کیسے جان سکتا تھا کہ اس کے کھردرے کنواں کھودتے ہاتھ دنیا کے آٹھویں عجوبے تک پہنچ گئے ہیں..

قدیم دنیا کے سات حیرت ناک عجوبے گنوائے جاتے ہیں... اور وہ سب کے سب... بابل کے معلق باغات یا سکندریہ کی بندرگاہ پر سایہ فگن رہوڈز کا مجسمہ یا یونانی دیوی کا کوئی مندر سب کے سب معدوم ہو چکے ہیں.. پھر گنتی پوری کرنے کے لیے ہم نے اپنی دنیا کے کچھ عجائبات کو ان میں شامل کر لیا.. اہرام مصر' دیوارِ چین' تاج محل وغیرہ.. لیکن اب یہ فیشن میں شامل ہے کہ آپ اپنے ملک میں دریافت ہونے والے کسی کھنڈر یا عمارت کے آثار کو فوری طور پر دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دے دیتے ہیں.. اور اس پر وہ عجوبہ بھی قدرے حیرت کا اظہار کرتا ہے.. ہم نے بھی تو شاہراہ ریشم کو.. جہاں سے شاہراہ ریشم کبھی نہیں گزری.. اس مقام کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دے دیا ہے... اس لیے کہ جہالت کی کوئی حد نہیں ہوتی..

لیکن مٹی کے سپاہیوں کی فوج کو کسی اشتہار کسی نامزدگی کی حاجت نہیں.. وہ اگر دنیا کا آٹھواں عجوبہ نہیں ہیں تو پھر باقی سات تو بالکل نہیں ہیں..

وہ دہقان.. جس کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ.. ایں ہمہ آوردہ تست... ایک نہایت مہنگے چینی قالین کے نیچے.. رنگین تصاویر سے مزین کتابچوں اور کیلنڈروں کے پیچھے براجمان تھا اور اس کے عین اوپر پوری دیوار پر محیط ایک تصویر تھی جس میں وہ مٹی کے سپاہیوں کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے.. ایک ماؤ کیپ میں.. کہ یہ کیپ ان دنوں ابھی متروک نہیں ہوئی تھی بلکہ ہر چینی اسے ایک احرام کی عقیدت سے اوڑھتا تھا.. اس تصویر پر بہ زبان انگریزی درج ہے کہ.. "وہ پہلا شخص جس نے دنیا کے آٹھویں عجوبے کو دریافت کیا۔"

یہ دہقان اب ایک نہایت متمول اور شہرت یافتہ شخص ہے..

دنیا کے ہر رسالے ہر کتاب میں اس کی تصویر چھپ چکی ہے.. "ٹائم" اور "نیوز ویک" کے پڑھنے والے بھی اس کی شکل سے واقف ہیں.. تمام چینی اور وہ بہت سارے اس بابے کو پہچانتے ہیں..

اب وہ ایک کموڈٹی ہے.. ایک برائے فروخت شے ہے.... اس کی موجودگی یوآنوں کی برسات کا باعث بنتی ہے.. اس لیے اس کے گرد زیادہ تر اس کی بیٹیاں یا نوخیز پوتیاں اور نواسیاں... اور یہ درجنوں کے حساب سے ہیں۔ ان بابا جی کی جانب اشارے کرتے ہوئے ہر سیاح کا گھیراؤ کر لیتی ہیں اور چینی انگریزی میں اس کا دماغ کھا جاتی ہیں کہ.. "سر... میڈم.. کیا آپ یقین کریں گے کہ یہی ہے وہ شخص... آپ کے سامنے زندہ اور اصل صورت میں.. سانس لیتا ہوا.. جس نے ٹیراکوٹا آرمی کو.. اپنے کھیت میں ایک کنواں کھودتے ہوئے دریافت کیا تھا.. کیا آپ صرف دو سو یوآن کا یہ تصویری کتابچہ خرید کر اس پر ان کے آٹوگراف لینا پسند نہیں کریں گے... یہ ہمارے دادا جان ہیں.. اور آپ ان کے برابر میں بیٹھ کر تصویر بھی کھنچوا سکتے ہیں' صرف سو یوآن میں.."

ایک گنجا ہوتا ہوا پُرکشش مہاندرے کا چینی دہقان.. اب ایک عالمی شہرت یافتہ شخص... آپ اس کے برابر میں جا بیٹھتے ہیں تصویر بنوانے کے لیے.. اور وہ ایک روبوٹ کی مانند اپنا ہاتھ بڑھا کر آپ کے کندھوں پر رکھ دیتا ہے اور ایک میکانکی مسکراہٹ اپنے لبوں پر طاری کر لیتا ہے.. کہ وہ دن میں سینکڑوں بار اس آزمائش سے گزرتا ہے صرف چند یوآنوں کی خاطر...

البتہ ہر قدیم دریافت یا تاریخی لمحے میں اولیّت کی سند حاصل کرتے ہوئے کچھ اور دعویدار بھی نمودار ہو جاتے ہیں اور رنگ میں بھنگ ڈال دیتے ہیں..

چنانچہ یہاں بھی یہ دریافت متنازع ہو چکی ہے..

کچھ اور دہقانوں یا ان کے ورثا کا کہنا ہے کہ جناب ایک کنواں صرف ایک شخص تو نہیں کھود سکتا.. ہمارے والد صاحب یا چچا حضور بھی تو اس لمحے کدال چلا رہے تھے... زمین کو کھود رہے تھے... پہلے مٹی کے سپاہی کو اپنی ہتھ ریڑھی میں ڈال کر یہ وہ تھے جو اسے باہر کی دنیا میں لائے تھے.. یہ صاحب خواہ مخواہ مٹی کے سپاہیوں کے مامے بن بیٹھے ہیں..

بہرطور میں نے مٹی کے سپاہیوں کے اس مامے کے برابر میں بیٹھ کر ایک تصویر اتروائی.. لیکن باتصویر کتابچہ مہنگے داموں خرید کر اس پر آٹوگراف حاصل کرنے کی فرمائش نہ

کی اور اس کی پوتیوں یا نواسیوں نے اس ''مفت بری'' کو پسند نہ کیا اور دوسرے پُراشتیاق سیاحوں کی جانب راغب ہوگئیں..

باہر بارش تھم چکی تھی اور ہوا رخساروں کو چھوتی ہوئی انہیں نمی کے ہلکے بوسوں سے نوازتی تھی..

وہی شہر جس کا رزق مٹی کے سپاہیوں سے وابستہ تھا.. دکانوں' سٹورز' میں .. کھوکھوں اور تھڑوں پر.. فٹ پاتھ پر لگی میزوں پر.. ہزاروں اقسام کے سیاحتی تحفے' یادگاریں اور مٹی کے سپاہی سجائے مخلوق نے ہم غیر ملکی بھیڑوں کو دیکھا تو ہم پر ہلّہ بول دیا..ان میں سے بیشتر کے ہاتھوں میں کیلکولیٹر تھے اور وہ ہر شے جس میں آپ ذرہ بھر دلچسپی لیتے تھے.. یونہی غلطی سے دیکھ لیتے تھے اس کی قیمت اس کی سکرین پر نمایاں کر کے آپ کے سامنے آئینے کی صورت دکھاتے تھے اور ''آئی گیو یو چیپ...'' کی گردان کیے چلے جاتے تھے..

چین میں دکانداری کا یہی قرینہ ہے کہ پہلے ایک شے کی قیمت کیلکولیٹر پر ایک ہزار یوآن ظاہر کی اور پھر فوراً ہی ''آئی گیو یو چیپ'' کہتے ہوئے اسے پانچ سو پر لے آئے..اور قیمت میں یہ تنزل تب تک جاری رہتا تھا جب تک آپ تنگ آ کر یا تو وہ شے خرید لیتے تھے اور یا پھر واک آؤٹ کر جاتے تھے...کچھ خواتین تو زلیخا صفت تھیں کہ پیچھے سے دامن پر ہاتھ ڈال دیتی تھیں..اور وفد کے اراکین میں سے صرف میں تھا جو تر دامن لیے پھرتا تھا۔ بقیہ پوِتر اور سوکھے دامنوں والے تھے..میں نے بچوں کے لیے چند ٹی شرٹس خریدیں جن پر مٹی کی فوج کے تیر انداز اور گھڑ سوار نقش تھے...

اس چھینا جھپٹی کے دوران ہم سب لوگ الگ الگ ہو چکے تھے..کوئی کہیں گھیراؤ میں تھا اور کوئی کہیں اس چینی ثقافتی یلغار کی زد میں آیا ہوا تھا..

البتہ لیو میرے ہمراہ تھا اور میرا دفاع کر رہا تھا..

''آپ کچھ اور خریدنا چاہتے ہیں؟''

''لیو...میں مٹی کے سپاہیوں کے کچھ مجسمے خریدنا چاہتا ہوں لیکن ان دکانوں میں جو نمونے ہیں وہ بہت معمولی کاریگری کے ہیں..کیا ان سے بہتر کوالٹی کے بُت نہیں مل سکتے؟''

لیو نے میرا ہاتھ تھاما اور ان سٹالوں اور کھوکھوں کی بھول بھلیوں میں سے ہوتا ہوا ان کے عقب میں لے گیا جہاں رونق نہ تھی.. بیشتر کھوکھے بند پڑے تھے..اس نے وہاں ایک گراں خواب چینی کو بیدار کیا جس نے سنبھلنے میں بہت دیر لگائی اور اسے کچھ کہا..وہ چینی گراں خوابی میں...سنبھلتے سنبھلتے ایک مقفل کوٹھڑی کو کھول کر اندر گیا..بہت دیر اندر رہا اور پھر چند مجسموں کے ساتھ برآمد ہوگیا..

مٹی کے سپاہیوں کے یہ مجسمے واقعی ہنرمندی کے بہترین نمونے تھے..

''تارڑ صاحب..ذرا دیکھئے کہ ان مجسّموں کے نیچے انہیں تخلیق کرنے والے کی مہر کا نشان ثبت ہے..اس شخص کا نام درج ہے...''

''کیا یہ ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں؟''

''نہیں..یہ انہیں سانچوں میں سے نکالتا ہے لیکن اس کے سانچے پورے علاقے میں سب سے اعلیٰ ہیں اور پھر یہ ان کی نوک پلک اپنے ہاتھوں سے درست کرتا ہے۔''

میں نے قیمت کو بھی مناسب جانا اور دو مجسمے خرید لیے اور میں یہ جانتا ہوں کہ میں نے کیسے ان ٹوٹ جانے والے آبگینوں کو پورے سفر کے دوران سنبھالا اور پاکستان تک لایا...

مٹی کے یہ دو سپاہی اب میرے لونگ روم کے ایک شیلف پر براجمان ہیں.. گندھارا کے بدھ' ایرانی صراحیوں' ایک سمرقندی نیلی پلیٹ' چند بے وقعت ٹیلی ویژن ایوارڈز اور ان سے زیادہ بے وقعت وزیراعظم کے ادبی ایوارڈ..سری لنکا سے لائے ہوئے سلجوق کے ہاتھیوں اور خوفناک نقابوں..عینی کے میڈلز اور سمیر کے آرکیٹیکچر کے سب سے بڑے ایوارڈ کے درمیان وہ بیٹھے ہیں اور پہرہ دے رہے ہیں..اور مجھے اس روز کی یاد دلاتے ہیں جب میں ان کے روبرو تھا..جب میں نے دنیا کا آٹھواں عجوبہ دیکھا تھا..

مٹی..مٹی میں..

اور راکھ..راکھ میں..

"ایک آبی باغِ ارم...سنگِ مرمر کی کشتی جو چاندنی راتوں میں رواں ہو جاتی ہے"

جہاں کھیت تھے وہاں اب ایک ٹورسٹ سٹی آباد ہے..سینکڑوں ہوٹل اور ریستوران ہیں..اتنا ہجوم ہے کہ سیاحوں کی بسوں کو پارکنگ کے لیے جگہ مشکل سے ملتی ہے..مٹی کیسے زندوں کا رزق بنتی ہے..

ہم اس شہر سے نکلے اور شی آن واپسی کے لیے ایک سیدھی سپاٹ بے آواز شاہراہ پر گامزن ہوئے جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے دونوں جانب تا حدِ نظر اناروں کے باغ پھیلے ہوئے تھے... پھوار پھر شروع ہو گئی تھی اور درختوں کی ہریاول میں سے ہزاروں انار سرخ سورجوں کی مانند طلوع ہوتے تھے..

ہم مٹی کے طلسم سے نکلے تو ان سرخ سورجوں کے اسیر ہو گئے...

لیکن بھلا ہو آسمانی آفت کا اس نے اپنی کرخت آواز سے اس جادو کو پاش پاش کر دیا۔"اب ہم ایک اور عجوبے میں جائیں گے...جس کے ایک باغ میں جہاں چینی شہنشاہ اپنی محبوباؤں کے ہمراہ قیام کرتے تھے...وہاں ایک جھیل کے کنارے ایسے روپوش محلات ہیں کہ آپ دنگ رہ جائیں گے..جھیل میں سنگ مرمر کی ایک کشتی ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ وہ چاندنی راتوں میں حرکت کرنے لگتی ہے....انہیں دیکھنے کے

لیے میں آپ کو صرف ڈیڑھ گھنٹہ دے سکتی ہوں..تا کہ ہم شی آن واپس پہنچ کر ڈنر کر سکیں..یاد رہے صرف ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر آپ سب نے واپس کوچ میں آ جانا ہے...سمجھے؟"

ہم سب نے سر ہلائے کہ ہاں سمجھے!

آسمانی آفت کی مردانہ کرختگی لیے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے تخیل کو مہمیز دی کہ یہ عورت اگر کسی کی بیوی ہے تو اس غریب کا کیا حال ہوگا..اگر کسی کی ماں ہے تو کیسی پتھر دل خونخوار ماں ہوگی..اور اگر آج سے بیس برس پیشتر جب یہ نسبتاً جوان ہوگی تو کیسی ہولناک ہم بستر ہوگی..

ہم میں سے ہر ایک جنت کے باغ میں جانے سے پیشتر شاہراہ کے کناروں سے جھانکتے انار کے باغوں کو رک کر..ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا..لیکن کسی میں حوصلہ نہ تھا کہ وہ آسمانی آفت سے اپنی خواہش کا اظہار کرے..

تب بزرگ شاعر اور بیجنگ سے شی آن پرواز کرنے کے دوران جنرل کے مرتبے پر فائز ہو جانے والے رکن نے ہاتھ کھڑا کر کے کہا"میرا دل گھبرا رہا ہے..سانس نہیں آ رہا..میں ایک انار کھانا چاہتا ہوں.."

آسمانی آفت نے مجبوراً کوچ ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا..اور دھاڑتی ہوئی بولی..

"صرف ایک منٹ کے لیے.."

باغوں کے باہر..شاہراہ کے کچے کناروں پر اناروں کے کریٹ سجائے چینی باغبان تھے..ہم کوچ سے اترے تو وہ قدرے پُر اشتیاق ہوئے لیکن جب ہم نے ایک بھی انار نہ خریدا..جنرل صاحب نے بھی یوآن نہ نکالے..اور صرف ایک تصویر کے طلب گار ہوئے تو وہ ایک خاموش مگر لعن طعن کرتی مایوسی کے ساتھ اپنے کریٹ ترک کر کے باغوں کے اندر چلے گئے...ہم سے خفا ہو گئے..اس لیے یہاں جو تصویریں اتریں' ان میں ہم ہیں اور اناروں کے کریٹ سامنے ہیں جیسے ہم پھل فروش ہیں..

"واپس.." آسمانی آفت نے کوچ میں سے پکارا۔"ایک منٹ ختم..."

ہم اپنے کیمرے سنبھالتے واپس آ گئے..ادھر ہم کوچ میں داخل ہوئے اور اُدھر

وہ چینی باغبان باغوں میں سے نمودار ہو کر اپنے کریٹوں کے قریب آ بیٹھے اور ہم سے بہتر اور فراخ دل سیاحوں کا انتظار کرنے لگے..

کوچ سٹارٹ ہوئی اور چند لمحوں کے بعد ایک ایسے مقام پر جا رکی جہاں بے شمار ٹورسٹ بسیں اور کوچیں رکی ہوئی تھیں...

ریڈ گارڈ آفت چونکہ متعدد وفود کے ہمراہ متعدد بار یہاں آ چکی تھی اس لیے اسے سوائے شیڈول کی پابندی کے اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ''ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر.. یہیں.. اسی مقام پر.. واپس!''

ہم کوچ سے اترے..

ہمارے آگے ٹکٹوں کے کاؤنٹر تھے جہاں آفت نے ہم سب کو قطار میں کھڑے کر کے ایک مرتبہ شمار کیا اور پھر ہمارے لیے ٹکٹ خریدے.. ان کاؤنٹرز کی چرخڑیوں میں سے لچک کر جب ہم پار ہوئے.. آگے گئے تو ٹیراکوٹا سولجرز کے عجوبے کے ہینگ اوور کے باوجود پھر سے گنگ ہو گئے...

ہمیں خدشہ ہوا کہ اگر چینی ہمیں اسی قسم کے مناظر میں باقاعدگی سے لے جاتے رہے تو ہم ہمیشہ کے لیے گونگے ہو جائیں گے.. ہم بولنے کی عادت بھول جائیں گے..

ایک سرسبز پہاڑی سلسلے کے دامن میں ایک مصنوعی جھیل کے پانی ٹھہرے ہوئے... ان میں بید مجنوں کی شاخیں ڈوبی ہوئیں.. محلات.. بارہ دریاں.. دالان.. حمام اور قدیم مجسمے اور عجیب شکلوں کے پتھر.. جھیل میں ایک سفید براق مجسمہ ابھرتا ہوا.. اتنا سفید کہ سنگ مرمر بھی اس کے مقابلے میں گدلا دکھائی دے... اس کے مقابلے میں شرمائے کیونکہ مجسمہ ایک دیدہ زیب عورت کا ہے اور قدرے ان ڈھکا ہے کہ اس کی سفید چھاتیاں نمایاں ہیں..

اگر یہ مجسمہ قد آدم ہوتا تو بھی خیر تھی۔ ہم ذرا آنکھ بچا کر آگے بڑھ جاتے لیکن وہ ایک دو منزلہ عمارت کی بلندی جتنا تھا اور ظاہر ہے اس کی چھاتیاں بھی اسی حساب سے بے حساب حجم کی تھیں.. اور انہیں درگزر کرنا ممکن نہ تھا..

اسی لیے کئی دوستوں نے اس کی تصویریں اتارنے سے اجتناب کیا کہ گھر واپس جائیں گے تو بچوں کو یہ تصویریں کیسے دکھائیں گے... جب وہ انہیں دیکھ رہے ہوں گے تو اپنا منہ کیسے دکھائیں گے...

عجیب برہنگی ہی اس سفید مجسمے کی سب سے بڑی کشش تھی...

مشرق کے مزاج میں ہمیشہ پوشیدگی رہی ہے.. مغرب سراسر ظاہر اور عریاں ہونا پسند کرتا ہے.. مشرق ''فاسٹنگ بدھا'' تراشتا ہے.. اجنتا اور الورا میں ہزاروں شاہکار تخلیق کرتا ہے لیکن وہ ان پر اپنا نام نہیں کھودتا.. مائیکل اینجلو پائیتا کے سینے پر ''مائیکل اینجلو آف فلارنس نے یہ مجسمہ تراشا ہے'' درج کر دیتا ہے.. تاکہ اس کا کریڈٹ کوئی اور نہ لے جائے..

مشرقی فنکار ایک شاہکار تخلیق کرتا ہے اور پھر اس کے پیچھے چلا جاتا ہے.. گمنام ہو جاتا ہے.. جب کہ مغربی فنکار اپنے شاہکار کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے..

اور چین تو مشرق کا منبع ہے.. جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے.. اس لیے چین میں پوشیدگی اور گمنامی ایک عقیدہ ہے.. کسی بھی عجوبے کو یکدم آپ کے سامنے ظاہر نہیں کیا جاتا.. کوئی شہرۂ آفاق محل ہو.. کوئی حیرت کدہ گلستان ہو اس کے داخلے کے عین سامنے کوئی دیوار ضرور ہو گی.. کوئی تختہ کوئی درخت ایسا ہو گا جو اسے چھپا رہا ہو گا.. یہ جان بوجھ کر کیا جاتا ہے... یکدم عریاں ہو جانا مشرق کو ناپسند ہے.. مشرق کی عورت کو بھی.

اسی طور یہ جنت آبی جس میں ہم داخل ہو رہے تھے' یہ بھی پوشیدہ تھی..

باہر... شاہراہ پر ٹریفک اڑتی جاتی تھی.. اور وہاں سے کسی بھی گزرنے والے کو یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ جو کنارا ہے جہاں بسیں اور کوچیں ہجوم کرتی ہیں.. اس کنارے کے اندر کہیں ایک آبی جنت ہے جو حضرت انسان نے اپنی مسرت کے لیے تخلیق کی تھی..

چنانچہ ٹکٹ کاؤنٹر سے اندر داخل ہوتے ہیں تو ایک ابدی سکون میں ڈوبی ہوئی ایک عجوبہ کائنات یکدم سامنے آ جاتی ہے..

ایک وسیع جھیل جس کے پانیوں میں سبز کائی کی تہیں ہولے ہولے سرکتی ہیں..

سکوت اور بدھ کے مزاج کے ٹھہراؤ میں گم.. بیدمجنوں کے درخت' سرخ بارہ دریاں..
محلات..اژدھوں کی مانند بل کھاتی فصیلیں' تالاب..فوارے..اور جھیل میں چینی شہزادی کا
سفید مجسمہ...اور اس عجائبِ آب وسنگ کو دیکھنے کے لیے ہمیں صرف ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت
دی گئی تھی..یہ مجموعہ آب وسنگ جسے ایک چہیتی ملکہ..کسی ممتاز محل کے لیے برسوں میں تعمیر کیا
گیا تھا' اسے ہم نے نوے منٹ میں فارغ کر دینا تھا..اگرچہ اسے صرف ایک چہیتی ملکہ کی
چاہت میں بنوایا گیا تھا لیکن شہنشاہ نے شاید اس کے اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے
دیگر کنیزوں اور محبوباؤں کی خوشنودی کے لیے بھی استعمال کیا..جیسے شاہ جہاں نے ممتاز محل کی
موت کے دکھ میں تاج محل تو بنوایا لیکن اس کے بعد ایک ایسا قصر بھی تعمیر کیا جو سراسر شیشے کا تھا
تا کہ وہ صرف اپنی بیگم کو بھولنے کی خاطر اس کی یاد سے ہرگز بے وفائی نہ کرتے ہوئے کسی
کنیز یا محبوبہ کے ساتھ محوِ اختلاط ہو تو قصر کے سب آئینوں میں وہ سب کچھ متحرک دیکھ سکے
جو اس لمحے متحرک ہو رہا ہوتا تھا..

شہنشاہ..چاہے چین کے ہوں یا ہند کے..اپنا غم اسی طرح بھلاتے ہیں..

ہمیں صرف نوے منٹ کی مہلت دی گئی تھی..

چنانچہ ہم اس جہانِ آب میں سے سرسری گزرے..

ایسے گزرے جیسے ملک الموت ہمارے تعاقب میں ہو..کیونکہ وہ آسمانی آفت
گیٹ کے باہر گھڑیاں گنتی ہماری منتظر تھی..اگرچہ یہ گمان ہے کہ ملک الموت اس کے مقابلے
میں نہایت خوش شکل ہوتا ہوگا...

تب میں نے دیکھا کہ تتلی جھیل میں ایستادہ سفید مجسمے کی بائیں چھاتی پر نہایت
بے حیائی سے بیٹھی پھڑپھڑا رہی تھی..

''اوئے...''میں صرف یہ کہہ سکا..

''اوئے..''اس نے جواب میں کہا اور اپنے پُرکشش مسکن کو چھوڑ کر میرے
قریب آ گئی..

''تم کہاں تھیں؟..پچھلی شب میں نے تمہیں اپنی کھڑکی سے چینی شہنشاہ کے

لبادے کی سلوٹ میں بیٹھے دیکھا تھا...اس کے بعد تم کہاں تھیں؟''

''میں یہیں تھی..تمہارے آس پاس...''

''نہیں تھیں تتلی..میں جب مٹی کے سپاہیوں کے عجائب گھر میں تھا تو تم کہیں
نہیں تھیں..''

''میں تم میں اور تمہاری حیرت کے درمیان پھڑپھڑا کر مٹی کے سپاہیوں اور
تمہارے درمیان جو خلوت تھی' اس میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھی..اگر تم اپنی حیرت سے باہر
آ سکتے تو میں کسی مٹی کے سپاہی کی پونی ٹیل پر بیٹھی تھی..کسی کمان میں تلے تیر کی نوک پر شبنم
کے قطرے کی مانند رقص کرتی تھی..اور کبھی کسی گھوڑے کے پھڑکتے ہوئے نتھنوں پر
براجمان اس کے ان گرم سانسوں کو محسوس کرتی تھی جو کب کے سرد ہو چکے تھے.تم نے غور
سے دیکھا ہی نہیں ورنہ میں تو وہاں بھی موجود تھی..''

''ویسے تتلی..یہ آپس کی بات ہے..تم کچھ کچھ دردِ سر بنتی جا رہی ہو جسے
انگریزی زبان میں کسی اور بدنی حصے کا درد بھی کہا جاتا ہے..جہاں میں جاتا ہوں تم چلی
آتی ہو..ہر جگہ موجود ہوتی ہو..''

''تمہارا اور میرا وجود ایک ہے تو جہاں تم ہو گے وہاں میں ہوں گی..کیا تم انکار
کر سکتے ہو کہ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ تم ہو جو کسی زمانے میں تتلی ہوا کرتے تھے یا میں
ہوں جو کبھی تارڑ ہوا کرتی تھی..''

''صحیح..''میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کر لی..

''میں چونکہ چینی نژاد تتلی ہوں..لی پو کے تخیل کی پروردہ ہوں' اس لیے میں اس
عجائباتِ آب وسنگ میں کئی بار پہلے بھی آ چکی ہوں...میں اسے جانتی ہوں.تم اس سیاحتی
معلومات کے کتابچے کو پڑھنا چھوڑو جو اس آبی جنت کے بارے میں تمہیں مہیا کیا گیا
ہے..''اس نے ڈانٹ کر کہا.''میں تمہیں ساتھ لے کر چلتی ہوں..اس کی سیر کرواتی ہوں..''

''صحیح..''میں نے پھر کہا..ہتھیار تو میں پہلے سے ڈال چکا تھا.

''اب یہ تصویر دیکھو جو ابھی ابھی اتری ہے..کیمرے کی قید میں ہے..تم اسے

بہت دنوں کے بعد دیکھو گے لیکن میں اسے ابھی دیکھ رہی ہوں.. اس میں تم اور تمہارے وفد کے اراکین جھیل کنارے' بارہ دریوں اور پُرشکوہ محلات کے پس منظر میں بید مجنوں کے ایک درخت کے پانی میں ڈوبتی ہوئی شاخوں کی قربت میں پوز بنائے بیٹھے ہیں.. اور قطعی طور پر جھیل کو یا اس قدیم منظر کو نہیں دیکھ رہے' صرف تصویر بنوانے کے لیے اتراتے ہوئے بیٹھے ہیں.. اس تصویر میں ایک تنومند کھچڑی بالوں والا لیل پوری ہے جو اپنی شاعری میں جھنگ دلیس کے تڑکے لگاتا ہے... تمہارا لیڈر ہے.. نہایت مدبر اور لیڈر لگنے کی کوشش میں اور اس کوشش کی اذیت میں.. ایک چینی نژاد لگتا مگر پنجابی دیہاتی مگر کھچرا کہانی کار ہے.. سفید ریش شاعر ہے.. جس کی شاعری کو اس کی مذہبیت نے معدوم کر دیا.. پھر یہ گیسو سنوارتا شاعر اور نقاد ہے جس کی ٹی شرٹ اُس کے موٹاپے کے لیے سم قاتل ثابت ہو رہی ہے.. جنرل ہے.. گیانی ہے.. الم ناک حسرت ناک ہے اور سب سے دلِ آزار تم ہو جو اپنی بے قابو توند سمیت پس منظر کے سحر میں زہر گھول رہے ہو.."

"شٹ اپ تتلی.. تمہارے لیے یہ مناسب نہیں کہ تم مجھ پر اور میرے معزز ساتھیوں پر ذاتی حملے کرو.. تم اپنی اوقات میں آ جاؤ اور محض ایک گائیڈ کے طور پر.. کہ یہ تمہاری سرزمین ہے... مجھے اس جنتِ آبی سے متعارف کرواؤ.. بس..."

"یہ جھیل' محلات' مجسّمے' فوّارے' حمام اور پہاڑیاں ایک شہنشاہ نے اپنی دل پسند محبوبہ کے لیے تعمیر کروائے تھے.."

"یعنی.. اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر..."

"یہ تم غریبوں کا احساس کمتری اور محرومی کا بہانہ ہے.. تم بتاؤ.. اگر تمہارے زیرنگیں پورا چین ہوتا.. جو اُن زمانوں میں پوری دُنیا تھی تو کیا تم اپنی محبوبہ کے لیے ایک ایسا ہی جنت کا ٹکڑا تخلیق نہ کرتے؟"

"شائد میں ایسا ہی کرتا.. لیکن اسے اتنا وسیع نہ بناتا کہ پون کلومیٹر دُور کسی جھاڑی کے پیچھے میری محبوبہ مجھ سے بے وفائی کر جاتی اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی." میں نے ہنس کر کہا..

ویسے عشق اور مذہب دو چیزیں ہیں جن کے لیے آپ قارون کا خزانہ بھی لٹا دیں

تو کوئی اعتراض نہیں کرتا..

جھیل کنارے بڑے بڑے مینڈکوں اور اژدھوں کے کائی زدہ مجسّمے تھے جو اس کے نگران اور محافظ تھے..

نہایت پُرشکوہ حماموں کی وسیع عمارتیں تھیں جو اتنی اچھی حالت میں تھیں کہ صرف پانی کی فراہمی سے اشنان کے لائق بنائی جا سکتی تھیں.. حمام اتنے بڑے تھے کہ ان میں ایک سے زیادہ محبوباؤں کے نہانے یا نہلانے کی گنجائش تھی.. حماموں کی دیواروں پر چینی خطاطی اور مصوری کے شاہکار آویزاں تھے.. تا کہ اپنا یا کسی کا بدن پونچھتے ہوئے بھی ذوقِ جمال کی آبیاری جاری رہے..

"تم اپنے بال دھونا چاہتے ہو؟"

ایک کائی زدہ پتھریلے ظاہر ہے قدیم فوّارے کے گرد.. تین چینی دوشیزائیں بال کھولے.. سر فوّارے کی دھار کے نیچے جھکائے.. اور اُن کی ہنسی اور جوانی کی بیبا کی رُکتی نہ تھی.. فوّارے کے اُبلتے پانیوں کے آگے سر جھکائے اپنے بال دھو رہی تھیں.. ایک چینی نوجوان بھی اپنے نوکیلے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں سے جھاگ نکال رہا تھا اور اُس کے چہرے پر شرمندگی تھی.. بہت سے لوگ ہاتھوں میں شیمپو کے پیکٹ تھامے اپنی باری کے منتظر تھے.. یوں لگتا تھا جیسے کسی شیمپو کے اشتہار کی فلم بندی ہونے کو ہے..

"یہاں قدیم زمانوں میں گرم پانیوں کا ایک چشمہ اُبلتا تھا.. جسے اب اس فوّارے میں قید کر لیا گیا ہے.. پانی اب بھی گرم ہیں.. یہاں جتنے بھی چینی سیاح آتے ہیں وہ اس کے پانیوں سے اپنے بال دھونا ایک فریضہ سمجھتے ہیں کیونکہ روایت کے مطابق' جو کوئی بھی اس گرم چشمے سے بال دھوئے گا.. اُسے من کی مراد ملے گی یا من کا مراد نصیب ہو گا.. تم بھی اگر فیض یاب ہونا چاہتے ہو تو نزدیکی سٹال سے شیمپو کا پیکٹ خرید کر اپنے بال دھو سکتے ہو."

"بسم اللہ تم کرو..."

"میں تو تتلی ہوں.. میرے تو رنگ دُھل جائیں گے"

"اور میرے بال اتنے چھدرے اور بے جان ہو چکے ہیں کہ انہیں اگر آبِ حیات

سے بھی دھویا جائے تو ان میں جان نہیں پڑسکتی.. یوں بھی ہم نے تن من دھویا.. بڑے پاپڑ بیلے.. بڑی تپسیا کی لیکن نہ من کی میل ڈھلی اور نہ مراد پوری ہوئی تو یہاں بال دھونے سے کچھ نہ ہوگا.تم آگے چلو ہمارے پاس وقت کم ہے..''

تتلی یہاں سے اُڑی تو اُڑتی گئی.. بلند ہوکر سرسبز پہاڑی کے اوپر جو ایک بارہ دری تھی' وہاں جا بیٹھی جہاں تک سینکڑوں کائی آلود سیڑھیاں جاتی تھیں.. چونکہ میں تو پرواز نہیں کرسکتا تھا اس لیے مجھے وہ سیڑھیاں سانس سمیٹتے درست کرتے ہونکتے ہوئے طے کرنی پڑیں.. میرے ساتھی اپنے گیسوؤں کو گرم چشمے سے مزید تابدار کرتی دوشیزاؤں کی تصویر کشی میں مصروف تھے... اُنہوں نے ایک نظر حماموں سے پرے بلندی پر جانے والی ان لاتعداد سیڑھیوں کو دیکھا تھا اور پھر اوپر جانے کا ارادہ موقوف کر دیا تھا..

اُوپر... بہت کم لوگ تھے..

یہاں سے اس آبی جنت کا پورا منظر قدموں تلے پھیلتا تھا..

یہاں ایک بارہ دری میں انقلاب چین کے اوّلیں برسوں کی نہایت نایاب تصاویر آویزاں تھیں.. یہ وہ مقام تھا جہاں کچھ عرصہ جنرل چیانگ کائی شیک.. تائیوان فرار ہونے سے پیشتر ماؤ کے حامیوں کی قید میں رہا تھا..

''چینیوں نے فارموسا کی بنیاد رکھنے سے پیشتر جب چیانگ کائی شیک اُن کی قید میں تھا تو اُسے کیوں آزاد کر دیا؟''

''اُس زمانے میں چیانگ اتنا برا نہ تھا.. اور نہ ہی چین کے مستقبل کی کوئی واضح تصویر کسی کے سامنے تھی.تم ان تاریخی تصویروں کو شتابی سے بھگتا دو کیونکہ تمہارے پاس ڈیڑھ گھنٹے کی جو مہلت تھی وہ کب کی خلاص ہو چکی اور اب میں دیکھ سکتی ہوں کہ بقول تمہارے وہ آسمانی آفت ایک زخمی شیرنی کی مانند اُس کوچ کے گرد چکر لگا رہی ہے جس میں تمہیں اِس لمحے ہونا چاہیے اور تم نہیں ہو..''

میں تیزی سے سیڑھیاں اُترتا.. اُن کی کائی پر قدرے پھسلتا.. نیچے جھیل اور محلات کی سطح پر آ گیا.. اور تتلی بھی اُسی رفتار سے میرے کاندھے کے ساتھ ساتھ اُڑتی ہوئی نیچے

آ گئی.. ہم آسمانی آفت کی ناراضی کے خوف میں تقریباً بھاگتے چلے جا رہے تھے.. جب ہم ایک پرانی منقش بارہ دری کے ستونوں کے بیچ میں سے گزرے تو اُس کے پہلو میں ٹھہری ہوئی سنگ مرمر کی وہ کشتی نظر آئی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ چاندنی راتوں میں رواں ہو جاتی ہے..

''تتلی.. تم اور وہ آفت ہم وطن اور ہم زبان ہو.. کیا تم اس کے دل کو پگھلا نہیں سکتیں.. میری سفارش نہیں کرسکتیں.. میں اس سنگ مرمر کی کشتی میں کچھ دیر بیٹھنا چاہتا ہوں.. صرف کچھ لمحے...''

''اُس کا دل اگر ہے تو وہ پگھل نہیں سکتا.. لیکن ہم دونوں کے دل تو ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر پگھل جاتے ہیں.. دل کی بات مانو.. میں بھی مانتی ہوں اور ہم دونوں اس کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں.. بے شک وہ ہمارے بغیر واپس شی آن چلی جائے.. مجھ سے شی آن کے راستے بھولے ہوئے تو نہیں.. آؤ..''

ہم دونوں جائے لینڈ کی کھلونا کاروں میں پہلی بار بیٹھنے والے بچوں کی اُبلتی مسرت ایسی بے قابو سرخوشی میں سرشار سنگ مرمر کی کشتی میں جا بیٹھے..

کشتی تو پتھر کی تھی.. کیسے رواں ہوتی..

''یہ حرکت کیوں نہیں کرتی؟''

''اس لیے کہ نہ چاندنی رات ہے اور نہ تمہارے برابر میں کوئی عشق خاص ہے..''

''میں اپنے عشق خاص کو امپورٹ کر کے یہاں تک تو نہیں لا سکتا..'' میں نے زچ ہو کر کہا..

''تو پھر یہ کشتی کبھی رواں نہیں ہو گی.. یونہی جامد اور پتھر کی رہے گی... میں اس لمحے کو قید کرنے کے لیے تمہاری تصویر اُتارتی ہوں.. پھر تم شتابی سے باہر پہنچو جہاں آسمانی بلا میری سفارش کے باوجود تم پر ایک قہر کی طرح نازل ہو جائے گی..''

''صحیح..'' میں نے کہا..

اگر شی آن میں صرف مٹی کے سپاہیوں کا عظیم مدفن ہوتا.. تو بھی یہ اہرام کے قاہرہ

کا ہم پلہ ہوتا.. تاج محل کے باوجود آگرہ کی برابری کرتا.. نیلی مسجد کی نیلاہٹ کے تکبر میں گم استنبول سے آنکھیں ملا سکتا.. لیکن یہاں تو مٹی کے سپاہیوں کے سوا... یہ جنتِ آبی اور یہ محلات بھی تھے... اور تب میں آگاہ نہیں تھا کہ شی آن کے دامن میں ابھی اور بھی عجوبے ہیں جو اُسے ان سب شہروں سے ممتاز کرتے ہیں..

لیکن تتلی جانتی تھی...

''تم بھی تو میرا عشق خاص ہو سکتی ہو..''

''کون میں؟'' تتلی کی شرماہٹ اُس کی پھڑ پھڑاہٹ میں تھی ''میں کیسے ہو سکتی ہوں؟''

''تم جانتی ہو کہ تم کیسے ہو سکتی ہو.. چاندنی رات نہ سہی.. تم سہی...''

تتلی شرماتی لجاتی پھڑ پھڑاتی اُڑی اور میرے ہونٹوں پر آ بیٹھی.. اور میری آنکھیں اُس کے لمس سے بند ہونے لگیں..

سنگِ مرمر کی کشتی رواں ہونے لگی..

''شامِ شی آن... میں بیٹھا پیتا رہا اور شام کا دھیان نہ کر سکا''

تتلی بے چاری پژمردہ اور تھکی ہوئی تھی' اتنی نڈھال تھی کہ اُس کے پروں پر پسینہ آیا ہوا تھا.. وہ میرے ہمراہ ٹیراکوٹا سولجرز کا مدفن دیکھ چکی تھی.. مٹی کے ہر سپاہی کے کندھے پر بیٹھ کر اُس کے ناک نقشے کا جائزہ لے چکی تھی کہ یہ کبھی زندہ لوگ تھے جن کے مجسمے بنائے گئے... اگر یہ اب زندہ ہوتے تو اتنے پُر تکبر ہوتے کہ کب یہ اُسے اپنے کاندھے پر بیٹھنے دیتے.. پھر وہ اناروں کے باغوں میں گشت کرتی ہوئی تادیر سنگ مرمر کی کشتی میں سوار اُس کے رواں ہونے کی منتظر رہی تھی.. اس لیے وہ تھکی ہوئی تھی..

اُس کے پروں پر جو پسینہ آیا ہوا تھا' وہ صرف تھکاوٹ کا نہیں شرمندگی کا بھی تھا..

وہ مجھ سے آنکھ نہیں ملاتی تھی..

میرے لبوں پر ابھی تک اُس کے پروں کے رنگ چمٹے ہوئے تھے.. اور وہ اُنہیں دیکھ رہی تھی اس لیے شرمندہ ہو رہی تھی..

شاید یہ پہلی بار تھا کہ اُس نے کسی نامحرم کا بوسہ لیا تھا.. صرف اس لیے کہ کشتی رواں ہو سکے..

ہم سب نڈھال تھے.. گرینڈ نیو ورلڈ ہوٹل کے کمروں میں جا کر ہمیشہ کے لیے سو جانا چاہتے تھے لیکن خشونت بھری آسمانی آفت نے پھر بھی ہمیں ایک پل چین نہ لینے دیا.. چین میں چین کہاں.. اُس نے خاور کے راستے ہمیں اطلاع کی کہ اب ہم ڈنر کرنے جا رہے

ہیں کہ یہی شیڈول ہے اور ہمیں اُسی نڈھال اور نیم مردہ حالت میں کوچ میں پیک کر کے.. پتہ نہیں کدھر اور کہاں روانہ ہو گئی..

کہاں روانہ ہو گئی.. یہ ہم ہرگز نہ جانتے تھے اور نہ ہی اُس نے بتانے کی زحمت گوارا کی..

یاد رہے کہ چین میں ڈنر کا سرکاری وقت چھ بجے شام ہوتا ہے..

ایک طویل سفر کے بعد ہم شہر کے مضافات میں واقع ایک عجیب ہنگامہ پرور.. شور شرابے والے بلکہ شور شراب والے ریستوران کے احاطے میں داخل ہوئے.. آفت ہمیں اس کی روشن راہداریوں میں سے ہانکتی ہوئی ایک پرائیویٹ اور بند طعام گاہی کمرے میں لے گئی..

اس وسیع ریستوران میں درجنوں ایسے پرائیویٹ کمرے تھے جن میں شی آن کے شہری اپنے دوست احباب.. خاندانوں.. اور خاتونوں کے ہمراہ کھانے سے کم اور پینے سے زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے.. یہاں بھی اُسی تے آو اور نہائت واہیات شراب کی بُو تھی جو بقول خاور چینیوں کی از حد پسندیدہ تھی.. میری ناک اگرچہ کونی آک' وہسکی یا پھر وائن کی مہک سے تو آشنا تھی اور اگر وہ حد سے تجاوز نہ کرے تو اُس مہک کو ایک حدت آور گرم ماحول کے لیے معاون سمجھتی اور پسند کرتی تھی لیکن یہ ناک اس چینی شراب کی بُو سے سمجھوتہ نہ کر سکی.. عادی نہ ہو سکی.. ہمیشہ بے حد ناگوار گزرتی..

اُس پرائیویٹ طعامی کمرے میں وارد ہو کر آسمانی آفت نے ہم سے مشورہ کیے بغیر اپنی من مرضی سے بے شمار خوراکوں کا آرڈر دیا جن کے بل کا بوجھ حکومت چین کے کندھوں پر تھا اور پھر اُن خوراکوں کی درجنوں طشتریوں کی آمد پر ایک الگ میز پر... خاور، لیو اور وانگ لی کے ہمراہ اُن خوراکوں پر پل پڑی اور نہایت خشوع و خضوع سے اُنہیں نوش کرنے میں مشغول ہو گئی.. آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ معزز مہمانوں پر کیا گزرتی ہے..

اور ہم پر یہ گزری کہ.. ہم نے ہر خوراک کو دیکھا.. ناک قریب لے جا کر سونگھا..
قوتِ شامہ نے فوری احتجاج کیا.. کسی نے صرف سونگھا اور کسی نے ایک لقمہ لیا اور پھر اُبلی

ہوئی مچھلی کے شوربے کے ساتھ ڈبل روٹی کھائی اور پھر شانت ہو گیا....

میں زیادہ شانت نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے چپکے سے اُٹھا اور غُل مچاتے چینیوں کے کمروں سے گزرتا.. ناگوار شراب کی بُو برداشت کرتا نیچے ریستوران کے لاؤنج میں اُتر آیا.. نیچے.. لاؤنج کے ایک کونے میں.. پوشیدہ.. ایک بجھی بجھی روشنیوں والا شراب خانہ ہے جس میں کوئی بھی مے خوار دکھائی نہیں دیتا صرف ایک ساقی نظر آتی ہے جو مسکراتی اور اٹھلاتی نظر آتی ہے.. اور ساقی ایسی ہے کہ اُسے دیکھ کر عدم یا ریاض خیر آبادی کی خُمریات یاد آتی ہیں..

خمار چیز کی مقدار پر نہیں موقوف.. شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا... مسئلہ صرف یہ ہے کہ اگر ساقی اپنے ہاں کا ہے تو اُس کی آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی ہوں گی اور اُن کے کٹورے شراب سے بھرے بھی اتنے بڑے ہوں گے اور مے گساروں کی تشفی ہو جائے گی لیکن یہاں ساقی چینی تھا جس کی آنکھیں ترچھی اور مختصر اتنی تھیں کہ اُن میں ایک آنسو کے سمانے کی بھی گنجائش کم کم تھی تو اُن میں شراب کے کتنے قطرے سما جائیں گے..

بہر حال میں نے سوچا کہ اس ساقی سے نظر ملائی جائے.. آسمانی آفت کے غم کو بھلایا جائے اور کچھ مذاکرات کیے جائیں.. اب وہاں پہنچتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس چینی ساقی کو کراچی کے گیسو دراز شاعر پہلے سے ہی اپنے سحر میں گرفتار کیے بیٹھے ہیں اور اُس کے ساتھ مابعد الطبیعیاتی اور ساختیاتی تنقید کے بارے میں مذاکرات کر رہے ہیں.. مجھے ناگہانی طور پر وارد ہوتے دیکھا تو اُنہوں نے اپنے گیسو جھٹک کر نہایت محتاط انداز میں ناپسندیدگی کو عیاں کیا کہ بھائی میاں تم رنگ میں بھنگ ڈالنے کو کہاں سے آ ٹپکے...

اب چونکہ میرے پاس کچھ بھنگ تھی تو میں کیا کرتا.. کسی نہ کسی کے رنگ میں تو ڈالنی تھی.. بہر حال میں قدرے کھسیانا ہو کر اپنی بھنگ کو کسی اور کے رنگ میں ڈالنے کے لیے ایک صوفے پر دراز ہو کر سگریٹ پینے لگا اور سامنے میز پر روشن ایک موم بتی کو نہایت انہماک سے دیکھنے لگا جیسے میں نے آج تک کسی موم بتی کو روشن دیکھا ہی نہ تھا..

گیسو دراز نہایت انہماک سے اپنی کارکردگی میں مشغول رہے.. اور میں اُن کی

کارکردگی بلکہ کاریگری کا قائل ہوگیا..موصوف اگرچہ میرے ہم عمر تھے لیکن چین میں جہاں کہیں بھی اُنہیں صِنف نازک کا شائبہ ہوتا' وہاں اپنے بالوں کو سنوارتے..عینک سنبھالتے.. ٹائٹ ٹی شرٹ میں سے بغاوت کرتے پیٹ کو ذرا سانس روک کر روکتے..سر جھکا کر نہایت عاجزی سے ایک یتیم مسکراہٹ کے ساتھ' بے حد نرم اور التجائی آواز میں ایک مکالمے کا آغاز کر دیتے..اور مجھے اس حقیقت سے کوئی مفر نہیں ہے..مجھے اس کا اظہار کرنا ہوگا کہ.. مدمقابل خاتون ہمیشہ پسیج جاتیں..البتہ خاتون کے پسیجنے کی حد پر وہ رُک جاتے کیونکہ اس کے پار جو تحرک درکار تھا' وہ میری طرح اُن میں بھی نابود ہو چکا تھا..چنانچہ وہ جہاں بھی جاتے ایک داستان کی بجائے پسیجی ہوئی خواتین کا ایک انبار چھوڑ آتے..میں اپنا غیر مرئی ہیٹ اُتار کر اُن کی عظمت کو سلام کرتا ہوں..

میرے اور اُن کے علاوہ جو بھیڑیں تھیں وہ بھوک سے ناتواں باں باں کرتی جب نیچے لاؤنج میں آئیں تو اُنہیں کوچ میں ٹھونس کر واپس "گرینڈ نیو ورلڈ ہوٹل" کی لابی میں ہانک دیا گیا..

تتلی کے پروں میں سے بھی اُس چینی شراب کی متلی آور بو آ رہی تھی..اس لیے میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ کم از کم آج کی شب میرے کمرے میں نہ گزارے..

"لیکن میں نے تو نہیں پی.." اُس نے روہانسی ہو کر کہا..

"تو میں نے پی ہے؟" میں نے اُسے ڈانٹا۔ "چلو باہر.."

"نہیں آج کی شب میں تمہارے پاس گزاروں گی۔ پچھلی شب شہنشاہ کے مجسمے کے لبادے میں جو سلوٹ تھی اُس میں نیند نہیں آئی تھی.." وہ کمرے میں کچھ دیر کسی مناسب آماجگاہ کی تلاش میں اُڑتی رہی اور پھر ایک ایش ٹرے کے کنارے پر اُتر کر پَر سمیٹ لیے.. میں نے ٹیبل لیمپ آف کیا اور بستر پر دراز ہوگیا..اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ ابھی تک روشنی پھیلی ہوئی تھی..میں نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر نگاہ کی..شاید کوئی لائٹ جلتی رہ گئی ہے..نہیں.. ایسا نہیں تھا بلکہ چینی شہنشاہ اور اُس کے سپہ سالار اور سپاہیوں کے مجسموں کو سر سے پاؤں تک

منور کیا گیا تھا..فلڈ لائٹس سے اُنہیں یوں روشن کیا گیا تھا کہ میرے کمرے میں بھی شب نہ تھی۔ دن کی روشنی کا سماں تھا..اور میری پرابلم یہ تھی کہ مجھے اندھیرے میں سونے کی عادت ہے..ایک شمع بھی روشن ہو تو وہ مجھے ڈسٹرب کرتی رہتی ہے چنانچہ میں اُٹھا اور کھڑکی کے قریب جا کر پردے کھینچنے سے پیشتر چینی شہنشاہ کو بری طرح گھورا..وہ تقریباً میری کھڑکی سے ناک لگائے میرے کمرے میں جھانکتا تھا..

"تم کہیں جا نہیں سکتے.." میں نے زچ ہو کر کہا "جاؤ جا کر تم بھی وہ بدبودار شراب پیو اور شی آن کی گلیوں میں گھومو.."

شہنشاہ تھا لیکن زبان نہیں رکھتا تھا۔ گنگ کھڑا رہا..میں نے پردہ برابر کر دیا اور پھر بستر پر آ لیٹا۔ کمرے میں اتنی ہی روشنی تھی جتنی پردے برابر کرنے سے پیشتر تھی...کچھ فرق نہیں پڑا تھا..میں بے حد بیزار ہوا۔ کمبل سے منہ سر لپیٹ کے تاریکی تخلیق کرنے کی ناکام کوشش کی اور کروٹیں بدلتا رہا..

"نیند نہیں آ رہی؟" تتلی ایش ٹرے کی بجائے اب میری باٹا کی چپل پر آ بیٹھی تھی..

"نہیں.." میں نے ایک اور کروٹ بدلی..وہ اُڑ کر میری ناک کے عین سامنے کمبل پر آ بیٹھی "نہ مجھے کسی غیر بدن کی اپنے بستر میں موجودگی سے نیند آتی ہے اور نہ کسی روشنی کے ایک ذرّے کی موجودگی سے..."

"تو پھر تم شی آن کی شام میں کیوں نہیں چلے جاتے..وہاں سب بیدار ہیں اور تمہارا انتظار کر رہے ہیں..یہاں بیزار ہونے سے فائدہ.."

میں نے کل شام..بلکہ کل رات شی آن کا ایک انوکھا رُوپ دیکھا تھا..رات دس بجے کے قریب منرل واٹر کی ایک بوتل خریدنے کی خاطر ہوٹل سے باہر آیا..اگرچہ منرل واٹر کی متعدد بوتلیں کمرے کی منی بار میں موجود تھیں لیکن بے حد مہنگی قیمت کی تھیں چنانچہ چند یوآن بچانے کے لالچ میں ہوٹل سے باہر آیا..تمام سٹورز' دکانیں اور ریستوران وغیرہ بند ہو چکے تھے لیکن فٹ پاتھوں پر روشن اور زندگی کی فکرمندیوں سے آزاد ایک اور شی آن آباد ہو چکا تھا...وہاں کرسیاں سجی ہوئی تھیں..عارضی ہوٹل اور خوراکوں کے خوانچے وجود میں

آ چکے تھے..اہل شی آن کی بھیڑ اتنی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور کم ہی چہرے ایسے تھے جن پر ہنسی اور مسکراہٹ نہ ٹھہرتی تھی..خوردونوش کی ہر شے دستیاب تھی..ظاہر ہے آج رات بھی شی آن میں یہی پُرمسرت تبدیلی آ چکی ہوگی..

"گڈ آئیڈیا ڈارلنگ بٹرفلائی.." میں چھلانگ مار کر بستر سے باہر آ گیا..

"لیکن اکیلے نہ جانا..."

"قطعی نہیں.تم میرے ساتھ ہوگی..ایک سویٹ ہارٹ کے طور پر..کیونکہ تم نے سویٹ ہارٹ ہونے کی ابتدائی منزل تو طے کر لی ہے' میرے ہونٹوں پر ایک پھڑپھڑاتا ہوا بوسہ دے کر.."

اس بار تتلی نہ شرمائی نہ لجائی۔بڑے اعتماد سے کہنے لگی "وہ میں نہ تھی.."

"تو پھر کون تھی.."

"میرے پروں میں کسی اور کا دل دھڑکتا تھا..میرے لبوں پر کسی اور کی خواہش تڑپتی تھی..میں تو فقط ذریعہ تھی..میں نہ تھی.."

"تو کون تھی؟"

"کیا پتہ..معمول کیا جانے کہ اُس کے ذریعے کون عمل کر رہا ہے..کوئی زرد شہزادی..کوئی شاہ گوری..کیا پتہ.."

"اب کوئی زرد شہزادی یا شاہ گوری تو شی آن کی اس شام میں آنے سے رہی.تم ساتھ چلو.."

"میں تو ہوں گی.لیکن میری موجودگی کے باوجود تم اکیلے ہوگے..اکیلے نہ جانا"

اب میں نے سوچا کہ وفد کے اراکین میں سے کون ایسا ہے جو پہلو میں دل زندہ رکھتا ہے..

تب میں نے عمر رسیدہ شاعر جو ایک فلائٹ کے دوران جنرل کے رُتبے پر فائز ہو چکے تھے..اُن کو فون کیا تا کہ اُن کی امداد حاصل کی جا سکے..کھلا یہ کہ وہ بزرگ بھی اپنے بستر میں کروٹیں بدلتے بے چین ہوئے جاتے تھے اور یہی چاہتے تھے کہ کوئی اُن کی امداد کو پہنچے..

"سر..آئی ایم سوری ٹو ڈسٹرب یُو..لیکن میری تتلی کہہ رہی ہے کہ باہر شی آن کی شام جوان ہے..تو آپ چلیں گے؟"

"ہیں؟ کیا کہہ رہے ہو تارڑ.." اُن کی آواز یکدم جوان ہوگئی "تو وہ تمہارے کمرے میں ہے..یوناٹی بوائے.."

"کون میرے کمرے میں ہے سر؟"

"وہی اُس ریستوران میں جو بار تھی..اُس میں جو تتلی تھی.."

"نہیں سر.."

"تو پھر کوئی اور تتلی پکڑ لائے ہو اور ہمیں خبر ہی نہیں ہونے دی..یوناٹی بوائے.."

"سر.." میں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا "یہ ایک اور تتلی ہے اور سچ مچ کی تتلی ہے جسے آپ نہیں جانتے..بہر حال اگر باہر چلنے کا موڈ ہے تو نیچے لاؤنج میں تشریف لے آئیے.."

"یار.." وہ ہنسنے لگے..یعنی فون پر اُن کی ہنسی کی آواز آنے لگی "یہ اپنا لیڈر تو ناراض نہیں ہوگا..آخر قومی عزت اور وقار کا مسئلہ ہے"

"سر..لیڈر تو اس لمحے خوابِ خرگوش میں مبتلا ہوگا اور خرگوشوں کے ساتھ اپنی چینی آزما رہا ہوگا..آ جائیں"

چنانچہ وہ آ گئے..

ہم ہوٹل سے باہر آ گئے..

ہوٹل کی بیرونی دیوار کے ساتھ فٹ پاتھ پر ایک شی آنی مصور نے گیس لیمپ کی روشنی میں اپنے فن پارے سجا رکھے تھے..اُس کی تصویروں میں قدیم چین کی جھلکیاں بھی تھیں اور کہیں کہیں وہ روایت سے باغی بھی ہوتا تھا..اُس نے نہایت نرم اور خوشگوار لہجے میں ہم دونوں کو اپنی تصویریں دکھانے کی دعوت دی..میں نے اُس کی جدید اور تجرباتی مصوری کے نمونوں کو زیادہ پسند کیا تو وہ کہنے لگا..اور وہ سیاحوں کو پھانسنے کے لیے تھوڑی بہت انگریزی سیکھ چکا تھا "مجھے بھی ذاتی طور پر مصوری میں روایت سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کہنا..اپنے ہی انداز میں..بے شک اُسے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے..زیادہ پسند ہے..لیکن کیا

کروں جو بھی چین آتا ہے' وہ ہزار برس پہلے کے چین میں آتا ہے اور صرف پگوڈوں' گھوڑوں'
جھیلوں اور قدیم شہزادیوں کی تصویریں ہی خریدنا چاہتا ہے.. مجبوراً میں اُن کے لیے.. سیاحوں
کے لیے اسی نوعیت کی عامیانہ تصویریں.. دل پر جبر کر کے بناتا ہوں.. کیا کروں..''

اگرچہ ہم نے اُس کی کوئی تصویر نہ خریدی لیکن وہ ہم سے خوش تھا..

شی آن واقعی شام میں جی اُٹھا تھا..

دن میں اُس پر سکائی سکریپر' سپر سٹورز' شاہراہیں اور اُن پر رواں ہزاروں کاریں
لاکھوں مصروف لوگ حاوی تھے.. اور وہ اُن کے بوجھ تلے سسکتا تھا.. سانس نہ لیتا تھا..

لیکن اب.. وہ جی اُٹھا تھا..

عارضی ریستوران... فٹ پاتھوں اور گلیوں میں آباد.. چائے خانے.. گیس کے
ہنڈولے.. بے پناہ رونق.. خوراک کی خوشبو.. شراب کی مہک.. غیر ملکی سیاحوں کے قہقہے..

شی آن کی ایک اور بھی خصوصیت تھی..

یہاں بھی چین کے دیگر شہروں کی مانند مقامی مسلمانوں کی واضح موجودگی اور اُن
کی جدا ثقافت کی روانی کا احساس ملتا تھا.. لیکن ایک فرق کے ساتھ.. شی آن پر مسلم ثقافت
کی چھاپ بہت گہری تھی.. کہا جاتا ہے کہ ایک چینی شہنشاہ کا تاج و تخت خطرے میں پڑ گیا اور
اُس نے ترکستان کے چینی مسلمانوں سے مدد کی درخواست کی... اور وہ اُس کی مدد کو آ گئے اور
صرف اُن کی سپاہ کی بے جگری اور اعانت کے باعث وہ اپنی شہنشاہیت کا دفاع کر سکا..

چنانچہ تشکر اور انعام کے طور پر اُس نے مسلمانوں کو چین کے سب شہروں میں
آباد ہونے کا پروانہ جاری کر دیا.. چین کے ہر شہر میں کہیں نہ کہیں دکانوں اور گھروں پر
''یا اللہ'' اور کلمہ شریف کے سٹکر چسپاں نظر آتے ہیں اور یہ لوگ ترک یا کرغیز نہیں ہوتے
خالصتاً چینی ہوتے ہیں... بقیہ آبادی کی نسبت متموّل اور خوش حال ہوتے ہیں.. کیونکہ
کاروبارِ ریشم کے علاوہ گوشت کا کل بیوپار اور بہترین ریستوران اُن کی ملکیت میں ہیں..
شی آن کی ثقافتی زندگی اور رونق اُن کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی.. بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا
کہ شی آن کا موسم مسلمان ہے... اور اگر شی آن میں مسلمان نہ ہوتے تو یہ شی آن نہ ہوتا..

یہی چینی مسلمان... دنیا کے دیگر پیٹو مسلمانوں کی مانند کھانے پینے کے بے حد
شوقین ہیں.. بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کھانے کے ساتھ ساتھ پینے کے بھی شوقین
ہیں.. چنانچہ شی آن کی شام میں جتنے بھی فٹ پاتھی ریستوران اور طعام گاہیں عارضی طور پر
وجود میں آئی تھیں وہ سب کی سب مسلمان برادران.. یا خواہران کی کاوشوں کا ثمر تھیں...

ہم دونوں.. عمر رسیدہ شاعر اور میں..

یا شاید ہم تینوں.. عمر رسیدہ شاعر.. اور میں.. اور تتلی.. جب شی آن کی شام میں
مٹر گشت کر رہے تھے تو مخالف سمت سے نہایت خوبرو.. دو لمبی ٹانگوں والی.. مناسب میک
اپ اور نامناسب لباس میں اَن ڈھکی لڑکیاں چلی آ رہی تھیں..

ہم رُکنا چاہتے تھے اور پوچھنا چاہتے تھے کہ کلمہ سناؤ.. لیکن نہ رُکے.. اور وہ رُک گئیں..

نہایت ہی شستہ اور شیریں اور شائستہ ذہن بچیاں تھیں جو بڑی ہو گئی تھیں اور
ضرورت سے زیادہ بڑی ہو گئی تھیں.. اور انگریزی بھی جانتی تھیں..

''ہیلو..'' اُن میں سے ایک نے نہایت گیت گاتی مترنم آواز میں کہا..

''ہیلو..'' عمر رسیدہ جنرل اپنی موٹے شیشوں والی عینک درست کرتے اُن کے
بہت ہی قریب ہو گئے..

اُن کے جواب میں میرا ''ہیلو'' قدرے گھگھیایا ہوا تھا کہ وہ بے حد پُرکشش تھیں..

''تم کہاں کے ہو؟''

''پاچستان...'' ہم دونوں نے سینہ پھلا کر کہا..

''فرینڈز..'' اُنہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم سے دست پنجہ لیا... اور وہ ایسا
کر سکتی تھیں کیونکہ اُن کے بدن بھی گرم تھے.. اور ادھر ہم کب کے سرد ہو چکے تھے بلکہ عمر کی
یخ بستگی میں حنوط ہو چکے تھے.. مصری ممیوں کی طرح اگر ہمارے بدنوں پر لپٹی پٹیاں اُتار بھی
دی جاتیں تو نیچے سے کچھ نہ برآمد ہوتا..

ہم دونوں اُن بچیوں کو چین پاکستان دوستی کے موضوع پر ایک مربوط لیکچر دینے
کے موڈ میں تھے جب اُنہوں نے وقت ضائع کرنے کی بجائے براہِ راست ہی پوچھ لیا

''آپ سونا پسند کریں گے؟''

''نہیں جی..ہم ہوٹل سے نکلے ہی اس لیے تھے کہ نیند نہیں آ رہی تھی..سو نہیں سکتے..''میں نے کہا..

عمر رسیدہ ذرا گھاگ تھے۔اُن کی آنکھوں میں چمک آ گئی ''کس کے ساتھ؟''

''ہمارے ساتھ..''

نہایت ہی واہیات اور مخرب الاخلاق بچیاں ثابت ہوئیں..

ویسے وہ اتنی دل کش اور معصوم طبیعت دکھائی دیتی تھیں کہ اُن کی پیشکش رد کرتے ہوئے بے حد دُکھ ہوا..

جب ہم اُنہیں مسترد کر کے پھر سے چلنے لگے تو میں نے جنرل صاحب سے کہا ''کتنی خوبرو اور سلجھی ہوئی خواتین تھیں..دو چار سو یوآن خرچ کر دیتے تو کیا حرج تھا..''

''کوئی حرج نہ تھا'' جنرل صاحب ہنسے اور ہنستے چلے گئے ''لیکن اس کے بعد کیا کرتے..معذرت؟''

''ہاں سر..واقعی ہم اُنہیں صرف چینی شاعری تو نہیں سنا سکتے تھے..لیکن..دے وَر پریٹی..وَیری پریٹی..''

ہم یونہی اس شامِ شی آن کے لطف میں چلتے چلتے ایک فٹ پاتھی ریستوران کی کرسیوں پر بیٹھ گئے..

تمام فٹ پاتھ آباد تھے..

جرمن سیاحوں کا ایک گروپ تھا جو چاپ سٹکس سے نوڈلز کھانے کی مشق کر رہا تھا اور چینی بیئر کو پانی کی طرح پی رہا تھا..نہیں پانی کی طرح نہیں کیونکہ اتنا ڈھیر سارا مٹکوں پانی پینا تو ممکن ہی نہیں..لیکن جرمن بنیادی طور پر ایک بیئر ڈرنکنگ قوم ہے اور اُن پر میونخ کی بیئر کے بعد کسی اور بیئر کا اثر پانی کی طرح ہی ہوتا ہے..

وہاں صرف سیاح ہی نہیں تھے..چینی نوجوان اور لڑکیاں بھی تھے جو شامِ شی آن کے سحر میں شوخ ہوئے جاتے تھے..

دو سر اسر اجنبیوں کو اپنے درمیان پا کر اُن کے چہروں پر رونق آ گئی..وہ یوں بھی رونق میلے کے لیے ہی آئے تھے..

وہ ہم سے مخاطب ہو کر بے تحاشا چینی بولے چلے جاتے تھے اور اُن کی سرخوشی میں شامل ہوتے ہوئے ہم مسکراتے تھے..کندھے سکیڑتے تھے اور پنجابی میں کہتے تھے..اوئے ساہنوں چینی نئیں آ ؤندی..لیکن زندگی میں کچھ شامیں ایسی بھی ہوتی ہیں اور شام شی آن اُن میں سرفہرست تھی جب سب زبانیں اور بولیاں ایک سی ہو جاتی ہیں..صرف اُس شام کے لیے ایک نئی زبان وجود میں آ جاتی ہے...چنانچہ اُس شام بھی پنجابی اور چینی کی آمیزش سے ایک ایسی زبان تخلیق ہو گئی جو ہم سب بخوبی سمجھ رہے تھے..

''آپ ہندوستان سے آئے ہیں یا عرب ملکوں سے..''

''پاکستان سے..پاچستان''

''آہ..پاچستان..یہ کہیں ہمارے ترکستان کے قریب ہے..''

''ہاں..ہمارا درّہ خنجراب تمہاری سرحد پر ہے..دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو آدھی پاکستان میں ہے اور آدھی چین میں..ہم وہاں سے آئے ہیں..''

شی آنی نوجوان نسل پاکستان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے کہ اُن کی دنیا ہم سے کہیں وسیع ہو چکی ہے..اور اُس دنیا میں پاکستان..اگرچہ ہم وہ پُل تھے جس کے راستے ہنری کسنجر اور پھر نکسن چین پہنچے..چین کے بند دروازے کھلے..پاکستان کی کھڑکی سے باہر کی دنیا کی تازہ ہوا اُن تک آئی..لیکن اب اُن کی وسیع دنیا میں پاکستان اتنا اہم نہیں رہا تھا..اور مجھے ایک مرتبہ پھر احساس ہوا کہ چینی مزاج میں دوستی نبھانا ایک قدیم روایت ہے لیکن اب اُنہیں ہماری اتنی ضرورت نہیں رہی جتنی اب بھی ہمیں اُن کی ضرورت ہے..

چینی نوجوان پینے کے علاوہ بہت کچھ کھا بھی رہے تھے..

اس فٹ پاتھی شی آنی خانہ بدوش ریستوران کا واحد ویٹر ایک ایسا خوبرو نوجوان تھا جو گاہکوں کو شیشے کے ایک شوکیس میں منوّر خوراکوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا تھا کہ یہ درکار ہے..یہ چاہئے..یا یہ پیش کروں..

یہ خوراکیں پچھلے تجربے کی بنا پر مجھے تو مخدوش ہی لگ رہی تھیں اس لیے میں نے صرف مشروب پر ہی اکتفا کیا اور اُن سے اجتناب کیا..لیکن دو چینی نوجوان تو پیچھے ہی پڑ گئے کہ پاچستانی برادر مہمان ہیں..کچھ کھائیں..

جنرل صاحب کی مسلمانی حالتِ خمار میں بھی بیدار ہوگئی اور وہ اپنے سینے پر ایک ہتھوڑا سا مار کر بولے..''ہم مسلمان ہیں..''

''گڈ..گڈ..'' نوجوانوں نے بخوشی تسلیم کیا..

''ہم صرف حلال فوڈ کھاتے ہیں..'' اُنہوں نے ''حلال'' کہتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ کو چھری کی مانند چلا کر دوسرے ہاتھ کو ذبح کر دیا کہ یہ ہوتا ہے حلال..

اس پر دونوں چینی نوجوانوں اور اُن سے وابستہ خواتین نے جو حتمی طور پر اُن کی ہمشیرگان نہیں تھیں، زیرِ لب تبسم کیا کیونکہ چینی کھل کر ہنسنے کو شاید گناہ گردانتے ہیں اور پھر ایک نوجوان نے واحد ویٹر کو پکارا..''عثمان..ادھر آؤ..''

یہ وہی چست اور خوبرو نوجوان تھا جو ہمیں مشروبات کی فراہمی میں بخیلی سے کام نہیں لیتا تھا..

چینیوں نے اُسے چینی میں کچھ کہا تو وہ نہایت چینی لہجے میں بولا..''الحمدللہ... مسلم..عثمان''

اس ایمان افروز انکشاف پر جنرل صاحب نے باقاعدہ اُٹھ کر..بڑی دقت سے اُٹھ کر اُس برادر مسلم سے مصافحہ کیا اور پھر تقریباً زبردستی اُسے گلے لگا لیا..عثمان قدرے خوفزدہ ہو گیا کیونکہ جنرل صاحب نے اُسے چومنے کی کوشش بھی کی تھی..

فٹ پاتھ کے آہنی جنگلے کے ساتھ کوئلوں پر دھری چند سیخیں سلگ رہی تھیں اور اُن کے برابر میں ایک بوائے کٹ بالوں والی ماہی منڈا قسم کی لڑکی..سرخ بلاؤز اور سورج مکھی کے پھولوں سے مزین ایک تنگ جین میں کسی لڑکی..ایک آہنی کرسی پر بیٹھی ایک گنڈاسا نما شے سے گوشت کے قتلے کاٹ رہی تھی..

''فاطمہ..'' عثمان نے اُس گنڈاسا بردار لڑکی کو پکارا..

فاطمہ گوشت پر وار کرتے کرتے لمحہ بھر کے لیے رُکی...اور عثمان کی جانب دیکھا.. اُس نے..ہم دونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُسے اطلاع کی''...مسلم.. الحمدللہ..''

فاطمہ کو البتہ اس اطلاع سے کچھ زیادہ مسرت نہ ہوئی کہ بس یہی بتانے کے لیے میرے کام میں خلل ڈالا تھا اور ناراض لہجے میں جواب دیا''الحمدللہ..'' ذرا جھکی اور آہنی کرسی کے نیچے جو بیئر کی بوتل تھی، اُس میں سے ایک مختصر گھونٹ بھر کر پھر سے گوشت کاٹنے لگی..اور جب یہ کام اختتام کو پہنچ گیا تو وہ ان قتلوں کو سیخوں میں پرو کر سلگتے کوئلوں پر بھوننے میں مشغول ہوگئی..

میں نے سوچا کہ اگر یہ شی آن فاطمہ لاہور کے لکشمی چوک میں تکے کباب لگانا شروع کر دے تو دیگر کبابیوں کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے..

اور چینی دوستوں نے فاطمہ کے ہاتھوں کے بھونے ہوئے تکے ہمیں پیش کیے..تو وہ بے شک خستہ بھی تھے اور پُر ذائقہ بھی..

ان سیخوں سے مچھلی کا گوشت بھی بھربھری اور لذت کی معراج پر پورا اُترتا..اُترتا...

ہم دراصل چین میں پہلی بار آزاد ہوئے تھے..

ہمارے شیڈول میں انتہائی مہنگی اور شاہانہ مہمان نوازی..بے حد تاریخی مقامات اور آرام دہ ہوٹل تو شامل تھے لیکن ہم ان کی قید میں تھے..بیجنگ میں... یہاں شی آن میں کوئی ایک لمحہ شیڈول کی سرحد سے باہر ایسا نہ تھا جب ہم اپنی من مرضی سے بے مقصد گھوم سکتے..چین کے بازاروں میں آوارہ ہو جاتے..چینی چہروں کو کسی من پسند فٹ پاتھی قہوہ خانہ میں بیٹھ کر نہایت فرصت سے تصورِ جاناں کیے رہتے..

ہم انتہائی معزز مہمان تھے..اور ہمیں کسی ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا..ہر لمحے میں کوئی نہ کوئی خصوصی ڈنر تھا..ادیبوں سے ملاقات تھی..میوزیم تھا..مٹی کے سپاہی تھے..کوئی دیوارِ چین تھی..

اور ہم دونوں اس شیڈول کی قید سے چوری چھپے فرار ہو گئے تھے..اور اب ہم میں

ایک نو آزاد ریاست کا ابتدائی جوش تھا.. آزاد ہونے کے بعد دنیا کو بدل دینے کا جوش.. جو وقت گزرنے سے ہمیشہ سرد پڑ جاتا ہے.. بہرحال ہم آزاد تھے.. شی آن کی شام میں ایک عارضی ریستوران کی آہنی کرسیوں پر ایک فٹ پاتھ پر براجمان.. جہاں ہمارے میزبان مہربان چینی تھے جو میزبانی کی ڈیوٹی نہیں دے رہے تھے بلکہ خمارِ شام میں اسے ایک فرض سمجھ رہے تھے.. اور ویٹر عثمان تھا.. ہماری مذہبی ہمشیرہ ٹائٹ جین اور سرخ بلاوز پہنے بیئر کے گھونٹ بھرتی.. فاطمہ تھی..

مجھ پر اس شام شی آن کا اثر کچھ زیادہ ہی ہو گیا...

نہ صرف یہ کہ میں سوڈو رومینٹک ہو گیا بلکہ سوڈو پوئٹک بھی ہو گیا ''آپ یقیناً لی پو کو جانتے ہوں گے..''

میرے چینی میزبان نہایت سادہ اور نافہم چہروں سے مجھے تکتے رہے..

''لی پو... یو نو.. گریٹ چائنیز پوئٹ..''

''آہ..'' یکدم اُن کے چہروں پر اپنائیت آ گئی.. اور اُنہوں نے لی پو کے نام کی صحیح چینی ادائیگی کرتے ہوئے متعدد آہیں بھریں اور سر جھٹک کر کہا ''لی پو کو کون نہیں جانتا۔''

''آپ جانتے ہیں کہ میں بھی لی پو ہوں..'' میں نے اعلان کیا..

''تارڑ صاحب..'' جنرل صاحب نے میرے رُخسار چھو کر پیار سے کہا ''آپ کہاں نکل گئے.. واپس آ جائیے.. آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا.. آپ لی پو کیسے ہو گئے..''

''میں ہوں..'' میں ہنسنے لگا.. ایک آزاد ہنسی شی آن کی شام میں ''آپ ثابت کیجیے کہ میں نہیں ہوں..''

''چلئے آپ ثابت کر دیجیے..'' جنرل صاحب بھی ہنستے ہوئے میری ویولینگتھ پر آ گئے..

''دیکھئے.. لی پو.. جہاں گردی، عدم اطمینان اور ناکام زندگی گزارنے والا ایک شخص تھا.. اُس کی زندگی میں جولا اُبالی پن اور مظاہر فطرت کو پوجنے کی حد تک ایک عشق تھا.. تو کبھی کبھی واہمہ ہوتا ہے کہ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ میں بھی لی پو ایسا جہاں گرد ہوں.. اُس کی

مانند عدم اطمینان کا شکار ہوں اور ایک بظاہر ناکام زندگی میرے حصے میں بھی آئی ہے..''

چینی لڑکے اور اُن سے وابستہ خواتین کے کچھ پلّے نہیں پڑ رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں لیکن اس کے باوجود وہ نہایت سنجیدہ شکلوں سے میری باتیں سن رہے تھے..

''شراب اُس کی سب سے پسندیدہ مرہم تھی جو سرِ شام اُس کے دُکھوں پر پھاہے رکھنا شروع کر دیتی تھی.. اُس کی شاعری میں والہانہ سرشاری اور خمریاتی مستی میں سے وسیع خلاؤں، عظیم بلندیوں، بادلوں، آبشاروں، پہاڑی ندیوں اور بانس کے جنگلوں کی دل رُبا تصویریں ملتی ہیں..''

''جو آپ کی تحریر میں نہیں ملتیں..'' جنرل صاحب بور بہت ہوئے.. اور اب باقاعدہ خفا ہو گئے ''یار یہ کیا لی پو کو لے بیٹھے ہو.. کوئی اور بات کرو.. لی پو کے پیروکار ہونے سے کیا ہو گا.. سائیں اگر ہم اُن بچیوں کے پیروکار ہو جاتے جنہیں نیند آ رہی تھی اور وہ سونا چاہتی تھیں تو زیادہ بہتر نہ ہوتا.. اور ہم ایسے ہیں کہ اُن سے ریٹ تک نہ پوچھا اور اُنہیں مایوسی کی حالت میں چھوڑ کر آ گئے..''

''جنرل صاحب آپ مت بھولیں کہ آپ ایک ایئر ہوسٹس کی کمزور انگریزی کے باعث اس رُتبے پر پہنچ گئے ہیں..'' میں نے عمر رسیدہ شاعر کو باقاعدہ ڈانٹا ''شامِ شی آن بار بار تو نہیں آتی''

''آپ جاری رہیں سائیں..'' جنرل صاحب نے مسکرا کر ہتھیار ڈال دیئے.. گویا ٹائیگر نیازی ہو گئے..

''آپ کو لی پو کی کوئی نظم یاد ہے..'' میں نے چینی نوجوانوں سے پوچھا..

اگر وہ کہہ دیتے کہ ہاں یاد ہے اور چینی زبان میں بے شک سٹاک ایکسچینج کے بھاؤ سنا دیتے تو بھی میں اُس کیفیت میں شی آنِ شام میں اُن کو بہت داد دیتا.. واہ واہ.. سبحان اللہ.. پھر سے کہئے کیا کہنے.. پھر عطا ہو.. کا غُل مچا دیتا لیکن اُنہوں نے نہیں کہا.. نہایت شرمندگی سے کہا ''نہیں.. آپ کو یاد ہے''

اگرچہ مجھے بھی.. اپنے دوست شاعر اور تاریخ دان مرحوم یحییٰ امجد کی ترجمہ شدہ

''تین ہزار سالہ چینی شاعری کا انتخاب'' کی کتاب ''چینی شاعری'' کے مطالعے سے جو کچھ حاصل ہوا تھا.. بس وہی کچھ یاد تھا.. لفظ بہ لفظ تو یاد نہ تھا لیکن اُس کی رُوح میرے بدن میں حلول کرتی تھی لی پو کی شاعری کو یادداشت کے دُھندلکوں میں سے آہستہ آہستہ ظاہر کرتی تھی.. شاید اس شام شی آن کے لیے ہی آج سے تیرہ سو برس پیشتر میرے ہمزاد خانہ بدوش اور جہاں گرد شاعر نے کہا تھا..

میں بیٹھا پیتا رہا اور شام کا دھیان نہ کرسکا..
تا آنکہ گرتی ہوئی پنکھڑیوں نے میرے لباس کی تہوں کو بھر دیا..
مدہوشی میں اُٹھا اور چاندنی میں نہائی ہوئی ندی کے پاس پہنچا..
پرندے جا چکے تھے.. اور آدمی بھی نہیں تھے..

جب ہم.. گئی رات.. اُس شام شی آن سے رُخصت ہوئے تو..
میرے لباس کی تہوں میں.. چینی مہمان نوازی' عثمان اور فاطمہ کی قربت' تنکوں اور کونلوں جلی مہک.. رونق اور زندگی کی پنکھڑیاں تھیں..
پرندے جا چکے تھے.. اور آدمی بھی نہیں تھے..

''پتھروں کا جنگل- کنفیوشس اور مہاتما بدھ کے کندہ فرمان''

ہم سب چلبلے اور نٹ کھٹ ہوئے جاتے تھے..
یہاں تک کہ تتلی بھی...

وہ مجھ سے مسلسل فلرٹ کیے جا رہی تھی.. کبھی میرے چھدرے ہوتے بالوں کو چھوتی تھی اور کبھی ہونٹوں سے لگ کر گزر جاتی تھی.. وہ کالج کی کوئی ایسی شریر طالبہ تھی جس نے طے کر رکھا تھا کہ سالانہ فنکشن میں آنے والے مہمان خصوصی بزرگ ادیب کو فلرٹ کر کے خوب تنگ کرنا ہے.. کبھی اپنی چھاتیوں کی چھاؤں کرنی ہے اور کبھی اُس کی ران پر ہاتھ رکھنا ہے..

''باز آ جاؤ..''

''کیوں باز آؤں؟'' وہ نخریلی ہو گئی..

اُدھر جنرل صاحب بار بار میری ران پر دھپ جما کر کہتے ''تارڑ صاحب رات کو ریٹ پوچھ لینا چاہیے تھا.. کیا حرج تھا..''

دہقانی بھائی کہانی کار ایک مزاحیہ اور متروک شدہ بدھا مسکراہٹ پورے چہرے پر سجائے اُس ایک ہزار روپے مالیتی فون کال کی تفصیل سنا رہا تھا جو اُس نے پچھلی شب پاکستان کی تھی.. سب اُسے چھیڑتے تھے کہ آخر بھابی سے صرف دو تین روز کی جدائی کے بعد ہی کیا کیا راز و نیاز ہوئے جو ایک ہزار روپے کے کارڈ ختم ہو گئے اور وہ کہتا تھا ''یار مَیں پہلے

تو فون ملازمہ نے اُٹھایا اور اُس نے میری آواز سن کر خوش ہو کر کہا.. صاحب جی آپ ہیں.. ہا ہائے آپ کہاں سے بول رہے ہیں' ولایت سے بول رہے ہیں.. کیا حال ہے؟.. چنانچہ میں نے اُسے اپنا حال بتایا.. اتنی دیر میں کسی نے فون اُس سے چھین لیا اور آواز آئی.. صاحب جی سا مالیکم.. میں پھوجیہ بول رہی ہوں.. کیا حال ہے.. یہ صفائی کرنے والی بچی فوزیہ تھی تو اُسے بھی حال بتایا.. اور جب بیگم کو بلا کر لایا گیا تو اُس نے میرے سلام کے جواب میں ابھی وعلیکم بھی نہیں کہا تھا کہ فون بند.. بس اس سلام دُعا میں ہزار روپے گُل ہو گئے..''

گیسو دراز دل پھینک سحر طراز اپنے گیسو سنوارتا تھا اور پچھلی شب کی اُس بار میڈ کو یاد کرتا تھا جب میں نے اُن دونوں کے رنگ میں بھنگ ڈال دی تھی..

سفید ریش شاعر حسب عادت ہر ایک کو مشورے دے رہا تھا.. کوئی لے یا نہ لے وہ مشورے دے رہا تھا کہ شی آن سے یہ خریدو.. وہ خریدو.. اور وہاں سے خریدو.. اور یہ تمام تر معلومات اُس نے شی آن یونیورسٹی میں زیر تعلیم چند پاکستانی طلبہ سے حاصل کی تھیں جنہیں وہ جانے کہاں سے دریافت کر کے پچھلی شب ہوٹل لے آیا تھا.. سفید ریش بے حد مددگار اور نیک خصلت انسان تھا.. ہر ایک کی مدد کرتا تھا چاہے اُسے مدد درکار ہو یا نہ ہو.. وہ ایک ان تھک سوشل ورکر تھا لیکن دہقانی بھائی اُس پر پُھپھی کی پھبتی کستا تھا.. ایک ایسی پُھپھی جس کے پاس ہر ایک کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی مشورہ ہوتا ہے لیکن خود دیکھ کر نہیں چلتی اور ہر قدم پر دھڑام سے گر جاتی ہے..

گیانی اپنی تلوار تیکھی مونچھوں کو گرفت میں لانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا زیر مونچھ مسکراتا ہمیں دیکھتا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ تم اور جنرل صاحب شام شی آن میں مستیاں بلکہ خرمستیاں کر کے بہت دیر سے ہوٹل لوٹے تھے..

حسرت ناک.. جو خود کلامی میں چمپئن تھا شی آن کے بارے میں خود سے محوِ گفتگو تھا.. لو جی یہ شی آن بھی کمال کا شہر ہے.. پتہ نہیں لاہور سے بڑا ہے کہ چھوٹا.. شاید بڑا ہے' نہیں چھوٹا ہے.. لو جی کل مٹی کے سپاہی بھی کمال کے سپاہی تھے.. پر پتہ نہیں سب کے سب

مٹی کے تھے یا اُن میں کچھ پتھر کے بھی تھے.. ہم نے کون سا ہاتھ لگا کے دیکھا ہے.. ہاتھ تو لگانے ہی نہیں دیتے تھے.. پتہ نہیں ہاتھ کیوں نہیں لگانے دیتے تھے..

ہم اتنے چلبلے اور نٹ کھٹ ہوئے جاتے تھے کہ لیڈر بھی کھلنڈرا ہو رہا تھا.. اپنی لیڈری فراموش کر کے ہم میں گھل مل گیا تھا.. کل جب اُس نے صرف مجھے خالی ہاتھ دیکھا تو کہنے لگا.. تارڑ صاحب آپ تصویریں کیوں نہیں اُتار رہے تو میں نے کہا تھا کہ بس میرے پاس کیمرہ نہیں اس لیے نہیں اُتار رہا.. کیمرے کے بغیر آپ تو جانتے ہوں گے کہ تصویر اُتارنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے.. اس پر اُس نے مجھے اپنا ایک فالتو مگر نہایت تیز آنکھ والا کیمرہ عطا کر دیا تھا.. اور میں بے حد مجرم محسوس کر رہا تھا کہ اتنے نفیس اور رحم دل شخص کے لیے میں کیسے کیسے لغو اور بیہودہ خیال پالتا تھا.. اور اس نٹ کھٹ چلبلاہٹ میں ہماری کوچ چلی جا رہی تھی..

اور اس کا سبب ایک ہی تھا.. ہماری اس بے دھڑک آزادی کا سبب ایک ہی تھا.. یعنی آسمانی آفت کی غیر موجودگی.. اور ایک مرتبہ پھر ہمارے ہر دل عزیز میجر لیو.. خاور اور وانگ لی ہمارے راہبر ستارے تھے.. آسمانی آفت نے مجھے شبہ تھا کہ پچھلی شب ڈنر میں بے دریغ کھاتے ہوئے کوئی ایسی شے کھالی تھی جس سے اُسے فوڈ پوائزننگ ہو گئی تھی.. اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہ تھی.. پتہ نہیں ہمارا وہ کون سا ایسا نادیدہ محسن تھا جس نے اُس کی فوڈ کو پوائزن کر دیا تھا..

''خاور.. اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

باہر صبح کی اوّلیں روشنی میں شی آن گزرتا تھا اور نہایت دل پسند' ستھرا اور من موہنا لگتا تھا.. اس کے باسی بھی بیجنگ کی نسبت زیادہ مطمئن' پُر وقار اور خوش باش لگتے تھے..

''اب..'' خاور نے ماتھے پر آئے بانس کے پتوں ایسے کھردرے بالوں کو ہتھیلی سے دھکیلا اور پھر انگلی کھڑی کر دی جیسے کوئی حکم دینے کو ہو ''اب ہم پتھروں کے جنگل میں جائیں گے''

''پتھروں کے جنگل میں؟'' جنرل صاحب اپنی اونگھ سے بیدار ہو گئے ''بھائی تارڑ

انہیں پچھلی شب لمبی ٹانگوں اور خوبصورت بدنوں کا جو جنگل تھا' اُس کے بارے میں بتاؤ''

سب لوگ متوجہ ہوگئے..حسرت ناک نے بھی اپنی خود کلامی موقوف کردی..اُنہیں شروع سے ہی میرے بارے میں شکوک تھے کہ جب ہم سو جاتے ہیں تو یہ کوئی نہ کوئی کارستانی کرتا ہے..

''کیوں جی' کہاں گئے تھے؟''

''بھئی جنرل صاحب شاعر ہیں تو ذرا جلال میں آکر شاعرانہ انداز میں بات کر رہے تھے...پچھلی شب ہم نے کہاں جانا تھا..کہیں بھی نہیں گئے تھے''

''کیوں نہیں گئے تھے؟'' وہ واقعی جلال میں آگئے''کوئی جرم کیا ہے..آپ کو اگر نیند پیاری ہے اور ہمیں کچھ اور پیارا ہے تو ہم کیا کریں..ہم نے تو خوب عیش کی..ریٹ نہیں پوچھا اس کے علاوہ عیش کی..فٹ پاتھ پر بیٹھ کر..یعنی کرسیاں تھیں وہاں جن پر بیٹھ کر خوب مزے کیے..میں نے تصویریں بھی اُتاری ہیں جن میں وہ سب کچھ میز پر ہے جو ہم نے کھایا پیا..کسی کو کوئی اعتراض ہے..''

یہ''کسی کو کوئی اعتراض ہے'' اُنہوں نے اُسی لہجے میں کہا تھا جس میں ایک خان صاحب نے اپنی تقریر کے بعد پوچھا تھا کہ کسی برادر کو کوئی اعتراض ہے..اور جب ایک برادر نے کہا تھا کہ ہاں مجھے اعتراض ہے تو اُنہوں نے جواب میں اُسے کہا تھا کہ تمہاری تو میں...اور اس کے بعد پھر پوچھا تھا کہ کسی اور بھائی کو اعتراض ہے..

تو اعتراض کون کرتا..

لیکن ہم پتھروں کے جنگل میں کیوں جا رہے تھے..

ابھی تو ہم بیل ٹاور سے آ رہے تھے..

اور بیل ٹاور کیا ہے؟..شی آن کا گھنٹہ گھر...لیل پور کے گھنٹہ گھر سے قدرے مختلف..

شی آن کی پہچان..منگ خاندان جو اپنے پورسلین اور برتنوں اور مرتبانوں کے حوالے سے مشہور عالم ہے اُس کے سترہویں ہانگ وو برس میں تعمیر کیا گیا تھا..یہ سترہواں ہانگ وو برس جو کچھ بھی ہوتا ہے..ویسے 1384ء ہوتا ہے..یہ بیل ٹاور اور اس کی دیدہ

زیب عمارت شہر کے وسط میں ایستادہ ہے جس کی بالائی منزل سے شی آن کی ہر شے نظر آتی ہے...چوبی منزلیں' لکڑی کے پرانے شہتیر' بلند چھتیں' نادر تصاویر' خطاطی کے نمونے..چینی کلاسیکی موسیقی کے لیے ایک ہال..اور ظاہر ہے ایک بہت بڑی گھنٹی بلکہ گھڑیال جو ایک جھولے میں جھول رہا ہے اور اُس کے سامنے ایک بڑا سارا مگدر اور وہ بھی جھول رہا ہے اور آپ اسے زور لگا کر دھکا دیتے ہیں تو وہ گھنٹی سے ٹکرا کر ایک گہری''گھاؤں'' سی کرتا ہے..ماسکو کے کریملن میں بھی تقریباً اسی سائز کی ایک گھنٹی دھری ہے لیکن اُسے بجایا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ فرش میں گڑی تھی...کوئی بھی فریادی چاہے وہ کتنا ہی دُکھی کیوں نہ ہو..کتنا ہی ستم رسیدہ کیوں نہ ہو' سوویت یونین کی اُس گھنٹی کو بجا کر انصاف کا طالب نہیں ہو سکتا تھا..شاید اس لیے وہ سلطنت بکھر گئی اور چین ابھی تک موجود ہے کیونکہ اس کے گھڑیال کو بجا کر فریاد کی جا سکتی ہے..

میں نے مگدر ہلا کر اس شی آنی گھڑیال کو بجا کر کوئی فریاد نہ کی اور صرف اس لیے کہ اسے بجانے کے لیے چند یوآن جیب سے جاتے تھے..صرف مشاہدے پر اکتفا کیا..

بیل ٹاور..پیرس کی آرک ڈی ٹرائمف کی مانند شی آن کے شاہراہوں کے سنگم پر ایستادہ ہے..

یہ کون سا جنگل ہے...کیسا جنگل ہے..کیا اس میں جو شجر ہیں..پھول بوٹے اور پیڑوں تلے جو گھاس ہے وہ بھی پتھر کی ہے..

''سٹوپڈ..'' کسی نے میرے خیالات کو پڑھ لیا تھا..کون تھا..میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا..سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔صرف میں نے سنا تھا اس لیے یہ مجھی سے یہ کہا گیا تھا..اور یہ تتلی تھی جو اگرچہ ہر لمحہ میرے ساتھ ہوتی تھی لیکن میں ہمیشہ فراموش کر دیتا تھا کہ وہ ہر لمحے میرے ساتھ ہے''میں جو تمہارے ساتھ ہوں..مجھ سے پوچھو کہ وہ جنگل کیا ہے''

''نہیں پوچھتا..'' میں قدرے خفا ہوگیا..بھری محفل میں مجھے سٹوپڈ کہہ دیا تھا..

جس راز پر میں پردے ڈال رہا تھا اُسے ظاہر کر دیا تھا.. میں منہ موڑ کر باہر دیکھنے لگا..

شی آن کی قدامت بھری ناقابلِ عبور فصیل میں ایک شگاف تھا جس میں سے شاہراہ گزرتی تھی اور اُس پر گزرتی ہماری کوچ فصیل کے دوسری جانب چلی گئی..

فاریسٹ آف سٹون..

پتھر کا جنگل..

ایک چینی خوشنمائی والے دیدہ زیب دروازے کے اندر ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد.. جو ہم نے خود نہیں لیو نے حاصل کیے تھے اور میں اُس لمحے حساب لگا رہا تھا کہ اب تک ہم جتنے قابل دید اور قابل قدر تاریخی مقامات دیکھ چکے ہیں' اُن کے داخلے کے ٹکٹ اگر ہم نے اپنے پلّے سے خریدے ہوتے تو ہمارے پلّے لیرو لیر ہو چکے ہوتے.. ہم کب کے کنگال ہو گئے ہوتے.. چینی سرکار ہم بے حد شکر گزار ہیں..

اس خاموش اور شاہانہ دروازے کے اندر... کیا تھا؟.. کچھ راہداریاں.. بلند چھتیں.. اور برآمدے تھے.. جن میں پتھر کا ایک جنگل آباد تھا.. جو دیکھ نہیں سکتے اُنہیں یہ محض پتھر دکھائی دیتے تھے.. جو دیدۂ بینا رکھتے تھے اُن کی بینائی بڑھ جاتی تھی اور وہ ایک جہان دیکھتے تھے.. حکمت' معرفت اور دانائی کا ایک جہان.... جہاں سے چینی تہذیب' ثقافت اور ایمان کے سوتے پھوٹتے تھے..

ان راہداریوں اور برآمدوں میں.. کسی لائبریری کے شیلفوں کی مانند.. سینکڑوں.. بلکہ ہم تعداد کا تعین کر لیتے ہیں پورے سترہ سو پتھروں کی بڑی بڑی سلیں.. تختیاں کھڑی تھیں جن میں سے ہر ایک کا وزن کئی من ہوگا.. اور یہ سادہ نہیں تھیں.. ان پر گئے زمانوں کے دانشوروں' حکیموں اور شاعروں کے فرمان' نظریات اور شاعری کھدی ہوئی تھی.. قدیم.. ہزاروں برس پہلے کے خطاطوں کے فن پارے نقش تھے... پتھروں کا یہ عجائب خانہ تقریباً ایک ہزار برس پیشتر یعنی 1090ء میں وجود میں آیا اور ظاہر ہے کہ ان میں سے بیشتر فرمان شاعری اور حکمت اُن زمانوں سے پہلے کی تھی..

یہاں قدیم چین کے تمام راز' عقیدے' فلسفے اور ذوقِ جمال کی تاریخ پتھریلی

تختیوں میں کھدی ہوئی تھی..

ان سترہ سو پتھروں میں کنفیوشس کے اقوال بھی تھے جو اُس کے پیروکاروں نے برسوں کی عرق ریزی کے بعد ان میں ثبت کیے تھے..

یہاں نامور چینی خطاطوں کی ہزاروں برسوں کی تاریخ رقم تھی..

ٹانگ خاندان جس کا سرمئی رنگ شی آن شہر کی قدیم چھتوں پر غالب ہے.. اُس کے عہد کے مایہ ناز خطاط.. اُویانگ ژن' یُوشان اور یانگ شُو جیسے اساتذہ کی خطاطی کے قلمی نسخے پتھروں میں کھدے ملتے تھے..

یہاں نہ صرف قدیم چین کی تاریخ محفوظ ہے بلکہ پتھر کی ان سلوں کی تحریروں سے چینی زبان کے ارتقا کا بھی اندازہ ہوتا ہے.. کہ یہ کیسے آہستہ آہستہ اور کن برسوں میں تبدیل ہوئی... وہ کون سے لفظ ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں اور وہ کون سے اظہار ہیں جو فلاں برس میں چینی زبان میں رائج ہوئے.. گرائمر میں کیا کیا تبدیلیاں رُونما ہوئیں.. یہاں سنسکرت سے ترجمہ شدہ لارڈ بدھا کے وہ فرمان بھی آویزاں تھے جنہیں ہیون سانگ ہندوستان سے لے کر آیا تھا..

غرض کہ.. یہ عجائباتِ سنگ حیرت انگیز تھا..

کاغذ کی موجودگی میں.. پتھروں پر ہی لکھائی کیوں کی گئی.. ان میں اپنے افکار اور خیالات اور عقیدے کیوں کھودے گئے.. اس کے بارے میں شاید تتلی نے یا شاید میں نے ایک نظریہ پیش کیا.. چین میں کاغذ ایجاد ہو چکا تھا.. تو کبھی ایسا بھی ہوا ہوگا کہ کسی نئے فرمانروا نے تخت نشین ہوتے ہی گزشتہ تاریخ یک قلم موقوف کر دینے کی ٹھانی.. اور جو کچھ تاریخ دانوں' سوجھوانوں اور شاعروں نے لکھا تھا اُسے جمع کیا اور نذرِ آتش کر دیا.. چنانچہ ان لوگوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے اقوال اور نظریات پتھروں کی سلوں پر کھودنے شروع کر دیئے.. تا کہ انہیں جلا دینا ممکن نہ رہے..

ویسے یہ نظریہ تتلی نے نہیں یقیناً میں نے ہی پیش کیا تھا کیونکہ میرے ملک میں بھی تاریخ کو نذرِ آتش کرنے کا رواج ہے.. ہر نیا فرماں روا پچھلی تاریخ اور پچھلے حکمران کو رد

کر کے..اُسے مطعون کر کے ہی اپنے دور کا آغاز کرتا ہے..ایوب خان تمام سیاست دانوں کو غدار قرار دے کر ایبڈو کر دیتا ہے..زلفی بھٹو اپنے ڈیڈی کو ڈوگی قرار دے کر..اُس کی ہائے ہائے کروا کر اُس کے دور کو سیاہ ثابت کرتا ہے...ضیاء الحق پہلے اُس کے سامنے جھکتا ہے اور پھر اُسے پھانسی پر لٹکا کر تسبیح تھام لیتا ہے...بینظیر آتی ہے تو وہ اپنے والد کے علاوہ کسی کو نہیں بخشتی..یہاں تک کہ سگے بھائی کو بھی نہیں بخشتی..نواز شریف آ جاتے ہیں اور..... پھر پرویز مشرف نمودار ہو جاتے ہیں..یعنی سلسلہ ٹوٹا ہی نہیں درد کی زنجیر کا..ہر کوئی اپنی ایک ذاتی تاریخ تخلیق کرتا ہے اور پھر اُس کی راکھ میں گم ہو جاتا ہے..اور ہم راکھ کریدتے رہتے ہیں کہ ہماری اصل تاریخ کہاں ہے..

ہمارے ہاں بھی سلوں پر تاریخ کھودنے کا رواج ہونا چاہیے تھا..اور پھر ان سلوں کو سمندروں میں دفن کر دیا جاتا' تاکہ وہ محفوظ تو ہو جاتی..

میں اس عجائب خانے کی ہر تختی کے سامنے رُکا..اُس پر کُھدی اجنبی لکھت کے قدیم زیبائشی نقوش کو نظروں میں اُتارا..میں اُن حرفوں کے معانی سے اگرچہ ناآشنا تھا لیکن اُن کی دانائی اور معرفت کہیں نہ کہیں مجھ پر اثر کرتی تھی..

پتھروں کے جنگل کی آخری راہداری میں ایک چینی خطاط ایک سِل پر کچھ نقش کر کے سیاحوں کو بتا رہا تھا کہ ان پر کیسے پہلے روشنائی سے لکھا جاتا ہے اور پھر اُن حروف کو چھینی اور تیسی کی مدد سے کھود کر ابدیت دی جاتی ہے...یہ ایک نادر موقع تھا کہ میں اس چینی خطاط سے گزارش کرتا کہ وہ میری تاریخ بھی پتھروں میں کھود دے..لیکن یہ ممکن نہ تھا..ہم جتنی تاریخ ضائع کر چکے ہیں اُسے کھودنے کے لیے شاید قراقرم کے سلسلے کے تمام پتھر بھی کافی نہ ہوں.....

میں اس جنگل سے باہر آیا تو میرے دل پر اُن تمام سِلوں کا بوجھ تھا..حسد مجھے راکھ کیے دیتا تھا..میرے ماضی کی سلیٹ خالی تھی..اُس پر جو لکھا تھا وہ اسفنج سے پونچھ دیا گیا تھا..میری تاریخ خالی تھی..

''لگا ہے خطاطی کا بازار دیکھو''

باہر...

پتھروں کے جنگل سے نکل کر چینی محراب تلے سے گزر کر ہم باہر بازار میں آئے..

اور کیسے بازار میں آئے..

یہ مصر کا بازار نہیں تھا..شی آن کا بازار تھا..

باہر...شہر کی قدیم فصیل کے بھاری پتھروں کے سائے میں ایک ایسا بازار لگا تھا جو اپنے ذوقِ جمال میں اور پرانی روایتوں کے تسلسل میں..یکتا اور بے مثال تھا..دنیا میں کہیں بھی ایسا بازار نہیں سجتا تھا جو شی آن کی فصیل کے ساتھ ساتھ دُور تلک جاتا تھا..

یہ خطاطی کا بازار تھا..

موئے قلم کے معجزوں کا بازار تھا..

ہمارے ہاں بھی خطاطی کا بازار سجتا ہے اور وہ بازارِ حسن سے کہیں زیادہ عامیانہ اور شہرت کا بھوکا ہوتا ہے..چونکہ حاکم وقت تقویٰ اور پرہیزگاری کی عبا تلے اپنا مکر اور فریب پوشیدہ کرتا ہے اس لیے ہر کوئی اُس کی خوشنودی کے لیے خطاطی پر اُتر آتا ہے..کوئی رنگوں کے چند چھینٹے چھڑک کر اور کوئی فٹے اور پرکار سے چند لکیریں کھینچ کر..اور یوں اسلامی خطاطی کی عظیم روایت کو رسوا کیا جاتا ہے..جب کہ کلاسیکی خطاط..اپنے موئے قلم اور وجدان پر انحصار کرنے والے لوگ بیٹھکِ کاتباں میں بیٹھے رہ جاتے ہیں..وہ بے شک نفیس رقم

ہوں.. حافظ یوسف سدیدی ہوں یا گوہر قلم ہوں اُن بہروپیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے.. اور گوشۂ گمنامی میں چلے جاتے ہیں..

فصیل کے ساتھ ساتھ.. فٹ پاتھ پر.. ہزاروں دکانیں تھیں.. کھوکھے تھے جہاں صرف اور صرف خطاطی کا سامان ملتا تھا.. خصوصی کاغذ' انواع واقسام کے برش' روشنائیاں.. اور تختیاں.. قدیم خطاطوں کے نمونے جنہیں نقل کرنے سے آگاہی حاصل ہوتی ہے..

ماں باپ اپنے بچوں کے ہمراہ.. اُن میں شوقِ خطاطی کی چنگاری بھڑکانے.. کہ یہی فن ذوقِ جمال کی معراج ہے.. اُن کے لیے مناسب برش' کاغذ اور روشنائیوں کا انتخاب کر رہے تھے..

اور ہاں.. پتھروں کے جنگل میں سے باہر آنے پر ہم نے پہلی بار چینیوں کو بھیک مانگتے دیکھا..

یہ فقیر بہت زیادہ نہیں تھے..

صرف چند ایک تھے.. عمر رسیدہ اور نہایت معتبر شکلوں کے اور اُنہیں بھیک دیتے ہوئے ہمیں شرم آتی تھی.. لیکن جب ایک ملک میں دو نظام ہوں.. اور دوسرے نظام میں سرمایہ داری کو جگہ دی گئی ہو تو وہاں لامحالہ امیر ہوں گے تو اُن کے پہلو بہ پہلو فقیر بھی ہوں گے.. یہ بوڑھے لوگ چوری چھپے سیاحوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے.. خطاطی کے اس بازار میں ایک نہایت کیوٹ چینی بڑھیا نے جب ہاتھ پھیلا کر ''کر بھلا سو ہو بھلا'' کی صدا ٹھیٹھ چینی میں لگائی تو گیانی نے اپنے بٹوے کو ڈھیلا کرنے سے پیشتر مجھے صدا دی ''تارڑ صاحب.. میں اس فقیرنی کو کچھ یوآن خیرات کرنے لگا ہوں.. ذرا تصویر اُتارو تاکہ ہمارے پاس ثبوت ہو کہ چین میں بھی فقیر ہوتے ہیں''

چنانچہ میں نے اُن کی خصوصی درخواست پر جب وہ کیوٹ بڑھیا کی ہتھیلی پر ایک سکہ رکھ رہے تھے تصویر اُتار لی.. اور اس تصویر کو دیکھیے تو لگتا یہ ہے کہ گیانی بھیک دے نہیں لے رہے ہیں' یوں چینی اماں جان کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں..

بازار کے پہلو میں سے جو ایک گلی نکلتی ہے' وہاں چند مشہور خطاط میزوں پر جھکے

اپنے برش سیاہ روشنائی میں ڈبو ڈبو کر اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے خصوصی کاغذ پر حیرت اور جمال کے معجزے اُلیک رہے تھے.. آپ بے شک اُن کے سٹائل اور فن کے گواہ بنے مشاہدہ کرتے رہیے.. اُن سے سیکھتے رہیے.. اور اگر آپ کا شمار خطاطی کے قدر دانوں میں ہوتا ہے تو ایک آدھ نمونہ خرید لیجیے..

وہ آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آئیے اپنا زورِ برش آزمائیے..

اور جو چینی اس فن کا کچھ ادراک رکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو آزماتے ہیں..

ایک ایسا ہی خطاط تھا.. میں اُسے میز پر پھیلے کاغذ پر برش سے سٹروکس لگاتے حروف کی نوک پلک درست کرتے دیر تک دیکھتا رہا اور جب بہت دیر بعد اُس نے اپنی مگن کیفیت میں سے لحہ بھر کے لیے باہر آکر سر اُٹھایا اور مجھے سامنے پایا تو نہایت سنجیدگی سے.. اپنا برش میرے آگے کر کے چینی میں کچھ کہا.. جس کا مطلب یہی تھا کہ آؤ تم بھی یہ مشقِ سخن کر دیکھو.. میں ذرا جھجکا تو اُس خطاط کے ایک مداح نے.. جو اُس کی ہر سٹروک کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا مجھے اجنبی جان کر اپنی قدیم روایت کو مجھ تک پہنچانے کی خاطر میری حوصلہ افزائی کی..

میں نے مسکرا کر خطاط کا برش تھام لیا..

اس برش میں بھی کوئی سحر تھا.. میرے ہاتھوں میں آیا تو مجھ میں کنفیوشس کی دانائی بھر دی لیکن اس کے باوجود میں برش تھامے اُس میز پر جھکا جس پر ایک کھردرا ہینڈ میڈ کاغذ بچھا تھا اور کاغذ پر خطاط کے نایاب حروف جو ابھی گیلے تھے' ذوقِ جمال کی معراج کی ایک نیرنگ فصل کی طرح بہار دے رہے تھے.. میری سمجھ میں کچھ نہ آیا..

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب میں کیا کروں.. ان حروف کو نقل کروں یا کیا کروں..

میں بے سمجھی اور نادانی کے خوف میں برش تھامے رہا..

تب تتلی میری مدد کو آئی..

''تم بچپن میں تختی لکھا کرتے تھے.. یہ میں جانتی ہوں..''

''تم جانتی ہو تو اس کا چرچا نہ کرو.. ان زمانوں میں یہ اقرار کرنا کہ میں کبھی اتنا

فرسودہ اور دیہاتی ہوا کرتا تھا کہ نارمل سکول گکھڑمنڈی کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تختی لکھا کرتا تھا..اور اُس تختی کو ایک ایسے جوہڑ میں دھویا کرتا تھا جس میں ایک نوخیز مینڈک میری تختی کو اپنے آرام میں مخل ہوتے ہوئے پا کر احتجاج کرتا ٹرایا کرتا تھا...اور میں اُس کے احتجاج کو مسترد کرتا اپنی تختی کو بہترین چیکنی گاچی سے پوتا کرتا تھا.تم جانتی ہو تتلی تو چڑ جانہ کرو کہ یہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہے.."

"اگر چینیوں کو علم ہو جائے کہ تم بچپن میں ایک تختی پر خطاطی کیا کرتے تھے تو وہ تمہیں پوجنے لگیں..لیکن میں چڑا نہیں کروں گی..صرف یہ کہوں گی کہ تمہارے ماسٹر صاحب تمہاری تختی پر ہلکی روشنائی سے پورنے اُلیک دیتے تھے اور تم اُن پر قلم پھیرتے اُنہیں گوڑھا کر لیتے تھے..تو یوں جانو کہ یہاں بھی یہی کچھ کرنا ہے..اس کاغذ کو تختی جانو اور اس پر جو من میں آئے اُلیک دو.."

وہ خطاط جب اُس برش کو جواب میرے ہاتھ میں تھا..کاغذ پر رکھتا تھا تو سیاہی اُس کے تابع ہو کر مسلسل حروف تخلیق کرتی جاتی تھی لیکن جب میں نے اُسے کاغذ پر رکھا تو کچھ بھی نہ ہوا..برش میں کوئی حرکت نہ ہوئی...

تتلی برش پر براجمان ہو گئی اور مجھے ہدایات دینے لگی "خطاطی...روشنائی اور برش سے نہیں ہوتی..یہ دماغ سے اور ذوقِ جمال کے چشموں سے پانی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے برش پر دباؤ ڈالنے سے ہوتی ہے.."

اب میرے دماغ میں تو بُھس بھرا تھا..جو پانی کے گھونٹ سے تو گیلا ہو جاتا اس لیے میں نے کوشش کی کہ ذوقِ جمال کی ایک چنگاری اس میں ڈالی جائے تو شاید یہ سلگ اُٹھے..برش تو رواں ہو گیا لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی روانی کو کیا سمت دوں..اپنا طویل نام لکھوں' پاک چین دوستی زندہ باد تحریر کروں کیا کروں..چنانچہ میں نے اُسے کھلا چھوڑ دیا کہ جو تیرے من میں ہے وہ لکھ ڈال..اور برش کی روانی سلطان باہو کے پاس جا پہنچی اور چینی کاغذ پر "الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وِچ لائی ہو.." لکھ دیا..

چینی خطاط نے نہایت حیرت سے اس تحریر کو دیکھا..اُس کے لیے یہ ایک اجنبی

رسم الخط تھا..ایک قریب کھڑے ہوئے مداح کی مدد سے مجھے کہنے لگا "یہ حروف جو تم نے لکھے ہیں نہائت خوش نما اور پُروقار ہیں اور خطاطی کے لیے نہایت موزوں..."

میں نے اُسے مختصراً اسلامی خطاطی کی عظیم روایت کے بارے میں کچھ بتایا..ترکی' ایران اور پاکستان کی مساجد اور مقابر میں جو شاہکار ہیں اُن کی تفصیل بیان کی..اور یہ بھی عرض کیا کہ شاید چین اور جاپان کے بعد اگر کوئی مذہب خطاطی کو تقدیس دیتا ہے تو وہ اسلام ہے..

خطاطی کے اس بازار میں سیاحوں کے لیے مقامی دستکاریوں کے تحائف کی دکانیں بھی تھیں..اور اُن کی ورائٹی حیرت انگیز تھی..مٹی کے سپاہیوں کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جسے خریدنے کو جی چاہتا تھا..

یہیں سے ہم نے مختلف رنگوں کے وہ چمکتے دمکتے چھوٹے چھوٹے زندہ لگتے گھوڑے خریدے..اگرچہ چین ایک گھوڑا ملک نہیں ہے..یعنی عرب' وسط ایشیا اور یورپ کی مانند یہاں گھوڑے کی پرستش نہیں ہوتی..اور نہ ہی چین النسل گھوڑوں کا ہارس ہسٹری میں کوئی مقام ہے لیکن اس کے باوجود چینی مصوّروں اور نقاشوں کا محبوب ترین موضوع گھوڑا ہے..وہ گھنے برش کی مدد سے سیاہ روشنائی کے چند سٹروکس لگاتے ہیں تو کاغذ پر وجود میں آنے والا گھوڑا نہ صرف بگٹٹ بھاگنے لگتا ہے بلکہ باقاعدہ ہنہنانے لگتا ہے..وہ زندگی کے اتنا قریب ہوتا ہے..گھوڑوں کی تصاویر چینی مصوری کی پہچان ہیں اور دنیا بھر کے مصوّر اُنہیں اس فن میں اُستاد مانتے ہیں..پاکستان میں سعید اختر وہ واحد مصوّر ہیں جن کے بنائے ہوئے گھوڑے چینی گھوڑوں کے شانہ بشانہ بھاگتے ہیں..

چینی مجسمہ سازوں کا پسندیدہ جانور بھی گھوڑا ہے..اس لیے گھوڑوں کی جتنی ورائٹی چین میں ملتی ہے وہ کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتی..

ہم جب بیل ٹاور دیکھ کر اُترے تھے تو زیرزمین سوینئر شاپ کی انچارج کے پاس چھ گھوڑوں کا ایک ہی سیٹ برائے فروخت تھا..اور سب لوگ اُسے خریدنا چاہتے تھے..مختلف مزاجوں اور رنگوں کے یہ دیدہ زیب گھوڑے ہم سب کی نظروں میں بس گئے..پھر ایک رُکن

نے منہ مانگی قیمت ادا کر کے انہیں خرید لیا اور بقیہ سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے..اس رُکن نے گھوڑوں کے پارسل کو اپنے تھیلے میں ڈالتے ہوئے ہم سب کو ایک چشمِ حقارت سے دیکھا کہ..اب ڈھونڈھ انہیں چراغِ رُخِ زیبا لے کر..یہ نہیں ملنے کے..نایاب ہیں یہ..لیکن جب خطاطی کے بازار میں آئے ہیں تو گھوڑوں کے یہی سیٹ سینکڑوں کی تعداد میں ہر دکان پر ڈھیر ہیں...اور اگر یہ بیل ٹاور کی دکان سے پانچ سو یوآن میں آئے تھے تو یہاں وہی گھوڑے ڈیڑھ سو یوآن میں مل رہے تھے..

چنانچہ اب ہم نے اُس رُکن کو چشمِ حقارت سے دیکھا اور دھڑا دھڑ یہ گھوڑے خرید لیے..

اسی شی آنی بازار میں..ایک اور نایاب کشش تھی..

یہاں آپ مختلف رنگوں کے پتھروں سے تراشی گئی اپنے نام کی مہریں بنوا سکتے تھے..مہر کی مٹھی آپ کی پسند کے مطابق شیر یا بندر کی شکل کی ہو سکتی تھی..

چینی مصور' خطاط' بت تراش یا سرکاری اہلکار بھی اپنے ہاتھ سے دستخط نہیں کرتے تھے۔تصویر' مجسّے' خطاطی یا فرمان پر اپنی ذاتی مہر سرخ یا سیاہ روشنائی میں ثبت کر دیتے تھے..

میں نے جو مٹی کے سپاہی خریدے تھے' اُن کے پینیدے میں بھی بت تراش کی مُہر ثبت تھی..میں یقیناً ایک ایسی ذاتی مُہر بنوانے میں دلچسپی رکھتا تھا..صرف ایک جھنجٹ تھا...مُہر پر آپ کا نام چینی زبان میں کھودنے والا کیا واقعی آپ ہی کا نام کھود رہا ہے یا کچھ اوٹ پٹانگ چینی حروف لکھ کر آپ سے پیسے بٹور رہا ہے..میں نے ایک مُہر ساز کو کاغذ پر انگریزی میں ''تارڑ'' لکھ کر دیا تو اُس نے کچھ سوچ کر اُس کے برابر میں کچھ مکوڑے سے بنا کر مجھے دکھائے کہ یہ ٹھیک ہے؟ لیکن میں کیسے جان سکتا تھا کہ یہ واقعی میرا نام ہے..ممکن ہے وہ تتلی کی مانند مُہر پر ''تارڑ'' کی بجائے ''سٹوپڈ'' کھود دے..اور میں ساری عمر اپنے مسودوں اور خطوں پر یہ مُہر ثبت کر کے اپنی حماقت کا اقرار کرتا رہوں..اس لیے میں نے مُہر بنوانے کا ارادہ ترک کر دیا..

ہم اس تقریباً ایک کلومیٹر طویل شی آن کی فصیل کے پہلو میں پھیلے خطاطی کے بازار میں سے سرسری گزرے..فٹ پاتھوں اور دیواروں پر چینی خطاطی اور نایاب تصویروں کی ایک ایسی فصلِ گُل تھی جس کا ایک ایک گُل پہروں دیکھنے کے لائق تھا لیکن ہم سرسری گزرے...

''ہیون سانگ پاکستان کا سیّاح اور اُس کا پگوڈا''

''اب واپس بھی آ جاؤ... تم ابھی تک اُسی جنگل میں ہو۔'' تتلی میرے چہرے کے گرد پھڑ پھڑا رہی تھی، لامبی پلکوں کی طرح میرے رخساروں کو چھو رہی تھی۔ ''میں بہت دیر سے تمہاری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور تم ابھی تک اسی جنگل میں بھٹک رہے ہو۔''

''ہاں:'' میں نے دل گرفتگی سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ ''میں ابھی تک پتھروں کے جنگل میں ہوں.. ایک مغربی محقق نے کہا تھا کہ یہ تو درست ہے کہ چین کی تہذیب قدیم بھی ہے اور بہت امیر بھی.. لیکن چینی اسے سنبھالتے بھی خوب ہیں.. دنیا میں اور ملک بھی ہیں جن کی تہذیبیں بہت شاندار تھیں لیکن وہ ان کے آثار کو سنبھال نہیں سکے..''

''اب خدا کے لیے پھر سے ہڑپہ اور مہر گڑھ کا رونا رونے نہ بیٹھ جانا.. کہ وہ چین کے تمدن سے کہیں قدیم اور تہذیب یافتہ تھے اور کیسے لوگوں نے ہڑپہ کی اینٹوں کو ریلوے لائن کے نیچے بچھا دیا اور گھر تعمیر کر لیے.. تمہارے ہاں تو ابھی یہ فیصلہ بھی نہیں ہو سکا کہ تمہاری تہذیب ہے کیا.. اس کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے.. دریائے سندھ کی تہذیب سے.. محمد بن قاسم سے یا تخلیق پاکستان سے.. تو تم نے کیا سنبھالنا اور کیا نہیں سنبھالنا..''

''بہر حال آزردگی تو ہوتی ہے.. ان کے پاس ہزاروں برسوں کے فلسفے اور افکار کا پتھریلا ریکارڈ محفوظ ہے.. چلو موہنجوڈارو یا ہڑپہ نہ سہی، ہم اسی طور اپنی خطاطی کے

شاہکاروں کو تو سنبھال سکتے تھے.. ہمارے ہاں قدیم قبرستانوں میں سینکڑوں برس پرانے کتبے ابھی تک موجود ہیں جنہیں ان ادوار کے عظیم خطاطوں نے تحریر کیا.. انہیں سنبھال لیں.. ان کا ایک میوزیم بنا دیں.. میں سکردو کے قریب وادیٔ شگر کی ایک چھ سو برس پرانی مسجد میں گیا جہاں ایک کونے میں ٹاٹ کی پھٹی ہوئی بوری میں قرآن پاک اور مذہبی کتابوں کے نایاب قلمی نسخوں کے صفحات بوسیدہ ہو رہے تھے.. میں ان میں سے کچھ نمونے چن کر اپنے ساتھ لے آیا اور وہ میری سٹڈی میں ایک پوٹلی میں بند مزید بوسیدگی کا شکار ہو رہے ہیں.. لاہور، ملتان اور پشاور کے کئی پرانے گھروں اور حویلیوں میں ایسے نسخے ہیں جنہیں دریا برد کیا جا رہا ہے.. ہم کم از کم خطاطی کا ایک میوزیم تو بنا سکتے تھے..''

''لیکن تم ایک کلومیٹر طویل خطاطی کا بازار تو نہیں بنا سکتے..''

''ہاں.. ہم فوڈ بازار بنا سکتے ہیں.. بانو بازار اور ڈبّی بازار بنا سکتے ہیں لیکن تم ٹھیک کہتی ہو، خطاطی کا بازار نہیں بنا سکتے..''

''چیئر اپ.. پلیز تم اپنی آزردگی سے باہر آ جاؤ.. کیونکہ اب ہم تمہارے ایک دوست سے ملنے کے لیے جا رہے ہیں..''

''میرے دوست سے؟''

''ہاں.. ایک ایسے شخص سے جو سینکڑوں برس پیشتر ہزار دِقتوں اور دشواریوں سے.. جان جوکھوں میں ڈال کر تمہارے علاقوں میں پہنچا تھا.. جس شاہراہ ریشم پر تم ایئر کنڈیشنڈ کوسٹرز میں سفر کرنے سے گھبراتے ہو وہاں وہ ان زمانوں میں اپنا بھکشو لبادہ سنبھالتا دریائے سندھ کے اوپر معلق چٹانوں سے چمٹ چمٹ کر سفر کرتا تھا.. تم اس سے ملنا چاہتے ہو..''

''وہ ابھی تک زندہ ہے؟''

''ظاہر ہے، نہیں.. لیکن وہ پگوڈا ابھی تک موجود ہے جس میں ہندوستان سے لائے گئے سنسکرت اور پالی زبان میں تحریر کردہ بدھ مت کے مقدس مخطوطے رکھے گئے تھے اور پھر ان کا چینی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا.. چین میں بدھ مت کی ترویج کے لیے یہ مخطوطے

بے حد معاون ثابت ہوئے.. پتھروں کے جنگل میں تم نے وہ سلیں تو دیکھی تھیں جن پر بدھ مت کے وہ قوانین اور اصول درج تھے جو ہندوستان سے لائے گئے تھے..''

''تم ہیون سانگ کی بات تو نہیں کر رہی؟''

''ہاں تم اسے جانتے ہوگے.. وہ ایک بدھ بھکشو ہونے کے علاوہ ایک آوارہ گرد بھی تھا. تم نے اس کا سفرنامہ بھی پڑھ رکھا ہوگا...''

''اس کا سفرنامہ پڑھتے ہوئے مجھے تو یہ شک گزرا ہے کہ دراصل وہ ایک آوارہ گرد تھا جس نے بھکشوؤں کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا. صرف ثواب کی خاطر کوئی شخص اتنی صعوبتیں نہیں جھیل سکتا البتہ شوق آوارگی جو تمہیں سوکھے پتے کی مانند اڑاتا پھرتا ہے' اس کے فتور میں انسان یہ سب کچھ کر گزرتا ہے.''

''تم کیا ہو؟.. ایک بھکشو.. یا آوارہ گرد؟''

''ایک آوارہ گرد..'' میں نے ہنس کر کہا. ''جو بھکشو ہوتا جا رہا ہے.. اور ان دونوں میں فرق نہیں ہوتا.. درویش بھی جنگل کو نکلتا ہے اور آوارہ گرد بھی.. پتھر.. شجر اور بوٹے دونوں سے باتیں کرتے ہیں.''

''کیا تم بھی موجودہ ادبی فیشن کے مطابق صوفی ہوتے جا رہے ہو؟''

''نہیں تتلی. صوفی تو اپنے حجرے میں.. اپنی ذات میں.. اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پاتا ہے.. جب کہ درویش اور آوارہ گرد.. اور بھکشو جنگلوں اور ویرانوں میں بھٹک کر اس کی عظمتوں کے سراغ لگاتے ہیں اور ان کے گواہ بنتے ہیں..''

''تم صرف ویرانوں میں ہی نہیں گفتگو میں بھی بھٹک جاتے ہو. تو ہیون سانگ تمہارے ٹیکسلا تک بھی پہنچا تھا جس کی موہرہ مرادو خانقاہ کے اوپر پہاڑی کی ایک کھوہ میں واقع ایک غار تمہاری پسندیدہ آماجگاہ ہے..''

''تم مجھے ٹیکسلا کے یونانی شہروں اور خانقاہوں اور درسگاہوں کی یاد نہ دلاؤ.. جولیاں کے کھنڈروں میں ایک بغیر چھت کا ایسا کمرہ ہے.. کسی بدھ طالب علم کی ایک ایسی کوٹھڑی ہے جہاں لبوں پر جمی مٹی کے ذائقے کو.. کھلے آسمان تلے میں نے اپنی زبان تلے

محسوس کیا تھا. تم مجھے ہیون سانگ کے پاس لے چلو..''

ایک وسیع.. چوکور پتھروں سے تعمیر شدہ میدان کے آخر میں دایان پگوڈا ایک سات منزلہ کیک کی طرح شی آن کے آسمان میں بلند ہوتا تھا. سات آسمان. سات سُر. سات پردے.. سات ناقابلِ معافی گناہ... سات رنگ.. اور سات منزلیں.. دایان پگوڈا کی طرح.. اگرچہ اسے متعدد بار تعمیر کیا گیا لیکن اس کی اولیں خشت تقریباً تیرہ سو برس پیشتر رکھی گئی تھی اور بہت بعد میں ہیون سانگ خچروں پر لدے سنسکرت اور پالی زبان کے مقدس مخطوطے اس کے صحن میں لے کر آیا تھا..

پگوڈے کے اس صحن میں داخل ہوتے ہی ایک کشتی نما مختصر مندر دکھائی دیتا ہے جس کی ایک پتھریلی قوس سے ایک گھنٹی لٹکتی ہے..

ہر ایک نے اس گھنٹی کو حرکت دے کر اپنی آمد کا اعلان کیا..

اس گھنٹی کی ''ٹن ٹنا ٹن'' کس کی موت کا اعلان کرتی ہے.. یہ گھڑیال کسی غافل کو منادی دیتا ہے کہ گردوں نے تمہاری عمر کی اک اور گھڑی گھٹا دی..

مندروں میں آویزاں.. ان کے داخلے پر لٹکتی یہ گھنٹیاں اہل ایمان کے لیے ایک امتحان ہوتی ہیں.. آپ بے شک دانت جمائے.. اپنا ایمان بچائے ان سے غفلت کرتے ہوئے قریب سے گزر جائیں لیکن کہیں نہ کہیں آپ کے اندر انہیں بجانے کی خواہش ضرور سر اٹھاتی ہے.. دہلی کے برلا مندر اور نیپال میں میرے ساتھ یہی کچھ ہوا. کیا انسان بنیادی طور پر بُت پرست ہے... وہ وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتا ہے.. کبھی کسی پیر فقیر کی قبر کا.. کبھی خاکِ پاک پر سجدہ کرنے کا.. کبھی روضے کی جالی اور کبھی ایک سیاہ پتھر کا.. ایک خدا کے سامنے سجدہ کرنے سے اس کی تسلی نہیں ہوتی..

چنانچہ.. وفد کے ہر رکن نے.. بارلیش شاعر نے بھی مندر کی اس گھنٹی کو بظاہر ایک سیاح کی ہر شے کو پرکھنے کے تجسس میں لیکن دراصل ایک بُت پرست کی مجبوری کے تحت.. اس گھنٹی کو بجا کر شانتی حاصل کی..

لیکن اس کے بعد وفد کے اراکین.. دایان پگوڈا کی سات منزلوں پر ایک نگاہ

ڈالنے کے بعد ایک دوسرے کی تصویریں اتارنے میں محو ہو گئے..

لیو نے ایک عمدہ میزبان کی حیثیت کو مسلسل برقرار رکھتے ہوئے ہمیں دعوت دی کہ ہم میں سے جو کوئی بھی سکت رکھتا ہے..وہ اس پگوڈے کی ساتویں منزل تک جا سکتا ہے اور اس ہفت آسمان کی پیمائی کے لیے جو گراں قدر ٹکٹ درکار ہے وہ سرکار چین..یعنی اس کا نمائندہ لیو ادا کرے گا..

''اوپر کیا ہے؟'' نقلی جنرل نے اور شی آن کی شام میں میرے ساتھی نے ذرا ناراض سے لہجے میں دریافت کیا..

''اوپر...'' لیو عینک سنبھال کر شرارت سے مسکرایا۔''اوپر..صرف اوپر ہے..وہاں سے شی آن کا ایک پرندے کی آنکھ والا منظر دکھائی دیتا ہے۔''

''ہم کوئی پرندے اور درندے وغیرہ نہیں ہیں۔'' جنرل صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔''اور یوں بھی ہمیں ہارٹ کا پرابلم ہے..ہم اتنی بلندی پر نہیں جا سکتے..رہنے دو۔''

میں اگرچہ ایک سیلف سٹائلڈ دو نمبر قسم کا عمر رسیدہ کوہ نورد تھا لیکن میں نے بھی اس چھوٹے سے چینی کے ٹوکی بلندی کو نظر سے جانچا اور اس کی بلندی کو نامناسب حد تک بلند پایا اور وہاں تک نہ جانے کے کچھ اپنے تئیں بہانے بنا دیئے..

اس پر تتلی تو غصے سے لال پیلی ہو گئی..اور یہ ایسے رنگ تھے جو اس سے پیشتر اس کے پروں پر نمودار نہیں ہوئے تھے''تم کیسے احسان نافراموش بندے ہو..ایک ایسا شخص جو عہد قدیم کی تمام تر دشواریاں سہتا..جان داؤ پر لگاتا..برسوں میں قراقرم کے حصار عبور کرتا تمہارے ٹیکسلا تک جا پہنچا تھا اور جس کا سفرنامہ تم اپنی سٹڈی میں سینت سینت کر رکھتے ہو کہ وہ تمہیں صلاح الدین محمود ایسے کتابوں کے عشق میں فنا شخص نے تحفے میں دیا تھا.تم اس ہیون سانگ سے منسوب پگوڈے کی صرف سات منزلیں طے کرنے سے انکاری ہو رہے ہو.سخت احسان نافراموش ہو۔''

''دیکھو تتلی جی..اگر تو ہیون سانگ بہ نفس نفیس ساتویں منزل پر میرا انتظار کر رہا

ہوتا تو میں یہ کشٹ کاٹ لیتا.مگر اوپر تو کچھ بھی نہیں..''

''تم کیسے جانتے ہو کہ اوپر کچھ بھی نہیں... جب تک کہ تم اوپر پہنچ نہیں جاتے..''

تتلی باقاعدہ کنفیوشس ہو گئی۔''اگرچہ ہیون سانگ کے وہ مخطوطے اب اس پگوڈے میں موجود نہیں۔ان کے ترجموں کی چند قدیم کتابیں ہیں لیکن ایک نسبت تو ہے..بے شک دور کی ہے۔''

میں نے تتلی کی لعن طعن کی تاب نہ لاتے ہوئے آس پاس نظر ڈالی کہ کون ایسا حوصلہ مند ہے جو اس گناہ بے لذت اور پُرمشقت میں میرا ساتھ دے سکتا ہے..

یہ سفید ریش..اپنی قیمتی داڑھی کھجاتا..نہیں ہو سکتا تھا۔

لیل پوری شاعر کا سراپا آڑے آتا تھا..

حسرت ناک حسبِ حسرت خود کلامی میں مگن تھا کہ اچھا تو یہ ایک اور پگوڈا ہے..ایک تو چین میں پگوڈے بہت ہیں..آخر ان میں فرق کیا ہے..سب کے سب پگوڈے ہیں وغیرہ وغیرہ..

دیہقانی کہانی کار کو تصویریں اتارنے سے فرصت نہیں تھی..

گیسو دراز چند بدھ مت کی پیروکار خواتین کو گھنٹی بجانے میں مدد دے رہے تھے..

لیڈر قدرے غمگین تھا کہ وہ پہلی بار یہاں آیا تھا اور ایک معصوم مسکراہٹ کے ساتھ یہ اعلان نہیں کر سکتا تھا..آج سے بیس برس پیشتر جب میں یہاں آیا تھا تو یہ پگوڈا سات کی بجائے آٹھ منزلوں کا تھا..

میری نگاہ گیانی پر ٹھہر گئی۔''سر.کیا خیال ہے پگوڈے کے اوپر چلا جائے؟''

گیانی نے نہایت بے مروتی کا ثبوت دیا اور فوراً ہاں کر دی''چلیں..''

اگر وہ انکار کر دیتے تو سرخرو ہو جاتا اور اس مشقت سے بچ جاتا لیکن انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ ہاں..چلیں!چنانچہ ہم دونوں سورما بقیہ گروہ سے الگ ہوئے...لیو نے ٹکٹ کاؤنٹر تک ہمارا ساتھ دیا اور ہم بادشاہی مسجد سٹائل کی گھومتی ہوئی سیڑھیوں پر گھومتے چڑھتے گئے۔اگرچہ یہ سیڑھیاں لکڑی کی تھیں اور ناتوانوں کے لیے ہم جیسوں کے لیے

ریلنگ کا سہارا بھی تھا.. پہلی منزل تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول گیا اور میں حال سے بے حال ہوگیا.. لیکن اب میں واپس جانے کی پوزیشن میں ہرگز نہ تھا.. اس لیے نہ تھا کہ انہی سیڑھیوں پر ملک چین کے سب سے عمر رسیدہ.. شاید سینکڑوں برس کی عمروں کے بابے اور بابیاں بے تکلف اوپر چڑھتے آ رہے تھے اور کمبخت کے بیچے رک کر سانس تک نہ لیتے تھے.. میں کیسے واپسی کا بگل بجا دیتا.. چنانچہ ہیون سانگ کو کوستا کہ بھئی شریف آدمی تم کاہے کو اتنا تردد کر کے ہندوستان سدھارے تھے، اگر نہ سدھارتے تو ہم تمہارا احسان اتارنے کی خاطر اب یوں خوار نہ ہوتے.. ہر منزل پر پہنچ کر مجھ سے بہت پہلے پہنچ جانے والے چینی بابوں کو دیکھ کر زبردستی مسکراتا.. پھر اس منزل کی گیلری میں چاروں اَور گھوم کر شی آن کا نظارہ کرتا جو دھندلاتا جا رہا تھا.. ہونکتا.. سانس درست کرتا اوپر چڑھتا گیا..

آخری منزل پر جو گیلری تھی ایک چوبی گنبد کے نیچے وہاں سے شی آن کا نظارہ میں تب دیکھتا جب مجھے تھکاوٹ اور پسینے کے پار کچھ نظر آتا.. لیکن اس آخری منزل پر ایک درگاہ تھی جس کی زیارت کے شوق میں وہ تمام مائیاں اور بابے فوتیدگی کا خدشہ مول لے کر کشاں کشاں چڑھتے آتے تھے.. اس آخری منزل کے درمیان میں لکڑی کے فریم میں جڑی ہوئی ایک گرے پتھر کی سِل تھی اور سِل پر مہاتما بدھ کے پاؤں کے نشان ثبت تھے..

عمر رسیدہ چینی بابے اس سِل پر ہاتھ رکھ کر نہایت آبدیدہ ہو کر تصویریں کھنچواتے اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے نیچے اترنے لگتے..

''تارڑ صاحب.. ایک تصویر نہ ہو جائے..'' گیانی صاحب تازہ دم تھے۔ ان کی کلف زدہ شرٹ کی اکڑاہٹ جوں کی توں تھی.. ٹائی کی گرہ ڈھیلی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنی مونچھوں کو بَل دیتے تھے..

چنانچہ ایک تصویر ہوگئی جس میں ہم دونوں مہاتما بدھ کے پاؤں اپنے بازوؤں میں سمیٹے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے ہیں..

ویسے سوات کے قصبے نَل میں.. یک چشم روزی جان کے صحن میں تہ در تہ گندھارا عہد کے ستونوں، مجسموں اور سٹوپوں کے ٹکڑے اور جو کچھ ٹوٹ پھوٹ تھی ان میں ایک پتھر

پر اسی قسم کے بدھ کے پاؤں ثبت تھے جن کے قریب کھڑے روزی کے غلیظ بچے اس پتھر سے اپنی وہ انگلیاں پونچھتے تھے جو ان کی ناکوں سے باہر آتی تھیں..

متروک خدا بھی کتنے بے بس ہوتے ہیں..

کہیں ان کے پاؤں کے نشان شی آن کے پگوڈے کے ساتویں آسمان پر زیارت کے لیے رکھے جاتے ہیں..

اور کہیں غلیظ بچے ان کے ساتھ ناکیں پونچھتے ہیں..

اسی لیے خدا کوشش کرتے ہیں کہ وہ کبھی متروک نہ ہوں..

اور پھر بھی ہو جاتے ہیں..

''شی آن لاؤسن ریستوران میں اسلامی بہنیں اور مسلم فوڈ''

کوچ میں واپس پہنچے تو وہاں رُت بدل چکی تھی..

جو چلبلے اور کھلنڈرے ہوئے جاتے تھے اب یوں اداس بیٹھے تھے جیسے بقول کسے ان کی ماں مرگئی ہو..اس تبدیلیٔ آب و ہوا کا سبب وہ اعلان تھا جس میں خاور نے وفد کے اراکین کو مطلع کیا تھا..''حضرات آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ شی آن میں آپ کی میزبان اور انچارج..اپنے سرکاری کام بھگتا کر پھر سے ہمارے درمیان موجود ہیں اور اب ہم آپ کی دیرینہ خواہش کے احترام میں دوپہر کے کھانے کے لیے ایک معروف مسلم ریستوران میں جائیں گے جو اہل شی آن کا پسندیدہ ہے..اور وہاں آپ جی بھر کے حلال فوڈ کھا سکتے ہیں..''

اس اعلان پر ہم سب پہلے روئے..اور پھر ہنسے..

روئے..آسمانی آفت کی واپسی پر اور ہنسے اس لیے کہ اتنے دنوں کی نیم فاقہ کشی کے بعد آج مسلم فوڈ نوش کریں گے..

شی آن لاؤسن ریستوران..بیل ٹاور کی قربت میں ایک چوڑی، معروف اور دیدہ زیب شاہراہ پر واقع تھا اور شاندار عمارت رکھتا تھا..

ہم سب کوچ سے اتر کر نہایت مؤدب ہو کر اس میں داخل ہوئے کہ یہ ریستوران

مسلمان واقع ہوا تھا..معلوم ہوا کہ اس کی چھ شاخیں چین کے مختلف شہروں میں کفار اور اہل ایمان کے حلق تک خوراکِ حلال پہنچاتی ہیں۔

ہم اس جذبۂ ایمانی سے معمور سر جھکائے جب ریستوران کی پہلی منزل تک پہنچے تو فوراً ہی ایک پُرکشش شراب خانے کی موجودگی نے ہمیں شدید صدمے سے دوچار کر دیا..ہم میں سے بیشتر حضرات لاحول پڑھتے اور کچھ سبحان اللہ کہتے اپنا دامن بچا کر آگے چلے گئے..آگے گئے تو ایک کمرے میں شیشے کے مرتبانوں میں سانپ، مینڈک اور کرلے وغیرہ سرسرا اور کلبلا رہے ہیں جنہیں حسب پسند فوری طور پر روسٹ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا تھا..یہ یقیناً صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے برگشتہ قسم کے مسلمانوں کا ریستوران تھا لیکن ہمیں فوری طور پر تسلی دی گئی کہ یہ بندوبست صرف چینی بلکہ غیر مسلم چینی گاہکوں کی خوشنودی کی خاطر ہے..آپ خاطر جمع رکھیں، ابھی یہاں مسلمانی کے مکمل ثبوت پیش کر دیئے جائیں گے..

اور پہلا ثبوت ان اسلامی ویٹرسوں کی سرخ ٹوپیوں پر چاند ستارے کی صورت میں نقش تھا جو نہایت مختصر سکرٹس میں ملبوس تھیں..اس چاند ستارے کو دیکھ کر ہم نہایت رقیق القلب ہو گئے اور طے کر لیا کہ یہ اسلامی بہنیں ہمیں جو کچھ بھی پیش کریں گی ہم بخوشی اسے نوش کر جائیں گے..اگرچہ بعد میں کھلا کہ یہ بہنیں مسلمان نہیں ہیں صرف اس ریستوران کی روایت کو نبھانے کی خاطر چاند ستارے سجائے پھرتی ہیں۔

یہاں بھی آسمانی آفت نے اپنے لیے ایک الگ میز کا چناؤ کیا..لیو، خاور اور وانگ لی کو اپنے ہمراہ براجمان کیا کیونکہ ان کی خوراک کی نوعیت مختلف ہوتی تھی..

لاؤسن ریستوران کا ایک چمکیلا رنگین باتصویر مینو کارڈ میں نے انتظامیہ کی اجازت سے حاصل کر کے اپنے بیگ میں سنبھال لیا..اجازت نہ ملتی تو بھی میری نیت اسے سنبھال لینے کی ہی تھی..ایک منفرد یادگار کے طور پر..

مینو کارڈ پر شی آن لاؤسن ریستوران کی انگریزی عبارت کے نیچے عربی حروف میں لکھا تھا ''تعریف عام لمطع لاوسون جیا''

مینو کارڈ کے اندرونی اوراق میں ریستوران کی تاریخ اور مسلم خوراک کی رنگین تصاویر اور تفاصیل تھیں..مثلاً یہ کہ یہ ریستوران 1898ء میں وجود میں آیا۔ یہاں شانسی صوبے کا مشہور عالم پسندیدہ مٹن سوپ اور ریزہ ریزہ ڈبل روٹی ملتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جس نے شی آن میں آ کر ٹیرا کوٹا آرمی نہیں دیکھی اور لاؤسن کا مٹن سوپ نہیں پیا تو گویا اس نے کوئی اور شہر دیکھا شی آن نہیں دیکھا۔مینو کارڈ پر تقریباً تمام ڈشیں مٹن کی تھیں..اس کے علاوہ ڈمپلنگ خاص ڈش تھی..یہ ڈمپلنگ نہایت بدمزہ قسم کے کچّے سے سموسے ہوتے ہیں جنہیں اہل چین کچھ زیادہ ہی رغبت سے کھاتے ہیں اور اگر وہ..یعنی اہل چین آپ کی بہت ہی عزت افزائی کرنے پر اتر آئیں تو وہ آپ کو ڈمپلنگ کھلاتے ہیں..نہ کھائیں تو زبردستی کھلاتے ہیں کہ یہ ڈمپلنگ ہیں..مینو میں ایک ڈش ''مٹن برفانی کنول کے ساتھ'' تھی..لیمب سٹیک۔ روسٹ بکرا۔ روسٹ لیمب لیگ۔ بکرے کا مغز اور آخر میں مسلمانی پر گویا مہر لگادی گئی تھی یعنی..اونٹ کے پائے!

ان خوراکوں کی تصاویر تلے انگریزی کے علاوہ عربی میں بھی ان کی توصیف درج تھی..ہمارے لیے قابل فہم طور پر مشہور عالم مٹن سوپ اور ریزہ ریزہ ڈبل روٹی کا آرڈر دیا گیا جسے نوش کر کے ہی ہمارا شی آن مکمل ہوتا تھا..مٹّی کے سپاہیوں کی شرط تو ہم پوری کر چکے تھے..

تھوڑی دیر بعد سرخ ہلالی ٹوپیوں والی دوشیزاؤں نے ہمارے سامنے سوپ کی بجائے ایک سخت پتھریلی ڈبل روٹی اور ایک خالی پیالہ رکھ دیا..

''تتلی..'' میں نے فوراً دہائی دی..

''کیا ہے؟'' وہ فوراً حاضر ہوگئی..

''اب ان کا کیا کریں؟'' میں نے مدد چاہی..

''پہلے اس ڈبل روٹی کو اپنی پوروں سے ریزہ ریزہ کرو..جیسے پرندوں کو ڈالنے کے لیے کرتے ہیں..''

''لیکن میں کیوں کروں..یہ ریستوران والے خود کیوں نہیں کرتے؟''

''اس لیے کہ ہر شخص کے پسندیدہ ریزے الگ ہوتے ہیں..ان کا حجم مختلف ہوتا ہے..''

''وہ ذات کے ریزے ہوتے ہیں..ڈبل روٹی کے تو نہیں..''

''ڈبل روٹی کے بھی ہوتے ہیں..تم شرافت سے اس خصوصی سوپ کے روایتی تقاضے پورے کرو اور اپنی پسند کے ریزے کرو۔''

چنانچہ ہم سب اس سخت ڈبل روٹی کے ریزے کرنے میں جُت گئے..آئے تھے اطمینان سے کھانا کھانے کے لیے..اور یہاں ہمیں قیدیوں کی مانند مشقت پر لگا دیا گیا تھا..پرندوں کے لیے خوراک تیار کرنے پر لگا دیا گیا تھا..

تقریباً پندرہ منٹ تک ہم سب سر جھکائے نہایت تن دہی سے اپنے پپوٹوں سے یہ ریزے بناتے رہے جیسے ایک زمانے میں میری اماں جان پپوٹوں سے سوّیاں مسلتی تھیں اور انہیں ''پپوٹوں کی سوّیاں'' کہا جاتا تھا..

یکدم دہقانی کہانی کار نے سر اٹھایا..ایک معصومیت بھری مسکراہٹ کو لبوں پر پھیلا کر اعلان کیا ''لو جی میں جیت گیا..میں نے پوری ڈبل روٹی کے ریزے کر لیے ہیں..بے شک پرندوں کو ڈال کر دیکھ لو..''

اس پر آسمانی آفت کی میز کی جانب سے لیو کی پکار آئی..''ڈبل روٹی کے ٹکڑے جتنے چھوٹے ہوں گے اتنی ہی آسانی سے وہ سوپ میں نرم ہو جائیں گے..انہیں مزید باریک کریں۔''

بالآخر یہ ہفت خواں بھی طے ہوا اور سب کے پیالے ڈبل روٹی کے ریزوں سے لبریز ہو گئے...جونہی ہم اس مشقت سے فارغ ہوئے سرخ ٹوپیوں والی خواتین نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر وہ پیالے اٹھا لیے اور چلی گئیں۔

''بھئی اب یہ کہاں چلی گئی ہیں..'' میں نے تتلی سے پوچھا۔

''یہ ان پیالوں میں شی آن کا مٹن سوپ انڈیل کر واپس لے آئیں گی..''

''ٹھیک ہے وہ واپس لے آئیں گی..ہمارے پیالوں کا ہتھیلیوں پر ایک پگوڈا سا کھڑا کر کے لے گئی ہیں لیکن یار انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ کونسا پیالہ میرا ہے..کیونکہ میں نے تو بڑی جانفشانی سے اپنی ڈبل روٹی کے ریزے کیے ہیں اور حسرت ناک نے بڑے موٹے

موٹے ٹکڑے کر کے گلوخلاصی کر لی ہے..اب وہ اس کا پیالہ میرے سامنے اور میرا پیالہ اس کے سامنے دھر گئیں تو میری محنت تو اکارت جائے گی۔"

"نہیں جائے گی.تمہارا پیالہ تمہارے سامنے ہی آئے گا..انہیں حساب کتاب آتا ہے.."

اور واقعی ویٹرسوں نے ایک خاص حسابی کتابی نظام کے تحت وہ پیالے اٹھائے تھے اور ان میں سوپ انڈیل کر اسی ترتیب سے ہمارے سامنے رکھ دیئے تھے..ہر ایک کے سامنے وہی پیالہ تھا جس میں اس کی محنت شاقہ کے ذرّے تھے..

جن لوگوں نے محنت کی تھی ان کے ریزے نرم اور مزیدار تھے اور جنہوں نے جان چھڑائی تھی ان کے ریزے سخت رہ گئے تھے..

اس سُوپ میں کچھ سوّیاں سی تھیں..اور مٹن کے نہایت خوش رنگ نتھرے ہوئے قتلے تھے..

سُوپ ذائقے میں اور منظر میں بہت عمدہ اور شفاف تھا..اگرچہ ہماری خواہش تھی کہ اس میں سُرخ مرچیں نہ سہی..کم از کم ہری مرچوں کا تھوڑا سا تلخ ذائقہ بھی شامل ہوتا..ہماری میز پر سُوپ کے علاوہ کچھ اور خوراکوں کو بھی زینت بنایا گیا لیکن ہم بمشکل سوّیوں اور مٹن کے قتلوں کو نوش کرتے سُوپ سُرکتے پیالوں کی تہہ تک پہنچے..کسی اور خوراک کے ایک لقمے کی گنجائش باقی نہ رہی..

البتہ دوسری میز پر..آسمانی آفت نے جانے کون کون سے پکوان آرڈر کیے تھے کہ ڈشیں میز کے کونوں سے امڈی پڑتی تھیں اور ڈارلنگ آفت اپنی چپٹی ناک ان پر جمائے ان کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے میں مشغول تھی..

میں نے فارغ ہو کر خاور کو پکارا "آپ لوگ کیا کھا رہے ہیں؟"

"کچھ چینی کھانے اور کچھ مسلم فوڈ..." وہ بھی نہایت مشغول تھا..

"مسلم فوڈ میں کیا ہے؟"

"آئیں اور چکھ کر دیکھ لیں۔"

چنانچہ میں ان کی میز پر چلا گیا..اور چکھتا چلا گیا..اور جو کچھ چکھا اسے حسب توقع بدمزہ پایا اور چینی پایا۔"مسلم فوڈ کونسی ہے؟"

"یہ.."اس نے ایک طشتری کی طرف اشارہ کیا جو میز پر دھری دیگر خوراکوں کے درمیان نہایت نمایاں تھی..اس میں گاڑھے شوربے میں نہاتی ہوئی ایک دُم سی تھی..

"یہ کیا ہے؟ یہ دُم سی لگتی ہے۔"

"اور یہ دُم ہی ہے..گائے کی دُم.." خاور نے کہا۔"چکھ لیں.."

میں نے سوچا یہ وہی دُم ہے جس سے یہ گائے..اگر یہ گائے تھی تو..اپنے بدن پر بیٹھتی مکھیوں کو اڑاتی ہوگی..یہ اس کی لید سے بھی لتھڑتی ہوگی..پھر خیال آیا کہ اگر خوراک میں سوچ بچار کا عمل دخل ہو جائے تو بندہ بھوکا مر جائے..مرغی کی ڈش کو دیکھ کر وہ جو شدید قسم کا ناقابلِ بیان گند بلا کھاتی ہے، وہ یاد آ جائے..سری پایوں کی اصلیت پریشان کر دے..مغز کھانے کو جی نہ چاہے..اور گردے کپورے سامنے آئیں تو نظامِ کپورہ جات کے عمل سے گھن آنے لگے..تو ان کے مقابلے میں ایک گائے کی دُم کی کیا حیثیت ہے۔

بہرحال اس پر تو کسی کو اختلاف نہ تھا کہ گائے چونکہ ہندوؤں کے نزدیک نہایت پوّتر اور قابلِ پرستش تھی۔اس لیے ہم مسلمین کے لیے اسے حلال کر کے کھانا عین ثواب تھا..یوں بھی گائے..ہمارے اللہ میاں کی گائے تھی..

اس ڈش میں..شوربے میں تیرتی گائے کی زنجیر نما دُم..اور اس کی ہڈیوں کے درمیان جو گوشت تھا، وہ ذائقے کی ذات میں ایک انجمن تھا..بے حد مختلف اور انوکھے ذائقے کا تھا..

ادھر باریش شاعر انتہائی جذباتی ہو رہے تھے..

انہوں نے صرف اس لیے کہ ویٹرسوں کی سرخ ٹوپیوں پر چاند ستارہ آویزاں تھا..انہیں ٹِپ کی صورت میں متعدد ڈالروں اور سینکڑوں یوآن سے نواز دیا..یہ خواتین اگر مجرا بھی کر رہی ہوتیں تو وہ ان پر اپنی تمام تر متاع نچھاور کر دیتے.."یہ ہماری اسلامی بہنیں ہیں۔"

اگرچہ وہ سراسر چینی..بے دین کنفیوشس بہنیں تھیں..

بہرحال اس اسلامی خوراک نے ہمارے جذبۂ ایمان کو مہمیز دی.. ہم جو پچھلے کئی روز سے چینی خوراک کی بُو اور ذائقے سے عاجز آئے ہوئے تھے' اپنے مسلم مٹن سوپ.. سے تروتازہ ہو گئے.. ہمارے معدوں نے پہلی بار فریاد نہ کی.. بلکہ اسے خوش آمدید کہا.. اور اگر آس پاس کہیں جہاد جاری ہوتا تو ہم یقیناً اس میں شامل ہو جاتے..

ہم اونگھتے ہوئے.. کہ یہ مسلم فوڈ کا اوج کمال ہے.. اپنی کوچ میں آ بیٹھے.. اور اب مکمل طور پر ہوٹل واپس پہنچ کر ایک عدد طویل قیلولہ فرمانے کے موڈ میں تھے' جب آسمانی آفت نے ایک گائے کی دُم جتنا لمبا ڈکار لیتے ہوئے اعلان کیا بلکہ حکم جاری کیا۔ ''ہم اب شی آن میوزیم جائیں گے۔''

''ہیں؟'' جنرل صاحب اونگھ سے چونکے..

''اوئے..'' دہقانی کہانی کار نے کہا..

''کس کو کہہ رہے ہو؟'' حسرت ناک بولا..

''خاتون.. اپنے فیصلے پر نظرثانی کیجیے براہ کرم..'' گیسو دراز نے ٹی شرٹ میں سے مزید ابھرتی توند پر ہاتھ پھیرا..

''تارڑ بھائی.. یہ کیا کہہ رہی ہے.. ہم تو لیل پور کے مرغ پلاؤ کھا کر کہیں نہیں جاتے تو اب کہاں جائیں گے.. اسے سمجھائیں۔'' لیل پوری شاعر نے مجھ سے رجوع کیا..

''آہو جی..'' سفید ریش شاعر نے صرف اتنا کہا..

صرف لیڈر تھا جو نہایت عیار اگرچہ معصوم آنکھوں سے ناپ تول کر رہا تھا کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے..

جب تک کوئی اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ جاتا، کوئی بھی اہلِ لیڈر بیان بازی نہیں کرتا.. اور اس لیے لیڈر چپ رہا..

''خاور...'' میں نے اپنے اکلوتے بہی خواہ سے درخواست کی۔ ''ہم بہت تھک چکے ہیں.. ہم پتھروں کے جنگل میں گئے.. خطاطی کے بازار میں سیر کی.. ہیون سانگ کے پگوڈے کی ساتویں منزل پر پہنچ کر لارڈ بُدھا کے چرن چھو آئے.. اور ابھی مسلم فوڈ کھا کر آئے

ہیں جس نے ہمیں پوستی بنا دیا ہے.. ہم اب کہیں بھی نہیں جانا چاہتے.. ریسٹ کرنا چاہتے ہیں.. قیلولہ کرنا چاہتے ہیں۔''

''شی آن میوزیم..'' خاور بھی بے دید ہو گیا۔ ''میڈم کہتی ہیں کہ اب شی آن میوزیم.. تو اب شی آن میوزیم.. اس لیے کہ میڈم کہتی ہیں۔''

’’شی آن عجائب گھر.. مٹی کا سپاہی زندہ ہوتا ہے‘‘

شی آن میوزیم کی سلیٹی ڈھلوان چھتوں والی عمارتیں کیسی نفیس اور نظر کو بھانے والی تھیں..اس کے لان میں سفید پتھر کا ایک عجیب شیر کھڑا تھا جس میں ہیبت کی بجائے ایک پیارا پن تھا جیسا ایک پانڈے میں ہوتا ہے..گھاس گہری اور گیلی سبز تھی اور ایک ٹھہراؤ تھا..ایک تنہا سکون تھا جو ٹانگ عہد کی عمارتوں میں ہوتا ہے..

ہم نے کسی حد تک میڈم کی زبردستی کو معاف کر دیا..

اگر ہم مٹی کے سپاہیوں کو دیکھ کر..لاؤسن ریستوران کا مٹن سُوپ نوش کر کے چلے جاتے تب بھی شی آن نہ دیکھتے..جب تک کہ یہ میوزیم نہ دیکھتے..

میوزیم کے لان میں داخل ہونے سے پیشتر ہم ان درجنوں سووینئر شاپس، بک سٹورز اور دستکاری کی دکانوں کی ایک ایسی نمائش گاہ میں سے گزرے جو اپنی ذات میں ایک منی ایچر میوزیم تھی کیونکہ یہاں آپ کو شی آن میوزیم میں نمائش شدہ ہر مجسمے.. ہر گڑیا اور ہر برتن کا نقش ثانی یا نقل مل جاتی تھی بلکہ چین کے جتنے بھی بڑے عجائب گھر ہیں، ان میں رکھے گئے ہر شاہکار کے نمونے یہاں برائے فروخت تھے۔ اگر چہ ان نقول کی قیمت ان کی اصل کے قریب تھی...

میں نے اس گرانی کی شکایت تہانا سے کی۔ ’’چھوٹے موٹے کھوکھوں اور سٹالوں وغیرہ میں تو اگر خاتون دوکاندار کسی شے کے ہزار یوآن طلب کر کے وہی نادر نمونہ صرف سو

یوآن میں عنایت کر دیتی ہے تو یہ قابل فہم ہے..لیکن سرکاری دوکانوں اور سٹورز میں بھی یہی چلن ہے..اب یہاں میں وہی گھوڑے دیکھ رہا ہوں جو بیل ٹاور کی دوکان میں پانچ سو یوآن کے تھے..خطاطی کے بازار میں ڈیڑھ سو یوآن میں میسر آ گئے اور یہاں ان گھوڑوں کا سیٹ بارہ سو یوآن میں فروخت ہو رہا ہے اور اگر آپ قیمت سن کر ذرا کھسکنے لگتے ہیں تو سیلز گرل مسکرا کر کہتی ہے۔ ’’یو فرینڈ..فار یو اونلی ون تھاؤزنڈ یوآن‘‘ تو یہ کیا تفاوت ہے، کیا سلسلہ ہے؟‘‘

’’ایک تو ہم چینیوں کی تسلی نہیں ہوتی جب تک بھاؤ تاؤ نہ کریں..اور یہاں ایک تصور یہ بھی ہے کہ صرف سادہ لوح لوگ منہ مانگی قیمت ادا کرتے ہیں..لیکن اصل مسئلہ ایک ملک دو نظام کا ہے۔ ابھی ہمیں کمیونزم میں کیپٹل ازم کے تڑکے کی عادت نہیں ہو رہی کہ کیسے چیز فروخت بھی کرنی ہے اور مسکرا کر گاہک کی کھال بھی اتارنی ہے..یوں بھی یہ دکانیں یورپی اور امریکی سیاحوں کے لیے ہیں جنہیں یہ اشیاء اپنی کرنسی میں ڈرٹ چیپ لگتی ہیں..تم انہیں نہ دیکھو..بس کان لپیٹ کر میوزیم میں چلے جاؤ۔‘‘

میں نے اپنے کان لپیٹے اگر چہ وہ اچھی طرح نہیں لپٹے اور لان میں سے گزر کر میوزیم کی مرکزی عمارت میں داخل ہو گیا..

یہاں جتنا کچھ نمائش کیا گیا تھا اور وہ بہت کچھ تھا.شی آن کے چین کے پہلے دارالسلطنت ہونے اور اس کی قدیم ثقافت کے آغاز کے ثبوت تھے..اور یہ ثبوت اتنی کثرت میں تھے کہ میں ان کی تفصیل بیان کر کے قارئین کے صبر کا امتحان نہیں لینا چاہتا.. البتہ یہاں بھی ایک مرتبہ پھر ٹیراکوٹا آرمی کے سپاہیوں سے ملاقات ہو گئی جو شیشے کے ایک شوکیس میں درجنوں کی تعداد میں قید تھے..اور لگتا تھا کہ ان کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ اس قید سے باہر آنا چاہتے ہیں..یہ وہ جنگی قیدی تھے جنہیں جدید چین نے ایک شوکیس میں بند کر کے بے بس کر دیا تھا..

مٹی کے یہ سپاہی اور جرنیل تھے اور انہیں ان کے مدفن سے خصوصی طور پر یہاں اس لیے لایا گیا تھا کہ جو لوگ ٹیراکوٹا میوزیم تک نہیں جا سکتے‘ وہ یہاں شی آن میں ہی ان کی

زیارت کر لیں..ٹیرا کوٹا میوزیم میں وہ اسی مٹی پر کھڑے تھے جہاں ہزاروں برس پیشتر انہیں کھڑا کر دیا گیا تھا اور پھر ان کے اوپر بانس کی چھتیں ڈال کر دفن کر دیا گیا تھا...وہاں وہ سیاحوں پر حاوی تھے اس لیے کہ وہ تو اپنے گھر میں مقیم تھے اور لوگ باہر سے انہیں ملنے کے لیے آتے تھے..لیکن یہاں وہ اسی لیے بے جان اور بے بس لگتے تھے کہ وہ بے گھر ہو چکے تھے..البتہ یہاں سیاح ان پر حاوی اس لیے تھے کہ وہ شیشے کے شوکیس کے ساتھ ناکیں چپکائے ان کی شباہتوں اور مسکراہٹوں کا چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو مشاہدہ کر سکتے تھے..اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر تصویریں بھی اتروا سکتے تھے..اور وہاں اس کی اجازت نہ تھی..

اور جو تصویر میں نے بصد شوق اتروائی' اس میں کُرتے شلوار میں اپنے موٹاپے کو چھپانے کی خاطر پیٹ پر ہاتھ باندھے میں زبردستی مسکرا رہا ہوں اور میرے عقب میں دو تین درجن مٹی کے سپاہی سکوت میں کھڑے ہیں اور کیا آپ یقین کریں گے کہ ان چہروں پر میرے لیے ناپسندیدگی کے آثار ہیں بلکہ ایک سپاہی تو ایسا ہے جو زرہ بکتر پہنے، بل دار مونچھوں کے ساتھ نہ صرف مجھے گھور رہا ہے...بلکہ زیر لب بڑبڑاتا دکھائی دیتا ہے کہ اوئے یہ تم کیا کر رہے ہو..میں قید میں نہ ہوتا تو تم سے نپٹ لیتا..

میں اس سپاہی کو کیا کہتا کہ بھائی جان آپ ہمارے ہاں قید میں نہیں ہیں..اپنی مرضی سے شوکیس میں سے باہر آتے ہیں، ہم پر حکمرانی کرتے ہیں اور پھر ایک مختصر مدت کے لیے پھر سے شوکیس میں جا کھڑے ہوتے ہیں اور ہمیں گھورتے رہتے ہیں کہ..اوئے یہ تم کیا کر رہے ہو؟..

اس مٹی کے سپاہیوں سے مزیّن شوکیس والے ہال کے دوسری جانب انہیں شاندار رتھوں کے شاہی نمونے ہیں جن کے اوریجنل ٹیرا کوٹا میوزیم میں ہم دیکھ چکے تھے..یہاں بھی یہ سہولت تھی کہ تصویریں اتارنے کی اجازت تھی اور گھوڑوں کے پھڑکتے ہوئے نتھنے اور سنہری باگیں گھوڑوں کے منہ سے منہ لگا کر یعنی براہ راست فرام ہارسز ماؤتھ ملاحظہ کی جا سکتی تھیں...شی آن میوزیم میں ہی مَیں نے زندگی کا سب سے بڑا..ایک عام سائز کے کمرے جتنا..پتھریلا شیر دیکھا جو ہزاروں برس پیشتر تراشا گیا تھا اور کسی شاہی محل

کے کھنڈروں میں سے برآمد ہوا تھا..

چینی مٹی کے ظروف، خطاطیاں، برتن، کانسی کے جام، شراب کے مٹکے اور صراحیاں چینی گڑیاں..پیکنگ کی نہیں شی آن کی پُتلیاں..کانسی کے مجسمے اور جانے کیا کیا..دیکھتے نہیں صرف سرسری نگاہیں ڈالتے ہم ان میں سے گزرے اور میوزیم سے باہر آتے ہیں تو ہمیں خوش خبری دی جاتی ہے کہ اب ہم ہوٹل واپس جا سکتے ہیں..آرام کر سکتے ہیں..اور پھر پورے سات بجے ہمیں لاؤنج میں اترنا ہو گا جہاں سے ہم شی آن کا مشہور عالم کلاسیکی چینی آپرا دیکھنے جائیں گے..اور ظاہر ہے اس سے پیشتر کھانا بھی کھائیں گے..

لیکن میوزیم سے باہر آتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ شیشے کے شوکیس کی قید میں سے نکل کر مٹی کا ایک سپاہی میرے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تم سے زیادہ خوش نصیب ہوں کیونکہ میں تو کسی نہ کسی صورت میں اپنی شباہت اور شکل کے ساتھ ابھی تک موجود ہوں لیکن آج سے ایک ہزار برس بعد تم کہاں ہو گے..

کہیں بھی نہیں..

تمہارا کوئی سراغ نہ ہو گا..

تم جس مٹی میں مٹی ہو گے اس پر نئی بستیاں آباد ہوں گی..

جیسے چند سو برسوں میں میرؔ کی قبر کا کوئی سراغ نہیں ملتا..کسی ریلوے سٹیشن کے احاطے کے اندر شاید کسی ریلوے سگنل کے نیچے بے نام ہے..بے شک میرؔ کی مانند تم یہ پکارو کہ گور کس دل جلے کی ہے میرؔ..

اسی لیے میں تم سے زیادہ خوش نصیب ہوں کہ میں ہزاروں برس بعد بھی بے شک مٹی کی صورت میں موجود تو ہوں..

"تتلی.." میں نے ایک بار پھر اپنی محسن خاتون کو پکارا۔ "اس مٹی کے سپاہی سے چھٹکارا حاصل کرو..یہ کیوں میرے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔"

"سپاہی..لوٹ جاؤ.." تتلی نے اسے آرڈر آف دی ڈے دیا۔ "جہاں تم تھے وہیں لوٹ جاؤ۔"

سپاہی ڈسپلن کا پابند اباؤٹ ٹرن ہوا اور پھر سے اپنے شیشے کے شوکیس میں جا قید ہوا.. ساکت ہوا..

لیکن... اس کا یہ کہنا میرے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا.. کہ میں تم سے زیادہ خوش نصیب ہوں کیونکہ میں تو کسی نہ کسی صورت میں.. بے شک بے جان اور مٹی کی صورت میں اپنی شکل اور شباہت کے ساتھ ابھی تک موجود ہوں لیکن آج سے ایک ہزار برس بعد تم نہ ہو گے..

اگر ڈسپلن کا پابند سپاہی تتلی کی دھمکی کے بعد اپنے شوکیس میں نہ لوٹ گیا ہوتا تو میں اسے کہتا ''شٹ اپ.. سپاہی.. میں تمہاری بار بار آمد سے تنگ آ گیا ہوں۔''

''اژدھے کا دل۔ بیدِ مجنوں کا گیت اور چینی موتی''

اور ہم ایک مرتبہ پھر چلبلے اور کھلنڈرے ہو رہے تھے..

آج صبح بھی ہوئے تھے.. اور اب پھر ہو رہے تھے..

شی آن کی شام کی دلآویزی ہم پر اثر کرتی تھی اور اس کا سبب پھر وہی سبب تھا یعنی آسمانی آفت کی غیر موجودگی.. اس نے آج کی شام کے لیے ہمیں لیو اور خاور کی سپرداری میں دے دیا تھا.. شاید یہ گائے کی اس دُم کا اثر تھا جو اس نے دوپہر کے کھانے میں نوش کی تھی.. اگر ایسا تھا تو ہم گائے کی اس دُم کے شکر گزار تھے..

ٹانگ ڈائی نیسٹی ہوٹل شی آن:.

اس مشہور ہوٹل کا ایک وسیع ڈائننگ ہال جس میں ہم چینی آپرا دیکھنے سے پیشتر ایک شاندار طعام دیکھتے تھے اور ہمیں یہ طعام پسند نہیں آ رہا تھا اور ہم اس کی جانب زیادہ راغب نہیں ہو رہے تھے..

ہم اسے دیکھتے اور پرکھتے زیادہ تھے اور کھاتے کم تھے..

''تم میں ذوقِ جمال کا شدید فقدان ہے..'' تتلی تھی تو چینی نژاد اس لیے جب کبھی میں کسی چینی خوراک کو دیکھ کر ذرا ناک چڑھاتا تو وہ ناراض ہو جاتی.. سُبکی محسوس کرتی..

''بالکل ہے..'' میں نے اقرار کیا۔ ''لیکن تتلی تم اپنے چینی تعصبات کچھ لمحوں کے

لیے فراموش کر کے ذرا انصاف کرو کہ میں یہ جھینگے، مچھلیاں، پرانے انڈے اور ملغوبے وغیرہ کیسے رغبت سے کھا سکتا ہوں.. ابھی ابھی میں نے منہ میں کچھ ڈالا تھا اور وہ مجھے حرکت کرتا ہوا محسوس ہوا تھا.. اب میں زندہ حالت میں تو کچھ نگل نہیں سکتا..''

''ذرا اس ٹانگ ڈائی نیسٹی ہوٹل کا مینو غور سے پڑھو..''

مینو کے متعدد رنگین اوراق تھے جن میں خوراکوں کی تفصیل کے علاوہ گلابی پیراہنوں اور بدنوں والی دوشیزاؤں کی انگڑائیوں کے ہوشربا نظارے بھی تھے..

''نہایت ہی اشتہا انگیز خواتین ہیں..''

''نہایت ہی شرم کی بات ہے.. تم کھانوں کی تفصیل پر توجہ نہیں دے رہے..'' تتلی نے مینو مجھ سے چھین لیا۔ ''تم نہیں جانتے کہ تم کیسی کیسی عجوبہ اور شاعرانہ ناموں والی ڈشز کھا رہے ہو.. بلکہ نہیں کھا رہے..''

''مثلاً؟''

''مثلاً تم نے یہ ''چین کے موتی'' چکھے تک نہیں.. یہ سمندری خوراک ہے۔''

''میں انہیں پہن تو سکتا ہوں کہ یہ مغل بادشاہوں کا پسندیدہ پہناوا تھا لیکن میں انہیں کھا نہیں سکتا.. عجیب لیس دار اور کچا سا کچھ ہے..''

''تو پھر تم نے یہ سوپ پیا ہے جو ''شاہی شادی'' ایسا شاہانہ نام لیے ہوئے ہے.. یہ نہایت بیش قیمت سیاہ کھمبوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک قدیم ریسی پی کے ساتھ.. تقریباً دو ہزار برس پیشتر یہ سوپ ایسے ہی تیار کیا جاتا تھا..''

یہ سوپ شکل سے لگتا تھا کہ دو ہزار برس پیشتر ہی تیار کیا گیا تھا..

''اچھا.. تو یہ بلیک مشروم ہیں جو پانی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ میں نے تو انہیں کوئی خاص قسم کے مکوڑے جان کر اجتناب کیا تھا ورنہ میں تو مشروم بے حد پسند کرتا ہوں۔''

چنانچہ تتلی کی سفارش پر میں نے وہ ''شاہی شادی'' مشروم سوپ چکھا لیکن حیرت ہے کہ اس کا ذائقہ مکوڑوں ایسا ہی تھا.. اگرچہ میں نے اس سے پیشتر کبھی مکوڑے نہیں کھائے تھے لیکن قیاس یہی تھا کہ ان کا ذائقہ اسی نوعیت کا ہوگا..

تتلی نے دیکھا کہ میں اس کی سفارشات پر عمل کر رہا ہوں تو مجھ سے خوش ہوگئی اور مزید سفارشیں کرنے لگی۔ ''اب یہ ڈش جسے کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا، نہایت پُرذائقہ ہے.. اسے ''اژدھے کا دل'' کہا جاتا ہے اور اس میں پھلوں کی قاشوں کے درمیان کنگ سائز جھینگے سجے ہیں۔''

''اژدھے کا دل کھاؤں تتلی!.. صرف تمہاری خوشنودی کی خاطر ایک چڑیا کے دل والا نہایت ڈرپوک شخص اژدھے کا دل کھا جائے.. کیسے کھا جائے؟.. نہیں کھا سکتا۔''

''تو پھر یہ... شہزادی کے بالوں کا کلپ کھا لو.. اس میں گائے کا گوشت ہے..''

''کلپ کے ساتھ شہزادی بھی ہوتی تو اور بات تھی.. نہیں تتلی...''

''اچھا تو پھر تم ''بید مجنوں کا گیت'' کھانے سے تو انکاری نہیں ہو سکتے.. کیسا دل اداس اور رومانوی نام ہے۔''

''اس میں کیا ہے؟''

''اس میں ادرک کے ذائقے والے پھل ہیں جنہیں سفید پھپھوندی سے سجایا گیا ہے..''

''کاش کہ میں الیگزنڈر فلیمنگ ہوتا...''

''کون؟''

''تھا ایک پھپھوندی کا عاشق جس نے تحقیق کر کے اس میں سے پنسلین دریافت کر لی تھی.. اب میں کیا کروں؟''

''یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ تم ذوقِ سلیم سے اس قدر عاری شخص ہو..''

تتلی غصے سے لال بھبھوکا ہوگئی۔ ''اگر تم ہماری بہترین خوراکیں نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔''

میں صرف اس تتلی کی خاطر چین آیا تھا.. یا وہ مجھے لے کر چین آئی تھی اور میں اس کی رفاقت اور دانش سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا.. اگرچہ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی..

میں نے تب تُرپ کا پتہ پھینکا۔ ''یہ محض دھمکی ہے تتلی.. تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا

سکتیں..اس لیے کہ ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا کہ تتلی تم ہو..یا میں ہوں..اور میں..میں ہوں یا تم ہو..تو پھر کیسے طے ہوگا کہ کون کسے چھوڑ کر جا رہا ہے تتلی ڈیئر..تو تم اگر مجھے چھوڑ کر جاتی ہو تو گویا اپنے آپ کو چھوڑ کر جاتی ہو۔''

''یہ سب کچھ...کچھ زیادہ ہی پیچیدہ نہیں ہو رہا..''

''میرے اور تمہارے رشتے کی پیچیدگیاں ہی اس کی بنیاد ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے..میرے لیے نہ سہی..اپنے آپ کے لیے ہی سہی..ٹانگ خاندان کی ان شاندار خوراکوں کو چکھ لو..ایسی نایاب خوراکیں جن کے خواب..ہر چینی جو کبھی گراں خواب تھا، دیکھتا ہے اور یہ اس کے نصیب میں نہیں ہوتیں..''

چنانچہ میں نے تتلی کے لیے..اپنے لیے..چین کے کچھ موتی چنے..اپنے آپ پر جبر کر کے شاہی شادی میں شریک ہوا..اژدھے کے دل کو چبا گیا..شہزادی کے بالوں کو سونگھا..اور بیدِ مجنوں کے گیت چند ابکائیوں کے ساتھ سنے..اور تتلی خوش ہوگئی۔

''ٹانگ ڈائینسٹی ہوٹل کی پریاں اور موسمِ بہار کے پرندے کا گیت''

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ...

نگاہ بھی اور ہم بھی.. پردہ اٹھنے کے منتظر تھے..

لیکن یہ سچ کا وہ پردہ نہ تھا جو عطار کی ''منطق الطیر'' کے پرندوں کے سامنے اٹھتا تھا بلکہ ٹانگ ڈائی نیسٹی ہوٹل شی آن کے اُس تھیٹر کا پردہ تھا جس کے ہال میں سینکڑوں ہم جیسے غیر ملکی سیاح اور کچھ چینی میزوں کے گرد براجمان آپرا کے پروگرام کا پمفلٹ ملاحظہ کر رہے تھے اور خورد و نوش میں مصروف تھے..بلکہ خورد تو پہلے سے ہو چکا تھا اور اب حسب مقدور کچھ نہ کچھ نوش کر رہے تھے..

چین میں شاید اب یہی رواج تھا کہ بڑے ہوٹلوں کے اپنے اپنے تھیٹر ہاؤس ہوتے ہیں جہاں چینی کلاسیکی ثقافت کو ذرا عام فہم کر کے..تا کہ ناہنجار اور ذوقِ جمال سے عاری ٹورسٹ لوگ اسے انجائے کر سکیں..پیش کیا جاتا ہے...یعنی اس میں سے قدامت کی بوریت کم کر کے اسے گلیمر کا ٹیکہ لگا دیا جاتا ہے..یوں ٹورسٹوں کو بھی آسانی رہتی ہے کہ اگر سٹیج پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ان کے سر پر سے گزر رہا ہے..یا اس میں لذت نہیں ہے تو وہ میز پر سجی شرابوں سے مخمور ہو کر دوبارہ سٹیج پر نگاہ کرتے ہیں تو ہر شے رنگین اور پُر بہار نظر آنے لگتی ہے۔

سٹیج پر سے جو پردہ اٹھا اور اٹھتا چلا گیا وہ نہایت فلمی قسم کا تھا..

لیکن لائٹنگ افیکٹ نہایت حیرت انگیز تھے..

روشنیوں کے رنگ قوس قزح کی مانند بکھرتے تھے..

گفتگو کی بھنبھناہٹ پر تالیوں کی گونج غالب آ گئی..

سب سے پہلا آئٹم ایک سہ رکنی کلاسیکی ساز بجانے والے سازندوں کا تھا. جس نے نہایت دل جمعی سے جو کچھ بھی بجایا خوب بجایا اور چینی بجایا.. ان کے ساز ہزاروں برس پرانے تھے اور ان کی آوازیں بھی اتنی ہی قدیم تھیں.. ہر ملک میں سُر کے پیمانے مختلف ہوتے ہیں.. وہ ہمیں بے سُری سارنگیاں اور ستاریں لگتی تھیں.. روتی اور بین کرتی... میرے ایک دوست نے کہا تھا کہ تم اگر کسی بھی ملک میں پہلی بار جاؤ تو وہاں کی زبان.. اگر وہ جرمنی ہے تو اِخ باخ.. ڈانکا شن لگتی ہے.. فرانس ہے تو.. غاں.. غیاسی.. سلوو.. وغیرہ سنائی دیتی ہے اور اگر چین ہے تو سوائے چن چن ڈانگ بانگ کے اور کچھ سمجھ نہیں آتی.. لیکن پندرہ روز کے قیام کے بعد اس ملک کی زبان کے حرف اگرچہ آپ جان نہیں سکتے لیکن انہیں الگ الگ پہچاننے لگتے ہیں.. اور جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے تو ایک عمر وہاں قیام کرنے کے بعد بھی آپ شاید اس کی گہرائی اور معنویت تک پہنچیں یا نہ پہنچیں...

ہمیں چین میں صرف چند روز ہوئے تھے اور عمر بھر یہاں ٹھہرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا.. اسی لیے ان کی موسیقی ہمیں بے سُری لگتی تھی.. جو دراصل سُر میں تھی..

ان تین موسیقاروں کو ہم نے اگرچہ کان لگا کر سنا.. دل جمعی سے سنا.. قدرے اونگھنے سے ہوشیار ہوتے ہوئے سنا لیکن ہم اس کے ردھم کی مطابق نہ ڈھل سکے..

اس آئٹم کے بعد یکدم سٹیج پر ہمیں وہ کچھ نظر آیا کہ ہم اونگھتے ہوئے یوں بیدار ہوئے جیسے رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا ہو.. اور وہ یار جنھوں نے سونے نہ دیا سٹیج پر انگڑائیاں لے رہے تھے.. بلکہ بدن کے ایک عرصے سے خفتہ حصے بھی بیدار ہونے لگے۔

ہم اس دنیا سے اُٹھ کر کسی اور دنیا میں چلے گئے جو یقیناً کوہ قاف کی قربت میں واقع تھی.. جہاں موسمِ گُل یوں آیا ہوا تھا کہ سب کی سب پریاں بام پر آ گئی تھیں اور اپنے

پیراہن لہراتی تھیں.. اگرچہ یہ چینی پریاں تھیں، ہمارے حساب سے بدنی تناسب سے قدرے ہموار تھیں لیکن بہرحال پریاں تھیں جو سٹیج پر تیرتی جاتی تھیں.. مست ہرنیوں کی مانند زقندیں بھرتی تھیں اور اگر ہم ان کے قریب جا کر انہیں سونگھ سکتے تو یقیناً ان میں سے مشک نافہ کی مہک آتی..

بلاتخصیص وفد کے تمام اراکین کے منہ کھلے ہوئے تھے..

ان پریوں میں سے کوئی ایک الگ ہو کر جیسے جنرل صاحب کی آغوش میں اٹھلاتی تھیں..

کوئی دہقانی کہانی کار کے بدھا چہرے پر اپنے پھریرے لہراتی تھی..

حسرت ناک کی ناک کو ایک ادا سے چھوتی تھی..

گیانی کے گیان دھیان کا ستیاناس کرتی تھی..

گیسو دراز کے گیسوؤں کو چھیڑتی تھی..

سفید ریش کی داڑھی کو اتنے پیار سے سہلاتی تھی کہ وہ زیرلب ''صدقے'' کہتا جاتا تھا..

لیل پوری شاعر پر اس کے جھنگ کی ایک ہیر کی مانند اثر کرتی تھی.. اور لیڈر ایامِ پیری میں بھی ان زمانوں کو یاد کرتا تھا جب ذرا سی بات پہ برسوں کے یارانے گئے تھے۔

اور میں.. ان زرد چینی شہزادیوں کو دیکھ کر اِک عالمِ حیرت میں تھا.. میں نے انہیں پہلے بھی دیکھا تھا.. لیکن کہاں؟..

ان میں سے کوئی ایک تھی جو صرف میرے لیے پیراہن لہراتی تھی.. رقص کرتی تھی..

ہر شخص کے ذہن میں.. اس کے بدن میں.. ایک چینی شہزادی ہوتی ہے جو صرف اس کی خاطر پیراہن لہراتی ہے اور رقص کرتی ہے.. کبھی اس کا وجود ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا.. لیکن وہ ہمیشہ خواہش کرتا ہے کہ اس کا وجود ہو..

سٹیج پر اٹھلاتی.. آہستگی سے حرکت کرتی شہزادیاں زرد نہیں تھیں.. گلابی تھیں.. ان کے سراپے اور لباس اس گلابی رنگ میں نہائے ہوئے تھے..

جن کے منہ کھلے وہ کھلے ہی رہے اور جن کے ہاتھوں میں مئے لالہ فام کے جام تھے، وہ ساکت ہو گئے..کہ سٹیج پر...خواب اور خیال اور قیاس میں جو پریاں ہمیں نشے کی وہ بند بوتلیں دکھائی دیتی تھیں جنہیں صرف نصیبوں والے پی سکتے تھے..ہم معصوم نہیں جان سکتے تھے کہ ان میں سے اکثر بوتلیں متعدد بار کھل چکی ہیں...اور ہر بار یہی ظاہر کرتی تھیں کہ وہ اس سے پہلے کبھی نہیں کھلیں..اور اس کے باوجود ان کا نشہ کم نہیں ہوا تھا..

گیسو دراز ایک عجیب کیف کے عالم میں تھے اور بار بار اپنی ٹائٹ ٹی شرٹ کو اپنی توند پر کھینچ کر اسے ہموار کرنے کی سعی کرتے تھے..

سفید ریش نہایت خشوع و خضوع سے ہر پری کا بغور معائنہ کر رہے تھے کہ ان میں سے کون وہ ہے جسے جنت میں تلاش کرنا ہے..

سب میں سے سنجیدہ اور بردبار لیڈر ہو رہے تھے..گنگنا رہے تھے کہ گو ذرا سی بات پہ برسوں کے یارانے گئے..اگرچہ وہ میری طرح عمر کے اس حصے میں تھے جہاں اونگھنے کے بعد کچھ بھی بیدار نہیں ہو سکتا..

یہ ٹانگ خاندان کے عہد کا آپرا تھا..

اور کیا خوب آپرا تھا..جس نے سب کو ہوشیار کر دیا..

گلابی اسپراؤں کی رخصتی تمام ہوئی تو سفید لباس والوں کا رقص شروع ہو گیا..پھر قوسِ قزح کا ناچ رنگ بکھیرنے لگا..

اور سب سے آخر میں طبل جنگ بجنے لگا..جنگجو سپاہیوں کی پریڈ شروع ہو گئی جس نے کوہ قاف کے رنگوں کا طلسم غارت کر دیا..

لیکن اس آپرا پرفارمنس کا نکتۂ عروج ایک موٹا سا..قدیم چینی چوغوں کے ریشم میں مسکراتا ہوا ایک شخص تھا جو آخر میں سٹیج پر نمودار ہوا اور ایک عجیب سا چپٹا ساز لبوں سے لگا کر اس میں سے موسم بہار میں چین کے آسمانوں پر پرواز کرنے والے پرندوں کی چہچہاہٹ اور شوخ گیت الاپنے لگا..

موسم بہار میں جو پرندے نغمہ سرا ہوتے تھے، ان کے نغمے اس موٹے شخص کے

چپٹے ساز میں سے یوں پھوٹنے لگے کہ چند لمحوں کے بعد سب کچھ معدوم ہو گیا....نہ جنوں رہا..نہ پری رہی..نہ سٹیج تھا اور نہ ہال میں دم بخود بیٹھے ہوئے تماشائی..صرف پرندوں کے چہچہانے..اپنے آشیانوں کی جانب لوٹنے کی آوازیں..اور وہ گیت تھے جو صرف ایک چونچ سے ہی جنم لے سکتے ہیں..

یہ سپرنگ اورئیل سانگ تھا..

ایک سیاہ اور زرد پروں والا پرندہ جو موسم بہار میں چین کے آسمان پر نمودار ہوتا ہے..

موٹے سازندے کے پس منظر میں چینی اپسرائیں اپنی مدھر تانوں پر قدیم اکتارے اور ستار رکھے اس کا ساتھ دیتی تھیں..اور پرندوں کے گیت بہاروں سے الگ ہو کر کبھی خزاؤں میں گونجتے تھے اور کبھی ہوا کے دوش پر تیرتے تھے..

موٹے سازندے نے اپنے چپٹے ساز کو لبوں سے الگ کیا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا لیکن میں سناٹے کے گنبد میں دم بخود رہا..

''تم کہاں ہو؟'' تتلی گویا ہوئی.

''میں جہاں ہوں..مجھے وہیں رہنے دو..''

''لیکن کہاں..''

''میں جہاں ہوں..تمہیں اس کی خبر نہیں..ایک زرد شہزادی کے ساتھ..ایک پرندے کی کُوک کے ساتھ..مجھے ڈسٹرب نہ کرو..مجھے وہیں رہنے دو.''

''شی آن کی آخری شام، پنکھڑیاں اتنی آسانی سے بکھر جاتی ہیں''

میں پیچھے مڑ کر تتلی کو دیکھ تو نہیں رہا تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ وہ چلی آ رہی ہے.. اڑتی آ رہی ہے.. کوچ کے پیچھے پیچھے.. اور کبھی کھڑکی کے ساتھ ساتھ.. میری ناراض اور اکتائی ہوئی شکل کو دیکھتی..

وہ میرا پیچھا کر رہی تھی۔ ایک ایسی ٹین ایج لڑکی کی طرح جس کا پہلا بوائے فرینڈ اس سے بلاوجہ.. نوجوانی کے خمار اور حماقت میں کسی بہت ہی چھوٹی سی بات پر اس سے روٹھ گیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اسے ابھی نہ منایا تو وہ گھر پہنچ کر خودکشی کر لے گا..

میں تتلی سے تو روٹھا ہوا نہیں تھا، بس اپنے آپ سے اور اس پابند سفر سے عاجز آ چکا تھا.. میرے پاؤں میں سہولت اور شیڈول کی زنجیریں تھیں اور ان کی رگڑ سے میری آوارگی کے کنوارے بدن پر خراشیں پڑ چکی تھیں.. میں مجبوراً ان زنجیروں کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا چلتا جاتا تھا..

تتلی کا اس میں کوئی قصور نہ تھا.. اگر وہ بھی مجھ سے عاجز آ جائے.. مجھے واقعی چھوڑ دے تو پھر میں کیا کروں گا.. اس بے چاری سے بے رُخی کیا معنی.. چنانچہ میں اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا.. وہ پروں سے ہانپتی میرے کندھوں تک آ گئی..

''اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔'' اس نے التجا کی.. وہ جانتی تھی کہ میری اکتاہٹ کا سبب کیا ہے..

''نہیں.. تمہارا نہیں، تمہارے ہم وطنوں کا قصور ہے.. یہ نہیں کہ میں ان کا شکرگزار نہیں ہوں، صرف آج کے دن میں انہوں نے مجھے کیا کیا نہیں دکھلایا لیکن.. لیکن ایک برگِ آوارہ اپنی من مرضی سے اڑتا پھرتا ہے.. اور میں یہاں پابند کر دیا گیا ہوں.. صرف چینیوں نے نہیں میرے ساتھیوں نے بھی میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں.. کبھی لیڈر میرے لباس پر اعتراض کرنے لگتا ہے.. کبھی میرے ساتھی میری حرکتوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں. تم جانتی ہو کہ اس سفر کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی میں ''میں'' نہیں ہو سکا. صرف ''وہ'' بننے کی کوشش کرتا رہتا ہوں جو کہ میں نہیں ہوں.. جس شہر میں بھی پہنچتے ہیں وہاں ایک طے شدہ شیڈول میرے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا ہے اور میں ایک پتلی کی طرح اس ٹائم ٹیبل کے دھاگوں سے بندھا ناچنے لگتا ہوں.. ہوٹل سے کوچ میں.. کوچ سے کسی اور ہوٹل میں.. یا کسی میوزیم میں.. اور پھر سے کوچ میں بند.. کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مجھے دو روز تو اس مکانکی میزبانی کی قید میں رکھا جائے اور پھر اگلے دو روز کے لیے بالکل کھلا چھوڑ دیا جائے کہ دفع ہو جاؤ اور پرسوں شام سے پہلے ہمیں مُنہ نہ دکھانا..''

''فرض کر لو کہ ایسا ہی ہو تو پھر تم کیا کرو گے؟''

''میں کچھ بھی نہیں کروں گا''

''کچھ تو کرو گے..''

''میں بے مقصد آوارگی کروں گا. تم جانتی ہو کہ میں نے ابھی تک اپنی مرضی سے کسی کھوکھے یا فٹ پاتھ ریستوران سے کھانا نہیں کھایا.. اپنی منشا سے کسی راہ چلتے چینی کو روک کر اس کے ساتھ گفتگو نہیں کی.. راستہ تک نہیں پوچھا.. کسی ہم عمر چینی بیوہ سے فلرٹ نہیں کیا.. بیجنگ میں کوچ کی کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے میں گلیوں، بازاروں اور محلوں میں بکھرے زندہ اور سانس لیتے چین کو دیکھتا رہتا تھا جیسے وہ کسی شوکیس میں ہوں.. میں پارکوں میں بے فکری سے براجمان شطرنج کھیلتے چینی بوڑھوں کے سر پر کھڑے ہو کر ان کی

چالیس دیکھنا چاہتا تھا اور ان کو بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں پاکستان سے آیا ہوں..کیا تم میرے ملک سے واقف ہو..میرے ساتھ باتیں کرو۔ مجھے اپنے آپ میں شامل کر لو..اور یہاں شی آن میں بھی میرے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے..''

تتلی نے پر پھیلائے..ہنسی میں پھڑپھڑائے اور کہنے لگی۔''یہاں تو تم اس ریڈ گارڈ سے خائف ہو گئے ہو..لیکن تم باز تو نہیں آئے..میں جانتی ہوں کہ تم اس بوڑھے جنرل کے ہمراہ ایک شب فرار ہو گئے تھے اور فٹ پاتھ پر بیٹھ کر چینی دوستوں کے ساتھ فاطمہ کے ہاتھوں کے تکّے کھاتے رہے تھے..اور تم وہاں کف افسوس ملتے رہے تھے کہ تم نے ان لمبی ٹانگوں والی چینی خواتین سے راہ و رسم کیوں نہ بڑھائی جو پروفیشنل ہونے کے باوجود بے حد پرکشش تھیں..''

''اللہ تمہارا بھلا کرے..''میں نے تھپکی کے انداز میں تتلی کے پروں کو ہلکا سا چھوا لیکن اس کے باوجود میری پوروں پر اس کے کچھ رنگ چمٹ گئے۔''بس میں اسی قسم کی آوارہ گردی کا خواہاں ہوں..مجھے اور کچھ یاد رہے نہ رہے..مٹی کے سپاہی یا فارسٹ آف سٹون یا یہ آپرا یاد رہیں نہ رہیں..شی آن کی وہ شام یاد رہے گی فاطمہ کے تکوں والی..کیونکہ باقی سب کچھ کتابوں اور تصویروں میں مل سکتا ہے لیکن اس شام کے لیے ذات کی موجودگی درکار ہے..''

''تو اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''تتلی یہ شی آن میں میری آخری شام ہے..ہمیں آپرا سے جمع کر کے کوچ میں پیک کر کے ہوٹل روانہ کر دیا گیا ہے کہ جاؤ جا کر فوری طور پر سو جاؤ کیونکہ کل صبح شنگھائی کے لیے روانگی ہے..اور ذرا کوچ سے باہر دیکھ تتلی..شی آن کے گلی کوچوں میں کتنی گہما گہمی اور بے دھڑک زندگی کی روانی ہے جو مجھے لاہور کی یاد دلاتی ہے..میں نے ابھی ابھی لیو سے درخواست کی تھی کہ مجھے یہیں کہیں اتار دیا جائے اور میں ذرا انجل خراب ہو کر خود ہی ہوٹل واپس پہنچ جاؤں گا تو اس کا رنگ فق ہو گیا تھا کہ نہیں تارڑ صاحب..ہم یہ رِسک نہیں لے سکتے..آپ گم ہو جائیں گے..تتلی ہر چینی آپ سے یہ کیوں کہتا ہے کہ آپ گم ہو جائیں گے؟''

'اس میں ذمہ داری اور قدیم چینی فلسفے کی روایت کی آمیزش ہے..یہ کہنے میں

کہ آپ گم ہو جائیں گے..یہ ان کا فرض ہے کہ ایک غیر ملکی ڈیلی گیشن کا ہر طرح خیال رکھیں..کوئی بھی مہمان آگے پیچھے نہ ہو جائے..میجر لیو بیجنگ واپس پہنچ کر اپنے محکمے کو یہ رپورٹ نہیں دے سکتا کہ باقی تو سب خیریت ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جناب مستنصر حسین تارڑ آپرا دیکھنے کے بعد شی آن کی شام میں کوچ سے اترے اور پھر گم ہو گئے...لیو کو ملازمت سے جواب مل جائے گا..اس کے علاوہ یہ سمجھ لو کہ کہیں کہیں اس عہد کی ذہنیت بھی کارفرما ہے جب اصول یہ تھا کہ مہمان کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دو تا کہ وہ...وہ کچھ نہ دیکھ لے جو ہم اسے دکھانا نہیں چاہتے..اگرچہ تم دیکھ رہے ہو کہ موجودہ عہد میں ہر سیاح جو کچھ دیکھنا چاہتا ہے، دیکھ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود پرانی عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں..لیکن سب سے اہم اور اصل وجہ چینی نفسیات ہے..ہر چینی یہ سمجھتا ہے کہ اس کا چین ایک ایسی دنیا ہے جسے صرف وہی جان سکتا ہے..صرف وہی اس کے دماغ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے..اور جو بھی باہر سے آئے گا..چینی نہیں ہو گا، وہ اس دنیا میں آ کر بھٹک جائے گا..گم ہو جائے گا۔''

''کیا چینی دیگر قوموں کو کم عقل سمجھتے ہیں؟''

''ہاں..مجھے اقرار کرنا ہو گا کہ ایسا ہی ہے۔''

''تتلی تم تو نہایت بنیاد پرست چینی ہو..''

''اور میں اس کا بھی اقرار کرتی ہوں..کیونکہ ہماری ایک بنیاد ہے..''

''اور ہماری نہیں ہے؟''

''ہے..لیکن تم اس کا تعین نہیں کر پا رہے..''

کوچ نے ہم سب کو ہوٹل گرینڈ نیو ورلڈ کے پورچ میں اُگل دیا۔

میرے ساتھی جمائیاں لیتے ہوئے ڈیسک سے اپنے اپنے کمروں کی چابیاں وصول کر کے لفٹوں کی جانب جانے لگے..میں لیو اور خاور کی نظروں سے بچ کر ہوٹل سے باہر آ گیا..

''اب تم کیا کرنا چاہتے ہو..؟''تتلی بھی میرے ساتھ چلی آئی۔

"شی آن میں آخری شام ہے تتلی..میں اس میں آوارگی کے کچھ سانس لینا چاہتا ہوں..امراؤ جان ادا کے بقول کچھ زمانے کی سیر کرنا چاہتا ہوں..میں نے آپرا سے واپسی پر ایک طویل بازار کے فٹ پاتھوں پر عارضی طور پر کھوکھوں اور سائیکلوں پر ایستادہ کھانے پینے کے سینکڑوں سٹال دیکھے تھے..جہاں شی آنی اپنی من پسند خوراکیں اپنی نظروں کے سامنے پکواتے تھے اور کھاتے تھے..زندگی کی لہر میں بہتے چلے جاتے تھے..تو میں اب وہاں جانا چاہتا ہوں..ان میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

"چلو..."

جب ہم اس طویل بازار تک پہنچے تو تمام کھوکھے اور ریستوران بند ہو چکے تھے..سائیکلوں والے عارضی خوراک گھر..جا چکے تھے..فٹ پاتھ پر بلیوں کی حکمرانی تھی جو بچی کھچی خوراک کے حصول کے لیے غراتی تھیں۔

"ہم بہت دیر سے پہنچے ہیں.." تتلی نے مغموم ہو کر کہا۔ "شی آن بہت دیر تک نہیں جاگتا..آؤ واپس چلیں۔"

"چلو..."

واپسی پر..اسی فٹ پاتھ پر..اسی مقام پر..انہیں کھمبوں کے قریب..وہی سناٹے میں لے جانے والی پُرکشش لمبی ٹانگوں والی خواتین کھڑی تھیں..اور میں حیران ہوا کہ کیا کل شب سے اب تک انہیں کوئی مزدوری نہیں ملی..

"اب تو خوش ہو جاؤ" تتلی میرے کان کی لو کے ساتھ شرارت سے پھڑپھڑائی۔ "تم اپنی من مرضی کرنا چاہتے تھے تو کر لو.."

"اس عمر میں من مرضی سے کچھ بھی نہیں ہوتا..بائی چانس کی گیم ہو جاتی ہے..اور یوں بھی یہ شغف میرا کبھی نہیں رہا.."

ہوٹل کی قربت میں پہنچے تو اس کے آس پاس ابھی تک رونق کے کچھ آثار تھے..عثمان..فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر براجمان چند شی آنی اور چند فرانسیسی سیاحوں کی میز سے خالی بوتلیں اٹھا کر ان کی جگہ بند بوتلیں رکھ رہا تھا اور فاطمہ اسی پھولدار ٹائٹ جین میں

تھکی ہوئی کوئلوں پر سلگتے کبابوں کو پنکھے سے ہوا دے رہی تھی..

یہ دونوں تو میرے واقف تھے..میں نے نہایت پُرجوش انداز میں فاطمہ کو "نی ہاؤ" کہا لیکن اس نے جواب میں کچھ نہ کہا..سرسری طور پر نظر اٹھا کر دیکھا..یوں دیکھا جیسے کوئی گھوڑا ہنہنایا ہو..کوئی خالی بوتل گری ہو..اور پھر سیخوں میں پروئے گوشت کو پنکھا جھلنے لگی..شائد یہ اس کا آخری آرڈر تھا..اور اس کے بعد اس نے اپنے عارضی ریستوران کو عثمان کی مدد سے سمیٹ کر گھر جانا تھا..وہ پتہ نہیں دن کے وقت کیا کام کرتی تھی..کتنے بچے سنبھالتی تھی کہ مسلمان ایک بچہ ایک خاندان کے موٹو کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے تھے..اس کا خاوند کس قسم کا تھا..شائد نکھٹو تھا..اسی لیے اس کی شامیں فٹ پاتھ پر مزدوری کرتے گزرتی تھیں..اور کیا فاطمہ نے شی آن کی اس قدیم خوشنما مسجد میں کبھی نماز پڑھی تھی یا نہیں..جسے میں شدید خواہش کے باوجود صرف اس لیے نہیں دیکھ سکا تھا کہ شیڈول اور کوچ کا پابند تھا۔

"میں تمہیں جوانی میں..تمہاری جوانی میں تو نہیں جانتی تھی۔" تتلی تھکی ہوئی میرے کاندھے پر آ بیٹھی تھی اور سستا رہی تھی۔ "لیکن کیا تم میں تب بھی اداسی اور دل گرفتگی کی یہی کیفیت یہی عادت تھی..خوشی اور اداسی کی دھوپ چھاؤں تھی؟"

"تب میں ڈرتا نہیں تھا..اب ڈرتا ہوں۔"

"کس بات سے؟"

ــ نہیں کہ میں پھولوں کو زندگی سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں..
صرف ڈرتا ہوں کہ جب یہ مرجھا جائیں گے..
تو میں ان سے بھی جلد بوڑھا ہو جاؤں گا..
پنکھڑیاں اتنی آسانی سے بکھر جاتی ہیں..
بہتر ہوتا کہ کلیوں کو یوں بنایا جاتا کہ..
یہ آہستہ آہستہ کھلتیں...

یہ تو تمہارا لی پو کہتا ہے اور میرا بابا فرید کہتا ہے کہ اٹھ فرید استیا ہُن داڑھی آیا بور..اگا نیڑے آ گیاتے پچھّا رہ گیا دور..تو پنکھڑیاں بکھر رہی ہیں..اس لیے میں ڈرتا ہوں۔

"تم تو لی پو سے خطرناک حد تک متاثر ہو.."

"لی پو سے اس لیے کہ اس نے تمہیں..میرے لیے تخلیق کیا..صرف لی پو نہیں مجھ پر تو کنفیوشس، چو یو آن، طوفو اور یو چوای بھی اثر کرتے ہیں...میں تو اپنے شاعر دوستوں سے کہا کرتا ہوں اور وہ میرے کہے کو سخت ناپسند کرتے ہیں کہ چین کے قدیم شاعروں نے آج سے ہزار بارہ سو برس پیشتر وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو تم آج کہنے کی کوشش کر رہے ہو.."

"تم خواہ مخواہ انہیں موردِ الزام نہ ٹھہراؤ..ان کی زبان کو تخلیق ہوئے ابھی دو سو برس نہیں ہوئے اور ہماری زبان کو دو ہزار برس سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا..ہماری روایت شاعری کی اپنی ہے اور تمہاری عربی اور فارسی سے مانگے تانگے کی ہے...."

"میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی واقفیت رکھتی ہو.."

"میں زمانوں سے واقف ہوں.." تتلی ہنسی۔ "لیکن میں پھر کہوں گی کہ تم لی پو سے خطرناک حد تک متاثر ہو..ہماری تاریخ میں لی پو سے متاثر ہونے والے ہمیشہ غمزدہ اور دل گرفتہ رہے.."

"شائد میں لی پو کا مداح اس لیے بھی ہوں کہ اس نے ایک شب ماہتاب میں کشتی میں بیٹھے ہوئے دریا میں چاند کا عکس دیکھا اور اسے پانے کے لیے پانی میں کود گیا اور..ڈوب گیا.."

"یہ تو ایک نہایت احمقانہ فعل تھا.."

"نہیں..جو اس تجربے سے نہیں گزرے ان کے لیے یہ احمقانہ فعل تھا..لیکن تم یقین کرو کہ یہ عین ممکن ہے..میں نے ایک دریائی سفر کے دوران گئی رات دریائے سندھ کے ریتلے کناروں پر بیٹھے..جب کہ میرے ساتھی خیموں میں خوابیدہ تھے..الاؤ بجھ چکا تھا..سندھ کے رواں مگر سکوت میں آئے ہوئے پانیوں کی چادر پر کُل آسمان کے کُل ستارے اور ایک دمکتا روشن چاندیوں دیکھا تھا کہ..میں نے بہت جبر کر کے..اپنے آپ سے بحث

کر کے کہ یہ ستارے اور یہ چاند محض عکس ہیں..اپنے آپ کو پانیوں میں کود جانے سے روکا تھا.."

"تو پھر تم کیوں نہ کودے؟"

"اس لیے کہ میں لی پو نہیں تھا.."

جب میں اور تتلی بالآخر ہوٹل گرینڈ نیو ورلڈ تک پہنچے تو..

پرندے جا چکے تھے..اور آدمی بھی نہیں تھے..

کمرے کی تمام روشنیاں گُل کر دینے پر بھی کھڑکی کے شیشے کے پار چینی شہنشاہ کا روشن اور پتھر چہرہ مجھے گھورتا رہا..اس کے عقب میں وہ سپاہ تھی جسے اس نے مٹی میں حنوط کر کے اپنے مٹی کے جسم کی حفاظت کے لیے معمور کیا تھا..

مٹی..مٹی کی حفاظت کر رہی تھی..

نیند مجھ سے کوسوں دور تھی..اور ہر کوس پر مٹی کا ایک سپاہی کھڑا تھا..

اگرچہ یہ مناسب نہیں کہ ایک بیانیے کے درمیان میں یہ راز افشا کر دیا جائے..یہ اقرار کر لیا جائے کہ بس یہی شہرِ شی آن ہے جو مجھے ثوریا کی شب میں لے گیا تھا اور اس شہرِ شی آن کے بعد چین کا کوئی شہر میری نظروں میں نہیں جچا..لیکن لی پو کے مداح ہمیشہ تھوڑے سے دیوانے ہوتے ہیں اور اقرار کر لیتے ہیں..

نیند کے ہر کوس پر شی آن کا سنگ میل تھا..

اس لیے بھی کہ یہ شہر شاہراہ ریشم کا آغاز تھا..

تتلی کو بھی تھکاوٹ..بے وجہ اور بے مقصد اڑان..جو میرے لیے تھی..ان کے باعث نیند نہیں آ رہی تھی..اور وہ میری بے خوابی میں یوں شریک تھی جیسے زیدی کے بستر کی ایک ایک شکن میں وہ شریک تھی..

"نیند نہیں آ رہی؟"

"آنکھیں کوری ہو گئی ہیں..بند نہیں ہوتیں..بند کرتا ہوں تو کھل جاتی ہیں اور چینی شہنشاہ کا پتھریلا چہرہ مجھے گھورنے لگتا ہے..کیا کروں؟"

"کچھ نہ کرو..میں تمہیں لوری کے طور پر لی پو کی ایک نظم سناتی ہوں.."

’’آہا..تو تم بھی اس کی شیدائی ہو..‘‘

’’تم نے بھی کہا تھا اور میں بھی جانتی ہوں کہ میں اس کی تخلیق ہوں تو جیسے بندہ اپنے رب کو جانتا ہے، ایسے میں لی پَو کو جانتی ہوں۔ اس کی ایک نظم ہے ’’چاندنی میں تنہا شراب نوشی‘‘..

’’تو لی پَو..شاعر خمریات تھا..ابونواس اور عدم کی مانند؟‘‘

’’نہیں..وہ شاعر زندگی تھا..وہ اس نظم میں کہتا ہے..

’’بہار میں کون تنہا غم کھانے کو برداشت کر سکتا ہے..
کون سنجیدہ رہ کر ان منظروں کو برداشت کر سکتا ہے..
اسیری میں یا غم میں...لمبی یا مختصر عمر..
خالق اشیاء نے عطا کر دی ہے یا مقرر کر دی ہے..
لیکن..
شراب کا ایک پیالہ..زندگی اور موت کو..
اور ہزاروں چیزوں کو جن کا اثبات دکھ میں ہے..
ہموار کر دیتا ہے..
جب کہ میں مدہوش ہوتا ہوں تو آسمان اور زمین کو گم کر دیتا ہوں..
میں اپنے تنہا بستر سے بے حس وحرکت چمٹا رہتا ہوں..
اور بالآخر میں بھول جاتا ہوں کہ میں ہوں بھی..کہ نہیں..
اور اس لمحے میری مسرت واقعی بے پناہ ہوتی ہے‘‘

میں بھی نیند سے کوری عاری آنکھوں کے ساتھ بستر پر بے حس وحرکت پڑا یہ نظم سنتا تتلی سے پوچھتا ہوں ’’..کہ میں ہوں بھی..کہ نہیں؟‘‘

’’تم ہو..اگر نہ ہوتے تو شی آن میں نہ ہوتے..اور اگر تم ہو تو میں ہوں..اگر تم

نہیں تو میں بھی نہیں..‘‘

’’تمہاری رفاقت کا شکریہ تتلی..تمہارے پَر ڈھلک رہے ہیں...ان کے رنگ نیند میں ڈوب رہے ہیں..نیند میں اترنے سے پہلے تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟‘‘

’’بس یہی کہ شی آن کی آخری شام میں..سویٹ ڈریمز..اور گڈ نائٹ..‘‘

تتلی نے پر سمیٹے اور سو گئی..

اور اسی لمحے کھڑکی میں سے جھانکنے والے چینی شہنشاہ کا پتھر چہرہ زندہ ہو گیا...وہ آنکھیں جھپکنے لگا..اس کے شاہی لبادے کی سلوٹیں حرکت میں آ گئیں اور اس نے اپنی مونچھوں کو ایک اور بل دے کر مجھ سے کہا ’’سویٹ ڈریمز...‘‘

مقام....شنگھائی

''مہکیں ترے شنگھائی کے گلاب اور زیادہ...''

شنگھائی ایک اور چین تھا..

جو چین ہم اب تک دیکھ آئے تھے اس سے الگ ایک اور چین تھا..

''ہو..'' یا ''شین'' ... پیار سے.. جیسے میں اپنے بیٹے سلجوق کو جُوتی کہتا ہوں، سمیر کو سُمیری اور قرۃ العین کو عینی کہتا ہوں.. ایسے چینی شنگھائی کو لاڈ سے ''ہو'' یا ''شین'' کہتے ہیں، اور یہ ہے بھی ایک لاڈلا، پیارا اور قدرے بگڑا ہوا شہر..

یہ ایک عرصہ استعماری طاقتوں کے زیرِ نگیں رہا.. اور انہوں نے اسے بگاڑ دیا.. معیشت کی ترقی کے پہلو بہ پہلو نائٹ کلب، جوئے خانے، شراب خانے اور طوائفیں بھی چلی آتی ہیں کہ یہی قانون سرمایہ داری ہے.. ہاں اگر تیل کے کنویں ٹھاٹھیں مار رہے ہوں تو ان عیوب سے بظاہر اجتناب کیا جاتا ہے اور ان کا بندوبست تخلیئے میں کر لیا جاتا ہے.. چنانچہ اُن دنوں... دنیا بھر میں ''شنگھائی روز'' کے چرچے تھے..

اِدھر آپ نے شنگھائی کا نام لیا اور اُدھر باچھیں کھل گئیں کہ اچھا شنگھائی روز والا شنگھائی..

جو بھی اُس عہد میں شنگھائی آتا تھا.. انگریز، جرمن، پرتگالی یا فرانسیسی اِسی شنگھائی روز کی چاہت میں آتا تھا۔

اور یہ شنگھائی روز تھا کیا؟.. نتھری، بظاہر ستھری.. فٹ پاتھوں، شراب خانوں اور

نائٹ کلبوں میں منتظر شنگھائی کی کومل لڑکیاں.. شنگھائی کے گلاب!

اور جب شنگھائی نے کلونیل شکنجے سے رہائی حاصل کی اور یہاں ماؤ اور چو این لائی ایسے سادہ اور اخلاقی طور پر مضبوط انقلابی لیڈروں کا غلبہ ہوا تو اہل مغرب نے بہت ماتم کیا کہ ہائے ہائے شنگھائی.. یہ تو مغربی ثقافت کا امین ایک شہر تھا، اسے چینی انقلابی اور نہایت خشک ثقافت سے کیا نسبت.. چنانچہ گے لائف کی رخصتی اور شنگھائی روز کے مرجھانے پر دیر تک کفِ افسوس ملا گیا.. اگرچہ یہ وہی شہر تھا جہاں کے ایک پارک کے داخلے پر ''یہاں کتوں اور چینیوں کا داخلہ منع ہے۔'' ایسا مشہور زمانہ بورڈ آویزاں تھا.. میں نے شنگھائی میں قیام کے دوران متعدد بار اپنے میزبانوں سے اس کے بارے میں استفسار کیا کہ یہ بورڈ کون سے مقام پر لگایا گیا تھا لیکن وہ جواب دینے سے ہچکچاتے رہے اور بالآخر ایک مشہور ناول نگار نے مجھے بتایا کہ ہم اس سائن بورڈ کا تذکرہ کر کے اپنی عزت نفس کو مجروح نہیں کرنا چاہتے.. یہ بورڈ دریا کے کنارے بُنڈ کی جو سیر گاہ ہے وہاں آویزاں تھا.. اور اب ایک میوزیم میں ہے لیکن ہم اس کا چرچا نہیں کرتے..

شنگھائی ایک اور چین تھا..

شنگھائی کی چال میں فرق تھا.. پہلے اس کے چلن میں بھی فرق تھا..

اس کے لباس میں بھی فرق تھا.. شنگھائی کے باسیوں کے ستھرے پن کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی تھی.. نتھر جاتی تھی۔

بیجنگ اور شی آن بھلے تاریخی اور ثقافتی ورثوں کے امین تھے لیکن شنگھائی کے مقابلے وہ گاؤں تھے جو پھیل پھیل کر شہر ہو گئے تھے..

یوں جانئے کہ بے شک گوالمنڈی اور بھاٹی دروازہ لاہور کے قدیم رواجوں اور کھانوں کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن لبرٹی مارکیٹ اور فورٹریس سٹیڈیم کی اپنی شان ہے.. شنگھائی گلاب بھی مرجھایا نہیں تھا صرف اس نے کلونیل لبادہ ترک کر کے ایک نیم کمیونسٹ لبادہ اپنا لیا تھا اور وہ بھی اترتا نظر آتا تھا.. لیکن اس کے بدن کی شفافی چھپائے نہیں چھپتی تھی.. ان کے مزاج الگ تھے.. چال ڈھال الگ تھی.. اور پُراعتماد تھے.. بقیہ چین کی

مانند وہ اپنی ذات میں ہی گم نہیں تھے بلکہ کل دنیا سے کھلے رابطے ان کی روزمرہ کی زندگی اور سوچ میں عیاں نظر آتے تھے...ادیب بھی اسی رنگ کے تھے..

شنگھائی ایک منی ایچر نیویارک دکھائی دیتا تھا..اگرچہ اس کی نسبت کہیں صاف ستھرا.شنگھائی ایئرپورٹ پر جو مقامی ادیب ہمیں وصول کرنے کے لیے آئے' وہ بھی ہمارے گزشتہ میزبانوں کی نسبت مختلف مزاج کے تھے..وہ نہ تو ہمارے سامنے بچھے جاتے تھے اور نہ ہی ان کے چہروں پر کوئی غیرضروری سنجیدگی تھی بلکہ وہ خوشگوار اور براہ راست تھے۔

مجھے یقین ہے کہ شی آن کی موٹی ریڈ گارڈ شنگھائی کی ہوا میں ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتی..وہ اس کی آزادی کی تاب نہ لاتے ہوئے فوراً ہلاک ہو جاتی..

ایئرپورٹ سے نکلتے ہی ہم نے ایک عمارتی تبدیلی محسوس کی کہ ہماری کوچ کے عین اوپر ایک اور شاہراہ جا رہی ہے اور مسلسل جا رہی ہے اور ہم اس کے سائے میں چلے ہی جا رہے ہیں.. بتایا گیا کہ...اور یہاں ہم جو پوچھتے تھے صرف وہی بتایا جاتا تھا..بیجنگ اور شی آن میں ہم جو پوچھتے تھے اس کے علاوہ سب کچھ بتایا جاتا تھا..تو ہمیں بتایا گیا کہ پورے شنگھائی کے اوپر ایک بیس کلومیٹر طویل فلائی اوور تعمیر کیا جا رہا ہے جو ٹریفک کے نظام کو مزید رواں کر دے گا...آپ جس ایئرپورٹ پر اترے ہیں وہ بھی چند روز کا مہمان ہے.. انقلاب کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر نیا ایئرپورٹ بھی کھل جائے گا اور اس فلائی اوور کا بھی مکمل افتتاح ہو جائے گا..

ہم چونکہ آدھے کلومیٹر کے ایک فلائی اوور کی تعمیر پر پورے ملک میں کئی روز تک جشن منانے کے عادی تھے اس لیے اس بیس کلومیٹر طویل فلائی اوور کو ہضم نہ کر سکے..

ہر جانب توڑ پھوڑ جاری تھی..

اور یہ توڑ پھوڑ ویسے تو پورے چین میں جاری تھی..

شنگھائی کے پرانے مکان اور بوسیدہ عمارتیں مسمار کی جا رہی تھیں..ان میں قدیم اور دیدہ زیب گھر بھی تھے..ان کی جگہ سکائی سکریپر..سٹورز اور فلیٹ سر اٹھا رہے تھے..

اور جب ہماری کوچ "ہوٹل ایکوٹوریل" کی شاید پینتیس منزلہ شیشے کی عمارت

کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی تو ہم نے یہی قیاس کیا کہ شاید ہم اِدھر سے داخل ہوئے ہیں اور اُدھر سے نکل جائیں گے کہ ایسی رہائش کے قابل ہم کیسے ٹھہرائے جا سکتے تھے..

چنانچہ جب ہم سے درخواست کی گئی کہ اب اتر بھی جائیں تو پھر بھی ہم دل ہی دل میں اس الجھن کو سلجھاتے رہے کہ نہیں ہم یہاں قیام کرنے والوں میں سے نہیں ہیں.. شاید چائے کی ایک پیالی پلا کر ہمیں اپنی اصل کی جانب..وہ جہاں کہیں بھی تھی..لوٹا دیا جائے گا..

بیجنگ کا پیس ہوٹل اور شی آن کا گرینڈ نیو ورلڈ ہوٹل رہائشی سہولتوں اور شان و شوکت کے حوالے سے کسی سے کم نہ تھے.. پر ہوٹل ایکوٹوریل کی نفاست اور ذوق جمال کے سامنے کم کم تھے..

ہم اپنے اپنے کمروں کے کارڈ سینے سے لگائے لفٹ میں اٹھتے ہی گئے اور جب ہمارے اندر ایک ہول بھی اٹھنے لگا کہ یہ لفٹ رکتی کیوں نہیں..کیا ایک خلائی راکٹ کی مانند خلاء میں چلی جائے گی تو وہ تیسویں منزل کے نشان پر رک ہی گئی..

لفٹ میں ہر کوئی اپنے کمرے کے کارڈ کو الٹتا پلٹتا تھا اور سب ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نظروں سے تکتے تھے کہ یہ ہوٹل والے کیسے بیوقوف لوگ ہیں کہ کمروں کی چابیاں دی نہیں اور یہ کریڈٹ کارڈ قسم کی چیزیں تھما دی ہیں تو اب ان کا کیا کریں..تب وفد کے ایک سیانے سیاح نے سرگوشی کی کہ بھائیو اپنے پینڈو پنے کا مظاہرہ نہ کرو دراصل یہ کارڈ ہی وہ کھل جا سم سم ہیں جن کے جادو سے کمرے کا دروازہ وا ہو گا..

اس پر ایک پکوڑا ناک والے افسانہ نگار نے اپنے پکوڑے کو سکیڑ کر کہا "لو ہم کوئی اس سے پیشتر بڑے ہوٹلوں میں فروکش نہیں ہوئے..میں ٹھہرا ہوں اسلام آباد اور کراچی کے عالی شان ہوٹلوں میں..اور وہاں کمروں کی چابیاں ہوتی ہیں..بھلا چابی کے بغیر بھی کبھی کوئی کمرہ کھلا ہے..میں کہتا ہوں ہم چابیاں کاؤنٹر پر بھول آئے ہیں اور ہوٹل کے کارڈ اٹھا لائے ہیں.."

ہم اپنے اپنے کمروں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور ہماری اس

حالت کو دیکھ کر ویٹرس خواتین ہماری مدد کو آئیں اور انہوں نے ہم سے کارڈ لے کر کمرے کے دروازے میں جو چھوٹی سی جھری تھی ، اس میں ڈالے اور قفل کھل گئے..

اب ہم کمروں میں داخل ہوئے ہیں تو ہمارا وہی حال ہوا جو میرے جیسے ایک سادہ دہقان کا ہوا تھا جو شہر کے ایک لش لش کرتے غسل خانے میں جا کر فوراً لوٹ آیا تھا کہ بھائی جی اندر تو اتنی صفائی میں وہاں کیسے بیٹھ جاؤں ..تو اب کیا کروں اور کہاں جاؤں..

ہم بھی اپنے کمروں میں پہنچ کر تادیر اسی کشمکش میں رہے کہ اب بیٹھ جائیں یا کھڑے رہیں..

شہر کی جانب کھلتی پوری دیوار شیشے کی تھی اور اس میں ایک شہر پُر بہار کے آثار بلند ہوتے چلے جاتے تھے..چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو نہ گلیاں تھیں نہ بازار کہ وہ بہت نیچے رہ گئے تھے..عمارتوں کے زرافوں کی طویل گردنیں دکھائی دے رہی تھیں..ان کے پاؤں اور دھڑ بہت نیچے رہ گئے تھے..

ذرا جھانکنے سے..کھڑکی کی چوکھٹ مضبوطی سے پکڑ کر جھانکنے سے نیچے شنگھائی کلب کے سبزہ زار زمین پر بچھے نظر آتے تھے..

یہاں اولیں پرابلم دہقانی کہانی کار کو ہوئی..

اس نے اپنی معصومیت میں اور دیہات والوں کے دل میں جو بات آتی ہے ، وہ کہہ جانے والی معصومیت سے ساتھیوں کو فون کیے..یہ یاد رکھئے کہ گانٹھ کے پکے اور عیار لوگ جب کسی ایسی شے کو سامنے پاتے ہیں جس کو وہ سمجھ نہیں پاتے ، اس کی تفہیم نہیں کر سکتے تو ہمیشہ چپ رہتے ہیں۔اپنی لاعلمی کا اظہار نہیں کرتے..لیکن جن کی خصلت میں اسلام آباد میں ایک طویل قیام کے باوجود اپنا گاؤں ٹھہرا ہوا ہو وہ پھٹ پڑتے ہیں.''یار مجھے ایک پرابلم ہوگئی ہے..میرے کمرے میں جو وارڈ روب ہے ، اس کے اندر ایک صندوقچی سی ہے جس پر کچھ ہندسے درج ہیں..پتہ نہیں کیا شے ہے..کچھ پلّے نہیں پڑ رہا..''

اس پر لیل پوری شاعر نے یونہی اس کی ٹانگ کھینچنے کی غرض سے کہا..''یار یہ دراصل مائیکرو ویو اَون ہے..تم اس کے اندر چائے بنا سکتے ہو یا خوراک گرم کر سکتے ہو..'' اگر چہ وہ ''مائیکرو ویو'' ایک عام سی سیف تھی تا کہ آپ اپنی قیمتی اشیاء اپنی مرضی کی کوڈ وضع کر کے اس میں محفوظ کر سکیں۔

اگلے روز یہی لیل پوری شاعر چلبلے موڈ میں دہقانی کہانی کار کے دیر سے کوچ میں آنے کے بارے میں ذرا تفنّن ہوگیا اور کہنے لگا..''اسے اس لیے دیر ہوگئی کہ یہ اُس مائیکرو ویو اوون میں صبح سے ایک مگ میں پانی ڈال کر اسے گرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا..اور بار بار ہاتھ لگا کر دیکھتا تھا کہ یہ گرم کیوں نہیں ہو رہا..اس لیے اسے دیر ہوگئی ہے..'' جب کوچ میں سوار ہر کوئی مسکرانے لگا تو دہقانی کہانی کار نے اپنی بُڈھا مسکراہٹ سمیٹے بغیر وار کیا۔''سنو برادر..میں کسی کی سفارش سے اس وفد میں شامل نہیں ہوا..اپنی ہِک کی زور پر شامل ہوا ہوں..اور تمہیں پتہ ہے کہ میں بول بھی سکتا ہوں اور لکھ بھی سکتا ہوں..تو کیا تم لکھ سکتے ہو؟''

لیکن یہ تو آنے والے کل کا قصہ تھا..اور میں ابھی ابھی اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا..میں حیرت زدہ تو نہیں تھا..کیونکہ میں بھی دنیا کے کچھ شاندار ہوٹلوں میں قیام پذیر ہو چکا تھا..اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کبھی بھی بل کی ادائیگی میری جیب سے نہیں ہوئی تھی کہ اس میں تو اپنے پلّے سے ایک ناشتے کی ادائیگی کے لیے بھی گنجائش نہ تھی..میزبانوں کی کرم فرمائی سے ہوئی تھی..لیکن میں حکومتوں اور بین الاقوامی اداروں کا ظاہر ہے شکر گزار تھا کہ ان کی مہربانی سے میں ایسے پاش ہوٹل میں قدم رنجہ فرما سکا تھا..البتہ میں شہر شنگھائی کے منظر سے متاثر ہو رہا تھا..

میں ایک مرتبہ پھر ذرا آگے ہوا اور کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی..

''مت جھانکو..'' لی یَو کی تتلی نے خبردار کیا۔

''تم کہاں ہو؟'' میں نے چونک کر کہا..وہ کمرے میں تو نہیں تھی..

''میں جہاں کہیں بھی ہوں..مت جھانکو''

''کیوں؟''

''کیونکہ تم تیسویں منزل پر ہو..جھانکنے سے تمہیں چکر آجائے گا''

''تو کیا فرق پڑتا ہے..کھڑکی سراسر شیشے کی ہے اور کھل بھی نہیں سکتی..''

"تمہیں پتہ ہے کہ ورٹی گو کیا ہوتا ہے؟"

"ہاں..مجھے کچھ اندازہ ہے..میں نے اس نام کی الفرڈ ہچکاک کی ایک فلم دیکھی تھی جس میں جیمز سٹیورٹ مست آنکھوں والی کم نووک کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن جب وہ ایک سٹول پر کھڑا ہوتا ہے تو وہ نیچے دیکھنے سے چکرا جاتا ہے..اسے ورٹی گو کی بیماری ہوتی ہے..اور کم نووک اسے ایک مینار پر چڑھا کر ایک قتل کی پردہ پوشی کرتی ہے..لیکن تتلی میں تو جیمز سٹیورٹ نہیں ہوں.."

"تم ہو..اگرچہ تم اقرار نہیں کرتے.."

"میں جیمز سٹیورٹ ہوں؟"

"نہیں..تم ورٹی گو کے مریض ہو..تم بلندی سے نیچے دیکھتے ہو تو تمہیں چکر آ جاتا ہے..تم جب سے چین آئے ہو..مسلسل موازنہ کر رہے ہو..کہ پاکستان اور چین تقریباً ایک ہی زمانے میں آزاد ہوئے تھے اور چین کی حالت تمہاری نسبت کہیں زیادہ تشویشناک اور دگرگوں تھی..یہاں بھوک تھی، بیماری تھی..دوسری جنگ عظیم کی تباہی تھی اور اس کے باوجود...جب تم موازنہ کرتے ہو تو چکرا جاتے ہو.."

"تتلی.."میں فوراً بنیاد پرست ہو گیا۔"ہماری ترجیحات مختلف ہیں..کیا تم نے کنفیوشس، تاؤ یا ماؤ کے حوالے سے ان کی ہتک کا کوئی قانون پاس کیا ہے..اگر نہیں کیا تو شرم کرو..اور کیا تم نے اخلاقی اقدار کی کوئی حد لگائی ہے..نہیں لگائی؟ تو بھی شرم کرو..یہ مادی ترقی کے مظاہر بے تیغ لڑنے والے سپاہیوں کو متاثر نہیں کر سکتے.."

تتلی میرے اس واعظ سے قدرے شرمندہ ہو گئی..

لیکن وہ تھی کہاں؟..کمرے میں تو نہیں تھی۔

"تم ہو کہاں؟"

"تم اپنی بنیاد پرستی سے باہر آؤ تو مجھے دیکھو..میں باہر ہوں۔"

"باہر کہاں؟"

"یہاں.."وہ ہوٹل ایکوٹوریل کی تیسویں منزل پر واقع میری شیشے کی کھڑکی کے

باہر پھڑ پھڑا رہی تھی..

"یار تم وہاں کیا کر رہی ہو؟"میں نے کھڑکی کے کھسکنے والے تختے کو زور لگا کر دھکیلا اور وہ شپ سے اندر آ گئی اور کہنے لگی۔"ہیلو"

"ویسے تم وہاں باہر کیوں تھیں؟"

"مجھے لفٹ میں جگہ نہیں ملی تھی۔اس لیے میں اڑتی ہوئی..شنگھائی ایئر کو سونگھتی پرواز کرتی تمہارے کمرے کی کھڑکی تک آ گئی.."

"اتنی بلندی پر آنے سے تمہیں ورٹی گو نہیں ہوا...بلندی کا خوف محسوس نہیں ہوا؟"

"قطعی نہیں..اس لیے کہ میں اڑ سکتی ہوں..ایک تتلی..ایک پرندہ..ایک خلاء نورد اگر ورٹی گو کے مریض ہوں تو..وہ تتلی۔پرندہ یا خلا نورد نہیں ہو سکتے.."

"بی مائی گیسٹ.."میں نے تتلی کو پیشکش کی..

"شکریہ.."اور وہ نہایت اطمینان سے میری بیڈ ٹیبل پر سجے ایک گل دستے کے ایک پھول پر پر سمیٹ کر میری مہمان ہو گئی..

لیڈر اپنی بھیڑوں کو..اپنے ماتحت عملے کو مسلسل فون کر رہے تھے۔"جناب میرے کمرے سے..بلکہ سویٹ سے..کیا شنگھائی نظر آ رہا ہے..دیکھنا چاہتے ہیں تو آ جائیں..پھل بھی کھلاؤں گا۔"

اس پر ہر بھیڑ نے شکریہ منمنا کر انہیں اطلاع کی کہ میرے کمرے سے بھی وہی شاندار منظر دکھائی دے رہا ہے۔

ڈنر ٹیبل پر خاور، لیو اور وانگ لی کی جون ہی بدلی ہوئی تھی..

لیو جو کبھی ریڈ آرمی میں میجر تھا اور بیجنگ میں اپنے انقلابی کارنامے اور اسرائیلی وزیر اعظم کی چین میں آمد پر اس کے مترجم ہونے کی داستانیں بیان کرتا تھکتا نہ تھا، اب نہایت آزاد اور بیباک ہوا جاتا تھا..

خاور نے بھی احتیاط کا دامن چھوڑ دیا تھا اور اپنی لاابالی محبتوں کی کہانیاں سنائے چلا جا رہا تھا..

اور وانگ لی۔۔گندمی رنگ کی منگول آنکھوں والی بچی بے تحاشا ہنس رہی تھی۔۔اگرچہ ہنسنے سے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا ہوگا کیونکہ اس کی ترچھی آنکھیں بالکل ہی بند ہو جاتی تھیں۔

ان سب کو شنگھائی ہو گیا تھا۔۔

ڈائننگ ٹیبل پر بھی جو کھانے تھے، ان میں ایسی نفاست، ایسا قرینہ تھا کہ مجال ہے کسی نے پوچھا ہو کہ یہ حلال ہے یا نہیں۔ مسلم فوڈ ہے یا نہیں۔ سب نے اسے حسب ذائقہ اور من پسند پایا۔۔

اسی لیے میں نے کہا تھا کہ شنگھائی۔۔ایک اور چین ہے۔

شی آن میں ایک شہنشاہ کا روشن، پتھریلا چہرہ میری کھڑکی سے ناک چپکائے مجھے گھورتا تھا، سونے نہ دیتا تھا اور یہاں شنگھائی میں کمرے کی درجنوں لائٹیں آف کرنے کے باوجود وسیع کھڑکی سے باہر منی نیویارک کی سینکڑوں عمارتوں کی ہزاروں کھڑکیوں میں روشنی کی جو فصل لشکارے مارتی تھی، وہ اس کمرے میں مکمل تاریکی نہیں ہونے دیتی تھی۔۔

اور میری بھی ایک پرابلم تھی۔۔

جب تک دیا بجھ نہ جائے۔۔

لالٹین کی لو بھڑک کر تاریک نہ ہو جائے۔۔

اور جب تک موم بتی پگھل کر آنکھیں نہ موند لے۔۔

مجھے نیند نہیں آتی۔۔

بے شک پہلو میں یار ہو۔۔طالع بیدار ہو۔۔مجھے مکمل اندھیرے کے سوا نیند نہیں آتی۔۔

میں مسلسل کروٹیں بدلتا تھا۔۔

"نیند تم سے کوسوں دور ہے؟" اپنے پھول پر براجمان تتلی کے پر خوابیدگی کی کیفیت میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں..."

"تو پھر چلیں؟"

"کہاں؟"

"جہاں شنگھائی کے گلاب کھلتے ہیں۔ فٹ پاتھوں، شراب خانوں اور

ریستورانوں میں۔"

"یہ گلاب اب بھی کھلتے ہیں؟"

"ہاں۔۔ایک ملک اور دو نظام کے تحت ایسے گلابوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔۔بلکہ ایک مجبوری کے تحت انہیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔۔۔عیاشی، سہولت اور دولت اگرچہ ردِ انقلاب ہیں لیکن ان کی خواہش کبھی متروک نہیں ہوتی۔۔ باہر۔۔اس ہوٹل سے باہر اس شہر شنگھائی میں وہ نیم اندھیرا نہیں ہے جو ہمارے کمرے میں لاگو ہو گیا ہے۔۔وہاں روشنیوں کی چکا چوند میں گلاب کھل رہے ہیں۔۔چلو گے؟"

"نہیں تتلی۔۔میں شی آن سے شنگھائی کے ہوائی سفر سے تھک چکا ہوں۔ اور تم جانتی ہو کہ میری عمر کا ساٹھواں برس میری کنپٹیوں پر دستک دے رہا ہے۔"

"شنگھائی کے گلاب یہ نہیں پوچھتے کہ تمہاری عمر کیا ہے۔۔صرف یہ پوچھتے ہیں کہ تمہاری جیب میں کیا ہے۔"

"کانٹ یُو شٹ اپ۔۔" میں نے بیزار ہو کر تتلی کو ڈانٹ پلائی۔۔

"آئی وِل۔۔" وہ میری ڈانٹ سے ناراض نہیں ہوئی البتہ دیر تک اپنے پر پھڑپھڑاتی رہی اور پھر جب نیند بالآخر مجھ پر اترنے کو تھی، اس نے ایک جنسی سرگوشی میں کہا۔ "سویٹ ڈریمز اِن شنگھائی۔۔ویسے شنگھائی کے گلاب تم سے کبھی نہ پوچھتے کہ تمہاری عمر کیا ہے۔۔تم ان کے شفاف بدنوں سے ملاپ کے بعد نوخیز ہو جاتے۔۔"

انگلستان میں ایک اصطلاح "ڈرٹی اولڈ مین" کی ہے۔۔

اور یہ ایک ڈرٹی اولڈ بٹر فلائی تھی۔۔

جو مجھے بھٹکا رہی تھی۔۔

اور میں بھٹکنے والوں میں سے نہیں تھا۔۔

میں سو گیا۔۔

سویٹ ڈریمز اِن شنگھائی۔۔

''شنگھائی عجائب گھر کا فسانۂ عجائب''

''تتلی تم نے مروادیا...''

''کیوں؟''

''کیا شی آن میوزیم کافی نہیں تھا جو تم مجھے شنگھائی میوزیم میں لے آئی ہو؟''

''تم اسے پسند کرو گے اور ہمیشہ یاد رکھو گے..''

''میں نے اطالیہ اور ہسپانیہ کے سینکڑوں چرچ اور عجائب گھر دیکھے تھے لیکن حرام ہے کہ مجھے اب ان میں سے ایک بھی یاد ہو۔ البتہ فلارنس، وینس اور اشبیلیہ کے گلی کوچوں میں جو آوارہ خرامیاں کی تھیں، ان کا ایک ایک لمحہ یاد ہے.. ہم شنگھائی کے کوچہ و بازار میں مٹرگشت کیوں نہ کریں..''

''تمہیں روم کے سینٹ پیٹرز میں رکھا ہوا مائیکل انجلو کا پائیتا اور فلارنس کا ڈیوڈ یاد ہے ناں.. ڈیوڈ اپنی مکمل بدنی تفصیل کے ساتھ تمہارے وجود پر چھایا رہتا ہے ناں؟''

''ہاں.. ہر بڑے میوزیم میں ایک آدھ ایسا ورک آف آرٹ ہوتا ہے جو آپ کے ذہن پر نشان چھوڑ جاتا ہے.. بلکہ توقع کی جاتی ہے کہ آپ ایک عمدہ ذوق رکھنے والے شخص کی حیثیت سے اسے بہر طور پسند کریں گے.. آپ بے شک نہ پسند کریں لیکن آپ کو کہنا یہی ہوتا ہے کہ واہ واہ سبحان اللہ ورنہ آپ کا ذوق مشکوک ٹھہرتا ہے.. چنانچہ ہر بڑے میوزیم میں کوئی نہ کوئی مونا لیزا ہوتی ہے، فاسٹنگ بدھا ہوتا ہے.. شنگھائی میوزیم میں کیا ہے؟''

''شنگھائی میوزیم کا ہر پیس مونا لیزا اور فاسٹنگ بدھا ہے..''

تتلی یقیناً فرطِ حب الوطنی سے بے حد چینی ہو رہی تھی..

آج صبح ناشتے کے فوراً بعد جب ہمیں حسبِ دستور کوچ میں بھرا گیا تو خاور کی جانب سے اعلان ہوا کہ اب ہم شنگھائی میوزیم دیکھنے جا رہے ہیں.. اس اعلان پر ہر جانب سے آہ و زاری کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ ہائے ہائے ایک اور میوزیم.. شنگھائی میں پہلا دن اور میوزیم.. لیکن یہ نوشتۂ شیڈول تھا کہ.. صبح نو بجے، وزٹ شنگھائی میوزیم..

ایک قابلِ صد توصیف عمارت جس کی بیرونی شیشہ گری ایسی تھی کہ پورا شنگھائی اور اس کی عمارتیں اس میں منعکس ہوتی تھیں.. شاہراہوں پر رواں ٹریفک اس پر الٹ پلٹ دوڑتی پھرتی نظر آتی تھی..

''چلو پھر شتابی سے اس میوزیم کو فارغ کر دیں۔ تتلی اور اس کے بعد دریا کنارے جو بنڈ نامی مشہور زمانہ سیر گاہ ہے، وہاں پہنچیں کیونکہ اس کے بعد شیڈول میں وہیں پہنچنے کے احکامات درج ہیں..''

''پہلے تم یہ کتابچہ پڑھ لو تاکہ تمہیں شنگھائی میوزیم کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہو جائیں..''

''نہ صرف یہ کہ میں اسے پڑھوں گا بلکہ بہ آواز بلند پڑھوں گا تاکہ تم بھی میری بوریت میں برابر کی شریک ہو جاؤ..... شنگھائی میوزیم 1952ء میں قائم ہوا تھا اور دنیا بھر میں چینی نوادرات کی سب سے بڑی کولیکشن یہاں نمائش پر ہے.. نوادرات کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار کے لگ بھگ ہے.. یہ کتابچے میں درج نہیں ہے بلکہ میں حساب کتاب کر رہا ہوں تتلی کہ ہر نادر شے کو اگر صرف ایک سیکنڈ کے لیے ملاحظہ کیا جائے اور اس دوران آنکھیں نہ جھپکی جائیں تو ہم پورا میوزیم صرف چونتیس گھنٹوں کے اندر اندر دیکھ سکتے ہیں.. کتنی سہولت ہے.. یہاں پتھر کے زمانے سے شروع ہو کر منگ اور قوئنگ خاندان سے ہوتے ہوئے ہم عہد جدید کی قربت میں آ جاتے ہیں.. سن رہی ہو تتلی.. جمائیاں کیوں لے رہی ہو؟''

''کیونکہ میں یہ سب کچھ پہلے سے جانتی ہوں۔''

''تو پھر چلیں؟''

''کہاں؟''

''میوزیم میں اور کہاں..''

''میوزیم کی چار منزلوں پر مختلف اشیاء اور نوادر کے ہال ہیں..کس ہال سے شروع کرنا ہے..''

''یار ہم نے بے حال ہی ہونا ہے کسی بھی حال میں ہو جاتے ہیں...تو کس ہال میں یا حال میں؟''

''ہم پہلی منزل پر قدیم ترین چینی ثقافت کی نمائندگی کرنے والے کانسی سے بنے ہوئے شاہکار برتن، مٹکے، شراب کے جام اور پیالے ملاحظہ کر سکتے ہیں...قدیم چینی مجسموں کی گیلری بھی اسی منزل پر ہے..اور یہیں پر ایک سووینئر شاپ ہے۔ بُک سٹور ہے اور ریستوران ہے..دوسری منزل پر قدیم چینی ظروف ہیں..تیسرے فلور پر چینی مصوری، خطاطی اور مہروں کے ایسے بے مثال شاہکار ہیں جن کی قیمت اربوں ڈالر میں بھی نہیں چکائی جا سکتی..اور چوتھے فلور پر چینی جیڈ....جو ایک قسم کا سبز، نیلا قیمتی پتھر ہوتا ہے، اس سے تراشیدہ نمونے ہیں..پھر سکّوں کی گیلری ہے.. مِنگ اور قوئنگ خاندانوں کے عہد کا فرنیچر ہے..تم کہو..کہاں سے آغاز کریں۔''

اتنی تفصیل سن کر میری سٹی گم ہو گئی..لیکن کیا کرتا..ایک پاکستانی ادیب اور دانشور ہونے کی تہمت سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر..میزبان اور دوست ملک چین کی قدیم ثقافت دیکھنے سے..صرف ایک لاکھ بیس ہزار نمونے دیکھنے سے کیسے انکاری ہو سکتا تھا۔

''چونکہ ہم پہلے فلور پر ہیں تو بس یہی دیکھ لیتے ہیں..بقیہ منزلوں پر جو کچھ ہے، اس کے لیے میں تمہاری گواہی پر صدقِ دل سے یقین کر لیتا ہوں...میرے لیے ایک ہی فلور کافی ہے۔''

''تو پھر یہ آلۂ اطلاعات برائے نوادرات اپنے گلے میں ڈال لو اور اس کا چونگا

کان سے لگا لو تاکہ تم ہر اہم پیس کی تفصیل سن سکو جب کہ تم اسے دیکھ رہے ہو گے..''

تتلی نے لمبا سا چھتر نما ریموٹ کنٹرول ایسے آلے کا سٹریپ میرے گلے کا ہار کر دیا..

''یہ ہے کیا؟''

''انفرمیشن..'' تتلی میری بے بسی اور بوریت پر ہنسی..پھڑ پھڑائی اور ہم کانسی کے ہال میں داخل ہو گئے..مدھم روشنی میں سینکڑوں شوکیس تھے جن میں کانسی کے ظروف، شراب کے منقش مرتبان، جام، خوراک کے برتن اور تسلے..اپنے تاریخی سکوت میں دم بخود تھے..ہر آئٹم پر ایک نمبر درج تھا..آپ اپنے گلے میں ہار ہوتے آلۂ اطلاعات پر وہ نمبر دبائیں..پھر چھ سات بین الاقوامی زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اس کا بٹن پریس کریں تو ایک سنجیدہ اور گھمبیر آواز اس نادر شے کی تاریخ، خصوصیات اور اہمیت بیان کرنے لگے گی..

گیلری میں قدموں کی ہلکی سرسراہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی..جیسے کسی عبادت گاہ میں آ گئے ہوں۔ ملاقاتی سر جھکائے اپنے آلۂ اطلاعات کو کانوں سے لگائے اپنے پسندیدہ شوکیس کے سامنے کھڑے..اس شوکیس میں سجے شاہکار کی حکایتیں سن رہے تھے..صرف بیان جاری نہیں رہتا تھا بلکہ آپ کو ہدایات بھی دی جاتی تھیں کہ براہ کرم اب ذرا گھوم کر دوسری جانب جا کر اس صراحی کا ہینڈل دیکھئے..ذرا قریب ہو کر دیکھئے..آپ دیکھیں گے کہ ہینڈل میں ایک سوراخ ہے..یہ کاریگر کی انگلی کا ہے...یہ جام منگ خاندان کے فلاں شہنشاہ کا پسندیدہ تھا اور جب تک وہ اس جام سے شراب نہیں پیتا تھا اسے نشہ نہیں ہوتا تھا..اور یہ جو مرتبان ہے، اس میں خون کی آمیزش سے ایک خاص شراب تیار کی جاتی تھی اور اس کے نقش غور سے دیکھئے..ایسے گل بوٹے آج کا کوئی کاریگر نہیں ابھار سکتا..وغیرہ وغیرہ۔

کہاں وہ وقت کہ درویش اس میوزیم کو اپنی جان پر قہر سمجھتا تھا اور کہاں یہ وقت کہ درویش پر ان قدیم کمالات کی کاریگری اور انوکھے حسن کا ایسا جادو چلا کہ وہ ایک ہی منقش مرتبان کے گل بوٹوں میں الجھا مبہوت کھڑا اسے ہی دیکھے جا رہا ہے..اس کی قدامت

اور جمال کی پیچیدگیوں میں گم ہے اور وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا اور تتلی مسلسل اس کی کمر میں کچوکے دے رہی ہے کہ اب جانے بھی دو، اگلے شوکیس کی جانب بڑھو۔ ابھی تو ایک لاکھ سے زائد نمونے اور بھی ہیں.. اور وہ تتلی کی منتیں کر رہا ہے کہ بس پلیز ایک منٹ اور.. مجھے یہ ڈیڑھ ہزار برس قدیم پیالہ تو جی بھر کے دیکھنے دو جس پر ابھرے نقش میرے دل میں ابھرتے جاتے ہیں..

پھر ہم چینی مجسّموں کے بُت کدے میں داخل ہوئے. تو وہاں بھی یہ نہ دیکھا گیا کہ یہ بُت ہے یا خدا ہے، دیکھا نہ جائے..

اور یہاں کچھ ایسے مجسّمے بھی تھے جن سے میری جان پہچان تھی بلکہ ان کے تراشنے میں میرے خطے کے گندھارا بُت تراشوں کا اثر نمایاں تھا..

میں پہلے بھی اپنے اس تعصب کا اظہار کر چکا ہوں کہ اگر مہاتما بدھ کا حسن کسی نے پتھر میں ڈھالا ہے تو وہ صرف ہم تھے.. اگرچہ ہم نے یونان کے اپالو کے کچھ نین نقش اپنے بدھ میں دریافت کیے لیکن کاریگری اور محبت صرف ہماری تھی.. چین، جاپان یا نیپال یا ہندوستان کا کوئی بھی بُت تراش مہاتما بدھ کی روح کو نہیں پہنچ سکا. صرف ہم تھے.. گندھارا کے بُت تراش.. ہمارے مقابلے میں چینی یا جاپانی یا تبتی.. گوتم کے لمبے لٹکتے کانوں اور اس کی توند پر زیادہ توجہ دیتے رہے۔ اس کے اندر کے حسن کو دریافت نہ کر سکے.. جو صرف ہم نے کیا.. میں نے عرض کیا ناں کہ یہ ایک تعصب کا اظہار ہے..

تتلی میرے وارفتگی سے فکرمند ہو گئی۔ ''تم اگر کچھ دیر سستانا چاہتے ہو تو ہم ریستوران میں بیٹھ کر کافی پی سکتے ہیں..''

''نہیں..'' میں نے اسی عالم گمشدگی میں سرگوشی کی۔ ''میں تھکا ہوا نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمیں اس میوزیم کو دیکھنے کے لیے صرف دو گھنٹے کی مہلت دی گئی ہے اور اس کے بعد ہمیں داخلے کے دروازے پر جمع ہونا ہے.. لیکن تتلی اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر میں وہاں جمع نہ ہوں. تفریق ہو جاؤں.. یہیں میوزیم میں اپنی خوشی سے بھٹکتا رہوں۔''

تتلی نہایت ہی فکرمند ہو گئی۔ ''تم تھک جاؤ گے...''

''میں.. ایک چینی گھوڑا ہو چکا ہوں تتلی.. اس میوزیم کی اگر سو منزلیں بھی ہوتیں تو میں قطعی نہ بدکتا اور نہیں ٹاپتا ہوا.. نوادرات کو دیکھتا ہوا آخری منزل تک جا پہنچتا.. اب بتاؤ کہ دوسری منزل پر کیا ہے..''

تتلی نروس ہو چکی تھی.. وہ نہیں جانتی تھی کہ میری شخصیت میں ایک پہلو سحر کا بھی ہے.. میں آسانی سے مسحور ہو جاتا ہوں.. اور اگر ہو جاؤں تو میں اپنے آپے میں نہیں رہتا.. کسی کے قابو میں نہیں آتا.. وہ میرے لیے فکرمند تھی اور مجھے ایک ذہنی مریض کی مانند نہایت احتیاط سے ہینڈل کر رہی تھی۔ ''دوسری منزل پر جیڈ پتھر کے نوادرات سجے ہیں.. محض پتھر ہے.. دیکھو گے یا ریستوران میں کافی پیئیں؟''

''تتلی تم جانتی ہو کہ بہترین قسم کا جیڈ پاکستان میں ملتا ہے.. لیکن ہم اس سے ایش ٹریز، گلدان، قلمدان اور بھدے سے مجسّمے بناتے ہیں.. محض سیاحوں کی خوشنودی کے لیے.. ہم مجسّمے تراشتے ہوئے ہمیشہ ایک احساسِ جرم کا شکار ہوتے ہیں کہ ہم ایک گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں.. اس کی ممانعت ہے.. مناہی ہے.. بھئی اگر جرم کر ہی لیا ہے تو اسے کم از کم سلیقے سے تو کیا جائے.. اور آپ لوگ ہر کام سلیقے سے کرتے ہیں کیونکہ آپ کے ہاں ایک باقاعدہ مذہب اور پابندی کا کوئی تصور نہیں.. تو کافی بعد میں پیئیں گے.. پہلے جیڈ کے پتھر کے نوادرات دیکھیں گے..''

جیڈ.. ڈکشنری کے مطابق اگرچہ ایک تھکے ہوئے گھوڑے کو بھی کہتے ہیں.. جو میں نہ تھا.. لیکن.. چین کی پہچان اگر کسی ایک شے سے ہے تو وہ یہ سخت.. سبز اور نیلے رنگ کا پتھر ہے جو چینی مجسمہ سازوں کا محبوب ترین پتھر ہے... وہ ہزاروں برسوں سے اسے تراش کر عجب عجائبات تخلیق کرتے آئے ہیں.. جس پتھر سے ہم ایش ٹریز اور بھدّے گلدان بناتے ہیں چینی اسی پتھر سے.. ایک مچھلی.. ایک مینڈک.. یا ایک نازک شہزادی بناتے ہیں تو وہ یادگار ہو جاتے ہیں.. چنانچہ یہ مواد یا مصالحہ نہیں ہوتا جو شاہکار تخلیق کرتا ہے بلکہ ہاتھ ہوتے ہیں.. جیسے ایک دل جلے نے نہایت دل گرفتگی سے اپنا نکتہ نظر بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ یارو ہم پاکستانی اور وہ جاپانی کام تو ایک ہی کرتے ہیں لیکن اس کے نتائج مختلف ہوتے

ہیں..ہم ایک من تانبے کو دن رات کوٹ کوٹ کر ایک آٹا گوندھنے والی پرات بنا لیتے ہیں اور جاپانی ایک تولہ تانبا کوٹ کوٹ کر ایک ''چپ'' بنا لیتے ہیں..

یہ جو گیلری جیڈ کے پتھر کی تھی، اس میں تین ہزار برس قدیم کاریگری بھی تھی اور ابھی تک پُر بہار تھی..اور پانچ سو برس پُرانے نمونے بھی ایسے تھے کہ ان پر نظر ٹھہر کر کہیں اور جانے کے قابل نہیں رہتی تھی..

تتلی پھر کچوکے دے رہی تھی..

ایک تتلی کی نازکی میں ایسے کچوکے دینے کی صلاحیت تو نہیں ہوتی کہ وہ مجھ ایسے فربہ اور بے ڈول شخص پر اثر کر سکے..لیکن ہم دونوں میں ایک بندھن تھا..ہونے یا نہ ہونے کا..اگرچہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں تتلی ہو گیا ہوں..لیکن جاگنے پر ابھی کچھ فیصلہ نہ ہوا تھا کہ میں تارڑ ہو چکا ہوں یا ابھی تک تتلی ہوں..اس لیے تتلی کی نازکی مجھ پر اثر کرتی تھی..

''اب کیا کہتی ہو... پہلے میں یہاں لایا نہیں جانا چاہتا تھا..اب آ گیا ہوں تو جایا نہیں جانا چاہتا تو اب کیا کہتی ہو؟''

''سکوں کی گیلری میں چلیں؟''

''چلیں..ان میں میرے جیسا ایک کھوٹا سکہ بھی شامل ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے..''

''تم ایک کھوٹا سکہ ہونے کے باوجود ہر میدان میں چل گئے ہو..چاہے وہ شہرت ہو یا محبت ہو..تو تمہیں کیا شکایت ہے؟'' تتلی کا لہجہ ہی بدل گیا..وہ مجھے بے عزت کرنے پر تُل گئی..

''اگر میں کھوٹا ہوں تو تم کیسے کھری ہو سکتی ہو..'' میں نے کھسیانے ہو کر کہا۔ ''آؤ..کھرے سکوں کی گیلری میں چلتے ہیں۔''

چنانچہ ہم سکوں کی گیلری میں داخل ہو گئے..

یہاں بھی قدیم چین کی پوری تاریخ محفوظ تھی..ہر سائز اور ہر حجم کے ہزاروں برس پرانے سکے..کوئی سکہ چابی کی شکل کا تھا اور کسی کے درمیان میں چوکور یا گول سوراخ تھا جیسے کسی زمانے میں ہمارے ایک پیسے کے درمیان میں ہوتا تھا..یہاں سونے اور چاندی

کے سکے بھی نمائش پر تھے..چینی صرف سکوں کے استعمال میں ہی اولیت نہیں رکھتے تھے بلکہ انہوں نے دنیا کا پہلا کاغذی کرنسی نوٹ بھی جاری کیا..

سکوں کی نمائش کے بعد منگ اور قوئنگ خاندان کے فرنیچر کی گیلری آ گئی..

اس عہد رفتہ کے فرنیچر میں..کرسیوں..پلنگوں..سکرینوں..الماریوں اور طویل میزوں کے ڈیزائن میں اتنی باریکیاں اور نزاکتیں تھیں کہ میں اپنے آلۂ اطلاعات کو کان سے لگائے ان کی بے مثل اور سینکڑوں برس پرانی کاریگری اور تراش کے ناقابلِ یقین حوالے ایک گہری اور سنجیدہ آواز میں سنتا رہا..اگرچہ میں سوچتا بھی رہا..

اور کیا سوچتا رہا..بس یہی کہ جو زرد شہزادیاں ان تخت پوشوں پر براجمان ہوتی ہوں گی..ان پلنگوں پر راتیں بسر کرتی ہوں گی، وہ کیسی نازک اور مدھر ہوتی ہوں گی..

اب جو چینی ظروف کے ہال میں پہنچے تو سب کچھ اپنا اپنا سا لگا..اس لیے بھی میرے بچپن میں عام مڈل کلاس گھرانوں میں بھی صرف ''پکے'' برتن استعمال ہوتے تھے جن کے دم قدم سے قلعی گر روزی کماتے تھے اور ہماری مائیں اور پھپھیاں ان پکے برتنوں کو ہر کھانے کے بعد کُھرے میں چوکڑی مار کر راکھ مل مل کر صاف کرتی تھیں..صرف خاص موقعوں پر ہی ان برتنوں کو بصد احتیاط الماری سے نکالا جاتا تھا جنہیں ''چینی کے برتن'' کہا جاتا تھا..اور اُن میں کھاتے ہوئے بھی نہ صرف مہمان معزز محسوس کرتا تھا بلکہ لقمہ بھی آہستگی سے لیتا تھا کہ کہیں یہ ٹوٹ نہ جائیں..ان دنوں امراء کے بارے میں مشہور ہوتا تھا کہ جناب وہ تو تمام کھانے صرف چینی کے برتنوں میں ہی تناول فرماتے ہیں..

چینی پچھلے تین ہزار برس سے انہی چینی برتنوں میں ہی کھاتے اور پیتے چلے آئے ہیں..منگ خاندان کے ظروف کا شمار اعلیٰ ترین نوادرات میں ہوتا ہے..کہتے ہیں کہ مونا لیزا کا حصول شاید آسان ہو لیکن منگ خاندان کا ایک پیالہ ملنا تقریباً ناممکن ہے..

اور اس گیلری میں منگ خاندان کی کراکری کے ڈھیر تھے..

اس ہال میں برتن پکانے کی ایک بھٹی بھی تعمیر کی گئی تھی جہاں ان ظروف کی مٹی..اس کا گوندھنا..ان کی بناوٹ اور زیبائش۔ان پر چینی کے پوچے اور پھر آگ میں پکائے جانے کا

عمل دکھایا گیا تھا.. یہ بھٹی ایک ہزار برس پہلے کی بھٹیوں کے نمونے پر بنائی گئی تھی..

ظروف کے برابر میں چینی گڑیوں کے پرانے نمونے سجے تھے' جن کے سامنے کھڑے ہو کر مجھ پر پہلی بار کھلا کہ وارث شاہ نے ہیر کو پیکنگ کی پتلی کیوں کہا تھا..

ع پُتلی پیکنے دی تے نقش روم والے

یہی وہ پیکنگ کی پتلیاں تھیں جن کے بدن کی نزاکت اور کانچ کے ذرا سے چھو جانے سے ان کے کرچی کرچی ہو جانے کا خدشہ ہوتا تھا.. اور یہی ہیر تھی..

اب اس کا کیا ذکر کروں کہ چینی مصوری اور خطاطی کی گیلریوں میں مجھ پر کیا گزری.. شنگھائی میوزیم نے مجھے بھی قدیم کر دیا اور کچھ کچھ چینی کر دیا..

تتلی ہنستی تھی اور مجھ سے چہلیں کرتی تھی "پہلے آتے نہیں تھے اور اب جاتے نہیں ہو"

پیاس یا تھکن نے نہیں ہمیں شیڈول نے باہر آنے پر مجبور کر دیا..

ہم میوزیم کی عمارت سے باہر آئے تو مجھے ایک دھچکا سا لگا کہ یہ کیا ہو گیا ہے.. ایک شاک سا پہنچا.. باہر شنگھائی کے سینکڑوں سکائی سکریپر سر اٹھائے کھڑے تھے. ٹریفک کا ہجوم.. نیکروں اور مختصر بلاؤزز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی لڑکیاں.. شنگھائی روز.. جانے کہاں کھلنے جا رہی تھیں.. میں ماضی کی کشتی سے نکل کر حال کے مدار میں چلا گیا تھا..

میوزیم کے باہر سفید پتھر کے اژدھوں کی قربت میں وفد کے اراکین نہایت بوسیدہ شکلیں بنائے کھڑے تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے..

"اب کہاں جانا ہے؟" کسی نے لیو سے دریافت کیا..

"بنڈ.." لیو نے چہک کر جواب دیا..

"آہستہ بولو یار." سفید ریش شاعر نے فوراً اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا.

"لیکن بنڈ تو شنگھائی کی سب سے پسندیدہ اور چین کی خوبصورت ترین ساحلی سیر گاہ کا نام ہے.."

"تو چپکے سے چلے چلو.. بار بار نام لینے کی کیا ضرورت ہے."

"دریائے چانگ جانگ کے کنارے ساحلی سیر گاہ"

بُنڈ... دریائے چانگ جانگ کے کنارے ایک ساحلی پٹی ہے.. چوڑا فٹ پاتھ ہے جس پر جا بجا رنگین چھتریوں تلے قہوہ خانے اور ریستوران ہیں اور جس پر ہمہ وقت ایک فیشن پریڈ جاری رہتی ہے.. اہل شنگھائی وہ شہر میں جہاں کہیں بھی ہوں بے شک چند لمحوں کے لیے ہی سہی' یہاں مٹر گشت کرنے ضرور آئیں گے.. یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص پورے چین میں نہ ملے تو وہ آپ کو بُنڈ پر مل جائے گا.. شرط چونکہ پورے چین کی تھی پوری دنیا کی نہیں تھی' اس لیے ہم نے کسی کو تلاش کرنے کی جستجو نہ کی..

اگرچہ شنگھائی ایک خوش شہر شمار کیا جاتا ہے لیکن یہاں بھی میں نے دیکھا کہ بہت کم لوگ ہنستے تھے.. خال خال ہی کوئی مسکراتا تھا.. اگر آپ کو کہیں سے کوئی قہقہہ سنائی دے جائے تو جان لیجیے کوئی سیاح ہو گا.. چینی پبلک میں خاصے خشک اور سنجیدہ رہتے ہیں.. ہو سکتا ہے گھر سے نکلتے ہوئے پورے دن کے لیے ہنس لیتے ہوں یا شام کو گھر پہنچ کر جی بھر کے مسکرا لیتے ہوں.. بُنڈ پر بیشتر لوگ سیر کو ایک ڈیوٹی کی طرح سرانجام دیتے نظر آتے تھے..

دریائے چانگ جانگ کے دوسرے کنارے پر شنگھائی کا جو حصہ تھا' اس میں ٹیلی ویژن ٹاور سب سے نمایاں تھا.. اس کے بلند وجود میں دو مقامات پر حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح بیلون سے ہیں جو دراصل ریستوران ہیں.. عجیب سا ڈیزائن ہے لیکن شنید ہے کہ یہ

جدید فن تعمیر کا ایک شاہکار وغیرہ ہے.. دریا پار حال ہی میں مکمل ہونے والی اٹھاسی منزلہ چین کی سب سے اونچی عمارت جن ماؤ ٹاور ہے جو دراصل امریکیوں کی عنایت کردہ ہے..

دریا کی چوڑائی اتنی ہے کہ اس میں ہر لمحے بھونپو بجاتے بڑے بڑے جہاز گزرتے رہتے ہیں اور بُنڈ پر سیر کرنے والے ان کی جانب قطعی طور پر نہیں دیکھتے..صرف سیاح جنگلے کے ساتھ لگ کر خوامخواہ ان کی جانب ہاتھ ہلاتے رہتے ہیں..

دھوپ نہ بھی ہو تو اہل شنگھائی خوش نظر رنگوں کی چھتریاں تانے اس ساحلی پٹی پر پریڈ کرتے نظر آتے ہیں..

یہاں ٹائٹ جینز، نیکریں مختصر ترین اور بے حد رنگین بلاؤز، رنگے ہوئے بال، پینٹ کیے ہوئے رخسار اور چہرے اور پلیٹ فارم شوز نظارۂ عام ہیں..

بُنڈ پر..پھول ہیں..سجاوٹی جھاڑیاں اور پودے ہیں..

اس ساحلی تفریح گاہ کے برابر میں وہ پارک ہے جہاں وہ بدنام زمانہ تختی آویزاں تھی جس کا تذکرہ چینی پسند نہیں کرتے..

یہ ساحلی پٹی شنگھائی کا فخر کہلاتی ہے..

اگرچہ یہاں ہوا میں تازگی تھی بے شک حسیناؤں میں بظاہر بے رخی تھی..شاندار آبی منظر تھے..دریا میں سے جہاز گزرتے تھے..دریا کے پار پُرشکوہ آسمان کو چھوتی عمارتیں تھیں لیکن سچی بات ہے یہ وہ مقام نہیں تھا جہاں سے رخصت ہونے پر انسان رنجیدہ محسوس کرتا ہے یا وہاں واپس آنے کے خواب دیکھتا ہے..

شاید یہ احساس اس لیے ہمیں اپنی گرفت میں لے رہا تھا کہ ہم بھری دوپہر میں یہاں آئے تھے اور اس کی سامری سحریت چراغ روشن ہونے پر ہی اثر دکھاتی تھی..

یا شاید اس لیے کہ ہم ابھی ابھی ماضی سے حال میں آئے تھے..ہزاروں برس کا سفر طے کر کے آئے تھے..منگ خاندان کے ظروف سے..شراب کے مرتبانوں اور پیالوں سے پیاس بجھاتے تھے..پیکنگ کی پتلیوں کے بدن کی نازکی محسوس کرتے انہیں اپنی اپنی ہیریں سمجھتے..قدیم خطاطی اور مصوری کے دائروں، بگلوں اور جھیلوں میں عمر بسر کرتے اور

مِنگ پلنگوں پر راتیں کرتی زرد شہزادیوں کی خلوت میں تھے..وہیں سانس لیتے تھے..اور اب یہاں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا..

ہم ذہنی طور پر وہیں رہ گئے تھے اور ہمارے بیکار بدن یہاں چلے آئے تھے اور ہم عہدِ جدید کا سامنا نہیں کر سکتے تھے..

شاید اس لیے...!

''چینی ادیب ایک بڑا ناول نہیں لکھ سکتے...... کیوں؟''

ہم چونکہ بہر طور ادیب اور شاعر تھے..

اور یہی وہ حیثیت تھی جس کے باعث ہم سرکار چین کے محترم مہمان تھے۔اس لیے ہم بہر طور ہر شہر میں مقامی ادیبوں سے میل ملاقات کرتے تھے..

اوران ملاقاتوں میں ہم نہایت پُر جوش انداز میں پاک چین دوستی اور برادر پڑوسی ملک کی اخوت کے بارے میں رٹی رٹائی تقریریں کرتے تھے اور مقامی ادیب بھی جواب میں اسی قسم کے ولولہ انگیز جذبات کا اظہار کرتے تھے..کم از کم ہمارے مترجم ہمیں یہی بتاتے تھے..چواین لائی نے شاید ایک بار یہ کہا تھا کہ مترجموں کے ہاتھوں میں ملکوں کی تقدیر ہوتی ہے..اور چواین لائی یہ کہہ سکتے تھے کیونکہ انہیں انگریزی اور فرانسیسی پر عبور حاصل تھا اور اس کے باوجود وہ گفتگو چینی میں کرتے تھے اور پھر مترجم کی طرف دیکھتے تھے کہ وہ درست ترجمہ کر رہا ہے یا نہیں..اور کبھی کبھار اس کی تصحیح بھی کر دیتے تھے..ادیبوں سے ملاقاتوں کے دوران تقریروں سے فارغ ہو کر تحائف کا تبادلہ ہوتا تھا..پھر لیڈر ایک افتتاحی تقریر کرتا تھا جو اس کو منہ زبانی یاد تھی اور پھر شہر کے کسی اعلیٰ ریستوران میں پاک چین دوستی کے جام بلند ہوتے تھے..ان جاموں میں وہی کچھ ہوتا تھا جس کے بارے میں ظفر اقبال نے کہا تھا..

یہاں کسی کو کچھ بھی حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تو نہ ملا

تو حسب آرزو اگرچہ ہر شے میسر تھی مگر اس کا اظہار برملا نری بدنامی تھی..اس لیے ان جاموں میں اکثر اوقات صرف منافقت کے پانی ہوتے تھے..

لیکن شنگھائی کے ادیبوں سے ملاقات سراسر مختلف تھی..

ان کی نسل کچھ اور لگتی تھی..

اس شب شنگھائی کے ایک معروف..قدرے قدیم اور نہایت گراں ریستوران کے ایک حسب معمول پرائیویٹ کمرے میں چین کے اہم ترین ناول نگاروں اور تجزیہ نگاروں سے جو ملاقات ہوئی، وہ سراسر مختلف تھی۔

میں ایک نہایت اہم اگرچہ بیشتر پاکستانی ادیبوں کے لیے نہایت دل خراش حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ چین میں ہم جہاں کہیں بھی گئے اور جہاں چینی لکھنے والوں نے ہمارے توقیر کی اور دعوتوں کا اہتمام کیا، وہاں ان میں جو ہماری توقیر کے لیے چشم براہ تھے، شاعر نہیں تھے..یا تو ناول نگار تھے یا افسانہ نویس تھے اور جب وفد کے شاعر حضرات حسرت سے پوچھتے تھے کہ آپ بھائیوں میں سے شاعر کون کون ہیں تو وہ بھی ذرا خجل ہو کر حسرت سے جواب دیتے تھے کہ کوئی بھی نہیں..یا صرف یہ ایک دانہ ہے..اس لیے کہ موجودہ چین میں اور یہ معاملہ بقیہ دنیا سے مختلف نہیں ہے..جتنے بھی بڑے اور مؤثر ادیب ہیں وہ سب کے سب نثر نگار ہیں..

اور اس حقیقت کے بیان کر دینے میں شاعروں کے لیے میرا بغض ہرگز شامل نہیں ہے..اسے میں نے کسی اور موقع کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے..

شنگھائی کے ادیبوں نے، مدیروں اور نقادوں نے سرسری طور پر برادرانہ اخوت کا اظہار کیا اور پھر کھانے کے فوراً بعد ایک سنجیدہ بحث کا آغاز کر دیا..

پاکستان میں ناول کی پوزیشن کیا ہے..آپ لوگ کن موضوعات پر لکھتے ہیں..کونسے بڑے ناول نگار ہیں..آپ کونسے بین الاقوامی شہرت یافتہ ناول نگاروں سے متاثر ہیں اور کیوں ہیں..اس لیے کہ ہم اب تک کمیونزم کی ایک بند گلی میں تھے..اب باہر آئے ہیں تو ہمیں فرانز کافکا اور جیمز جوائس کی تحریروں نے بے حد متاثر کیا ہے اور نئے ناول نگاروں پر ان کا بے حد اثر ہے..آپ کا کیا خیال ہے؟..

اس پر مجھے یاد ہے..اور اچھی طرح یاد ہے بلکہ میرے ذہن پر نقش ہے کہ لیڈر نے..جو ایک شاعر ہے' نہایت استہزائی انداز میں کہا تھا'' تارڑ صاحب..اب بولو..'' اس کی دلی خواہش تھی کہ میں اس سوال پر لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگوں یا بجانے لگوں..جو بھی محاورہ ہے..لیکن مجھے بے حد قلق ہوا..کیا میرے لاجواب ہونے سے یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ میں ایسی برگزیدہ ہستیوں میں شامل کیے جانے کے لائق نہ تھا..مجھے از حد قلق ہوا..

لیکن میں اپنا ماضی تبدیل نہیں کر سکتا تھا جس میں یہ سب حوالے موجود تھے..

'' جب میں نے سنجیدگی سے لکھنے کا آغاز کیا'' میں نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا'' تو میں بھی کامیو، آندرے ژید، سارتر اور کافکا سے اتنا متاثر تھا کہ میں نے اپنا پنجابی ناول'' پکھیرو'' انہی کے رنگ میں لکھا..اسی انداز اور فلسفے کے زیرِ اثر تحریر کیا..اور شاید انہی ادیبوں نے میری تحریر کو سنوارا..اس میں کسی حد تک جو زور ہے، یہ انہی کی دین ہے اور میں اس سے انکار نہیں کر سکتا..اوائل عمر میں ان کا تتبع میرے لیے باعثِ شرمندگی نہیں ہے..میں نے جو کچھ سیکھا ہے، اپنے سے بڑے لکھنے والوں سے سیکھا ہے..میں دوسرے لوگوں کی مانند اپنا ٹیلنٹ آسمان سے نہیں لایا تھا..ان کے بعد ٹالسٹائی اور دوستوفسکی بھی آئے جنہوں نے انگلی پکڑ کر مجھے چلنا سکھایا..لیکن..ہر لکھنے والے پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ سہاروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے..اور یہ اس کی زمین اور ثقافت ہوتی ہے جو اسے بے نیاز کرتی ہے اور ایک نیا راستہ دکھاتی ہے..آپ نے جیمز جوائس کا حوالہ دیا ہے..میں اپنی دانشوری کو شدید دھچکا دینے کے خطرے کو مول لے کر بھی یہ اقرار کرتا ہوں کہ اس کا ناول'' یولسس'' اگرچہ '' ٹائم میگزین'' نے اس صدی کا سب سے بڑا ناول قرار دیا ہے لیکن میرے نزدیک وہ دنیا کا بور ترین ناول ہے اور انتہائی اوور ریٹڈ ہے..میں نے صرف اپنی دانشوری کا بھرم رکھنے کی خاطر اس ناول کو دل پر پتھر رکھ کر..اپنے آپ پر جبر کر کے پڑھا تو ہے لیکن اسے پسند نہیں کیا..آپ لوگ بقول آپ کے ابھی ابھی کمیونزم کی تنگ گلی سے باہر آئے ہیں، صرف اس لیے آپ کو جیمز جوائس متاثر کرتا ہے..البتہ کافکا کا تو میں بھی پیروکار ہوں..کچھ دن انتظار کریں۔آپ بھی میری طرح ان لکھنے والوں کے سہارے چلیں گے اور پھر اپنے چین کے

راستے تلاش کریں گے..لیکن...میرا خیال ہے کہ آپ چینی فی الحال...ایک جاپانی..ایک مصری..ایک مراکشی..یا ایک جنوبی امریکی کی مانند..ایک بڑا ناول نہیں لکھ سکتے..

اپنی جانب سے کچھ احتجاج ہوئے کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..

'' میرے دل میں ایک خلش ہے..''

'' کیا؟'' یہ تتلی کی آواز تھی..

'' میں چینی ناول نگاروں سے ایک وضاحت چاہتا ہوں..''

'' تم انہیں ایک بڑا ناول تحریر کرنے کے امکانات سے مسترد کر چکے ہو تو پھر کیسی وضاحت چاہتے ہو؟'' تتلی بھی لیڈر کی مانند مجھے سرنگوں اور خاک چاٹتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔

'' میں ایک وضاحت چاہتا ہوں..'' میں ضدی ہو گیا۔

'' بولو...''

'' چینی ادیبوں کے پاس رشتوں کا تجربہ نہیں ہے..چینی ہمیشہ خاندان اور رشتوں کے تانے بانے سے بُنا گیا ہے..لیکن اب..اے تتلی تم جانتی ہو کہ چین میں ایک جوڑا..اور صرف ایک بچے کی سرکاری پابندی ہے..وضاحت میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر..بچہ ہو گا تو ظاہر ہے کہ وہ بہن اور بھائی کے رشتے سے ناواقف ہو گا اور اس کے ماں اور باپ بھی چونکہ اکلوتے ہوں گے، اس لیے ان کے بہن بھائی بھی نہیں ہوں گے جس کے نتیجے میں اس بچے کا کوئی ماموں، چاچا، خالہ یا پھپھی جان ہرگز نہیں ہوں گی..اور درجنوں کزن بھی نہیں ہوں گے..خالہ زاد، پھپھی زاد، ماموں زاد، بہن بھائی سب ناپید..یوں آپ کا ایک چینی بچہ بڑا ہوتا ہے تو ان تمام رشتوں سے یکسر ناواقف ہوتا ہے اور ان سے جنم لینے والی محبت یا نفرت سے بھی لاعلم ہو گا..چینی ادب اور ثقافت کی بنیاد ہمیشہ خاندان رہا ہے..جب خاندان ہی نہیں، اس کا تجربہ ہی نہیں تو پھر آپ ایک بڑا ناول کیسے لکھ سکتے ہیں؟''

اور شنگھائی کے ناول نگاروں نے کھلے دل سے اقرار کیا کہ ہاں..جب رشتے نہیں ہوں گے تو ناول واقعی محدود ہو جائے گا..کم از کم آپ خاندانی رشتوں کے حوالے سے ناول نہیں لکھ پائیں گے..لیکن ایک بچہ ایک خاندان ہماری اقتصادی مجبوری ہے..یہ ہماری ترقی کے لیے ناگزیر تھا..البتہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اب صورت حال بدل رہی ہے..آبادی کے تناسب سے

اقتصادی حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ جلد ہی حکومت اس پالیسی پر نظرثانی کرے اور دو بچوں کی اجازت دے دے۔

''تو کیا پورے چین میں ہر جوڑا صرف ایک بچہ پیدا کرنے کے بعد فل سٹاپ لگا دیتا ہے؟..'' حسرت ناک کا حسرت آمیز سوال آیا..

''ہاں..عام طور پر اس پالیسی کی پابندی کی جاتی ہے کیونکہ عوام اس کے فوائد سے آگاہ ہیں..لیکن اس سے روگردانی بھی کر لی جاتی ہے..خاص طور پر دیہات میں اس قانون کی خلاف ورزی ہوتی رہتی ہے..لوگ زیادہ بچے پیدا کر لیتے ہیں..''

''تو پھر انہیں اس جرم کی سزا ملتی ہے؟'' کسی نے پوچھا..

''نہیں..صرف یہ ہے کہ اس بچے کے لیے والدین کو سرکاری مراعات نہیں ملتیں..ایک بچہ تو مکمل طور پر حکومت کی ذمہ داری ہوتا ہے..دوسرے بچے کی کفالت کے لیے والدین کو ذاتی طور پر تگ ودو کرنی پڑتی ہے..بلکہ ہمارے ہاں آج کل ایک سٹیج ڈرامہ نہایت پاپولر جا رہا ہے اور اس میں کامیڈی میں یہ ہے کہ ایک عورت بہت سے بچے پیدا کر لیتی ہے اور پھر انہیں چھپاتی پھرتی ہے..''

تتلی ایک تلے ہوئے جھینگر یا جھینگے پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔''اگر تم اس دانش ورانہ اور فضول بحث سے فارغ ہو گئے ہو تو ہوٹل چلیں..مجھے نیند آ رہی ہے..''

''مجھے نہیں آ رہی..''

''باتیں کر کر کے تمہارا بھیجہ خشک ہو گیا ہے..شائد اس لیے..ویسے یہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے نیند آ رہی ہو اور تمہیں نہ آ رہی ہو کیونکہ..کیا پتہ ہم دونوں میں تارڑ کون ہے اور تتلی کون..چنانچہ نیند آ رہی ہے تو دونوں کو آ رہی ہے..چلو..''

ہوٹل ایکوٹوریل کی تیسویں منزل تک پہنچنے کے لیے اس مرتبہ تتلی نے بھی لفٹ میں سفر کیا..کمرے میں پہنچتے ہی وہ ایک ایش ٹرے میں پر سمیٹ کر نیند میں گم ہو گئی..

اگر تتلی سو گئی تھی تو میں کیسے بیدار رہ سکتا تھا..میں بھی سو گیا..

سویٹ ڈریمز ان شنگھائی..

''شنگھائی رائٹرز یونین کے گھر میں گارسیا مارکیز سے ملاقات''

ہماری کوچ شنگھائی کی ستھری چمکتی شاہراہوں پر اپنے آپ کو پھسلنے سے بچاتی ایک نویں نکور..شیشہ ہی شیشہ..لش لش کرتی لشکتی پتہ نہیں کتنی منزلہ عمارت کے سامنے جا رکی..

''پلیز کم..'' وانگ لی نے اترنے کا اشارہ کیا..

''اوئے یہ ہمیں کسی اور ہوٹل میں لے آئے ہیں..تو کیوں لے آئے ہیں..لے آئے ہیں تو یہاں سامان کے بغیر کیا کریں گے..لیکن کیوں لے آئے ہیں..کمال کے لوگ ہیں، ہمیں پوچھتے بھی نہیں کہ کہاں لے جا رہے ہیں..اور کیوں لے جا رہے ہیں..کیوں جی..'' حسرت ناک اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہا تھا..

''مولانا..یہ کیا ہے؟'' گیسو دراز نے ذرا لچک کر مجھ سے پوچھا۔''کوئی پیلس وغیرہ معلوم پڑتا ہے..''

''کیوں مولانا؟'' میں نے خاور سے رجوع کیا..

''یہ شنگھائی رائٹرز یونین کی نئی عمارت ہے اور پورے شہر میں اس کی نفاست اور حسن کی مثال دی جاتی ہے..اس میں متعدد ادبی، نیم ادبی اور فیشن کے رسالوں کے دفاتر ہیں..شنگھائی کے اہم اخباروں کے مرکزی دفتر بھی اسی میں واقع ہیں..اس کے علاوہ ادیبوں اور صحافیوں کے لیے طرح طرح کی سہولتیں ہیں..''

''کیا سہولتیں ہیں؟''

"یہ اندر جا کر پتہ لگے گا.." خاور ہنسا اور اس نے ایک خصوصی لاہوری فقرہ اہل لاہور کی مانند ادا کیا "بلکہ لگ پتہ جائے گا۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ اس عمارت کے اندر جا کر جو کچھ ہم نے دیکھا، وہ صرف اسی فقرے سے بیان ہو سکتا تھا.. واقعی ہمیں لگ پتہ گیا..

بارش ابھی ہو کر ہٹی تھی..

گیلے فٹ پاتھ پر عمارت کے صدر دروازے کے سامنے شنگھائی کے ادیب، شاعر اور صحافی ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے.. ان کی سربراہ ایک نہایت خوش مزاج ساٹھ برس سے بھی شاید تجاوز کرتی گہری دانش کی پرچھائیاں چہرے پر نقش کیے ہوئے ایک خاتون تھیں جنہیں دیکھ کر جی خوش ہو گیا.. اب ایک ساٹھ برس سے زائد کی خاتون کو دیکھ کر اگر جی خوش ہو جائے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کتنی اچھی ہوں گی.. انہوں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کروایا.. ان کے نام بتائے.. ہم سر ہلاتے مسکراتے رہے لیکن حرام ہے جو کسی ایک ادیب یا ادیبہ کا نام پلے پڑا ہو۔ اس لیے میں ان کے ناموں کا حوالہ دینے سے قاصر ہوں.. اس میڈم خوش مزاج نے ظاہر ہے اپنا نام بھی بتایا جو حسب معمول ہمارے سر سے گزر گیا.. اور بالکل یہی کیفیت چینی ادیبوں کی تھی جو ہمارے نام سن کر نہایت زور زور سے سر ہلاتے اور مسکراتے تھے.. بلکہ شاید میرے نام پر وہ کچھ زیادہ ہی مسکراتے تھے کہ ان کے خیال میں صرف چین میں ہی مشکل نام پائے جاتے تھے..

اگرچہ وزٹنگ کارڈز کے بھی مسلسل تبادلے ہوئے.. لیکن ان کے کارڈ چینی زبان میں تھے اور ہمارے انگریزی میں.. تو من چینی نمی دانم.. اور تو انگریزی نمی دانی.. عمارت کے اندر گئے..

نہ صرف لفٹیں نویں نکور اور سبک رفتار تھیں بلکہ انہیں آپریٹ کرنے والی خواتین بھی اتنی ستھری اور نئی تھیں جیسے ابھی ابھی مینوفیکچر ہوئی ہوں..

یہ لفٹیں ہمیں عمارت کی سب سے آخری منزل پر لے گئیں..

اور وہاں ہماری سٹی گم ہو گئی..

چین میں اکثر مقامات پر ہماری سٹی گم ہو جاتی تھی لیکن تلاش کرنے پر مل جاتی تھی.. یہاں نہیں ملی.. اس لیے کہ اس عمارت کے نئے نویلے ستھرے پن.. شاندار ڈیکور اور شاہانہ ماحول کا لفظوں میں احاطہ ممکن نہیں.. بلند چھتیں.. سنگ سیاہ اور سنگ مرمر کی.. فرش بھی اُسی ڈیزائن اور حُسن آمیزی کے پھیلتے.. شیشہ اور اس میں منہ دیکھنے کے قابل.. یعنی قیمتی اور خوش نظر قالینوں سے بچ جانے والے جو فرش تھے.. بلند ستون، چینی کاریگری کے شاہکار فانوس اور فرنیچر ایسا جو کسی فرانسیسی محل بلکہ ورسیلز کے محل میں بھی زیبائش دکھاتا تو حیران کرتا..

آخری منزل کے ہال کے گرد دیواروں کی بجائے شیشے کی بلند دنیائیں تھیں اور وہاں سے پورا شنگھائی اندر کو آتا محسوس ہوتا تھا.. رومن طرز کے مرتبانوں میں پھول سجے تھے جو اگرچہ مصنوعی تھے لیکن ان کی صناعی اتنی مکمل اور قدرتی تھی کہ ہاتھ لگانے سے مرجھاتے تھے۔

سچی بات ہے ہم نے صرف اپنے قومی وقار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس منظر.. اس مقام.. اس محل.. کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی برقرار رکھی.... ورنہ ہم اتنے متاثر ہوئے تھے کہ اپنے آپ کو بڑی مشکل سے چیخیں مارنے سے روکا..

میڈم خوش مزاج شیشے کی دیوار سے لگی ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے پار جو شنگھائی شہر عیاں ہو رہا تھا، اس کے مختلف حصوں اور شاہراہوں کا تعارف کروا رہی تھیں.. اور ظاہر ہے ایک پُروقار فخر کے ساتھ.. اور ہم جھینپتے ہوئے احساس کمتری کے مارے یوں اداکاری کر رہے تھے جیسے... ٹھیک ہے.. خوبصورت عمارت ہے.. لیکن جناب ہمارے ہاں تو ادیبوں کے لیے اس قسم کی عمارتیں عام ہوتی ہیں..

چینی ادیبوں میں ایک قدرے نوجوان اور قدرے خوش شکل یعنی چینی معیار سے.. خاتون شاعرہ تھیں جو مرکز تجلیات تھیں.. اور وفد کے بیشتر اراکین ان کے عنقریب ہونے کی کوشش میں ان کے برابر میں ہو ہو کر سمٹتے اور سرکتے جاتے تھے..

؎ جو بھی

ہم کہاں تک تیرے پہلو سے سرکتے جاویں

اور یہاں بھی گیسو دراز بال سمیٹتے نظریں نیچی کیے ذرا شرمندگی سے مسکراتے ان کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری رکھے..سب سے زیادہ سرکتے تھے..

اس دیوارِ شیشہ کے نیچے پھیلے ہوئے شہر شنگھائی کے درمیان وہ نیا فلائی اوور جو ہم نے ایئر پورٹ سے نکلنے پر اپنے سروں پر جاری دیکھا تھا اور حیرت سے دیکھا تھا..وہ فلائی اوور ایک چینی اژدھے کی مانند بل کھاتا پورے شنگھائی میں سے سرسراتا ہوا دھند میں گم ہوتا دکھائی دے رہا تھا..

ہم اس دیوار کے ساتھ ساتھ ایک جھجک کے ساتھ حرکت کرتے تھے کیونکہ خدشہ تھا کہ اگر ہم اپنے دھیان میں نہ رہے تو کہیں نیچے لڑھک ہی نہ جاویں کہ شیشے کی دیوار اتنی شفاف تھی کہ کبھی گمان ہوتا تھا کہ یہ وہاں ہے بھی یا نہیں..چنانچہ میڈم خوش مزاج جب کبھی ہاتھ آگے بڑھا کر شنگھائی کے کسی معروف لینڈ مارک کی نشاندہی کرتیں اور اسے دیکھنے کو کہتیں تو ہم اسے ذرا پیچھے ہو کر دیکھتے کہ کہیں سرک ہی نہ جاویں۔

شنگھائی فلائی اوور کے ایک چھوٹے سے حصے پر کچھ گہما گہمی اور حرکت کے آثار دکھائی دیتے تھے..پرچم لہرا رہے تھے..کچھ موٹر سائیکل سوار آ جا رہے تھے اور ایک مختصر سا مجمع تھا..میڈم خوش مزاج نے بتایا کہ جوں جوں فلائی اوور مکمل ہوتا جاتا ہے۔اسی حساب سے وہ حصہ ٹریفک کے لیے کھول دیا جاتا ہے اور اس کا افتتاح کر دیا جاتا ہے..غالباً آج بھی اسی نوعیت کی تقریب منعقد ہونے کو ہے..

''کیا افتتاح کے لیے چینی وزیر اعظم تشریف لا رہے ہیں..'' وفد کے ایک رکن نے پُرجوش انداز میں دریافت کیا۔

''نہیں..'' میڈم ہنسیں۔''وزیر اعظم کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ فلائی اوورز کا افتتاح کرتے پھریں۔شنگھائی کارپوریشن کا کوئی نائب میئر وغیرہ فیتہ کاٹ دے گا اور ٹریفک رواں ہو جائے گی۔''

اس جدید تاج محل کی نیرنگیوں کا کوئی شمار نہ تھا لیکن ایک اختراع ازحد انوکھی اور اتنی مختلف تھی کہ اس پر نہ صرف انسان مسکراتا تھا بلکہ اس پر پیار بھی آتا تھا..یہ وہ مختلف

کمرے تھے جو خاص طور پر ان ادیبوں اور صحافیوں کے لیے بنائے اور سجائے گئے تھے جو مسلسل کام کرتے کرتے اکتا جاتے ہیں یا لکھتے ہوئے ان کے ذہن کے آگے کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے..تخلیقی عمل رک جاتا ہے اور وہ ماحول کی تبدیلی کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ رہیے اب ایسی جگہ..تو وہ یہاں آ جاتے ہیں..چنانچہ ماحول کو یکسر بدلنے اور اسے ایک نیا رنگ دینے کے لیے جب آپ ان میں سے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو اس پر کسی وکٹورین مینشن کا گمان ہوتا ہے کہ اس کی تمام تر آرائش وکٹورین فرنیچر اور اسی عہد کی اشیاء سے کی گئی ہے..لگتا ہے کہ گرینڈ فادر کلاک، آئینے، گلدان، شمع دان وغیرہ ملکہ وکٹوریہ کے بیڈ روم سے چرا کر لائے گئے ہیں۔صرف یہ کہ یہ ذرا نئے نئے سے لگتے ہیں..آپ اس کمرے میں پہنچ کر یہ یقین ہی نہیں کر سکتے کہ اس کے باہر ملک چین بھی ہونا ممکن ہے..چنانچہ یہاں ریلیکس کیجیے..وسیع ڈائننگ ٹیبل پر موم بتیوں کی روشنی میں ڈنر وغیرہ کیجیے اور ایک مختلف ماحول میں سانس لے کر تخلیق کے لیے تازہ دم ہو جائیے۔

ایک اور کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو دیواروں پر سے نیلا سمندر امڈتا چلا آتا ہے..افق پر بادل چھائے ہوئے ہیں اور کسی جہاز کا عرشہ ہے..وہاں آرام کرسیاں پڑی ہیں..ریلنگ جس کے پار سمندر ہے اس کے ساتھ لائف جیکٹس آویزاں ہیں..یہاں جو موسیقی ہے، اس میں بھی سمندر کی گونج ہے..جہاز کے ہلکورے ہیں اور اگر آپ کو سمندری سفر کی عادت نہیں تو آپ اسی کمرے میں بیٹھے بیٹھے سی سِک بھی ہو سکتے ہیں..

ایک اور کمرے میں داخل ہوں تو امریکہ کے وائلڈ ویسٹ کی ایک بار میں داخل ہو جاتے ہیں..وہاں صرف کاؤبوائز سے ملاقات نہیں ہوتی ورنہ وہی ماحول..شراب خانے کا کاؤنٹر..ناتواں کرسیاں..کنٹری میوزک اور گھوڑوں کی کاٹھیاں اور زینیں..

میڈم خوش مزاج نے میری جانب دیکھ کر کچھ کہا اور پھر فوراً یہ احساس کر کے کہ چینی زبان میں کہا ہے، وہ خاور سے مخاطب ہو گئیں..

''یہ کہہ رہی ہیں کہ آپ ان خصوصی کمروں کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں؟'' خاور نے ترجمہ کیا۔

"میں یہ خیالات رکھتا ہوں کہ یہ تمام کمرے بیکار ہیں..کم از کم میرے لیے تو بہت مضر ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ میں تو ان میں داخل ہو کر پھر باہر آنے سے انکاری ہو جاؤں گا اور لکھنے لکھانے سے تائب ہو کر شدید عیش پرست ہو جاؤں گا..اگر وائلڈ ویسٹ بار میں سجی بوتلیں خالی نہیں ہیں تو..ویسے مجھے لکھنے کے لیے یا تو گوالمنڈی کا بے ہنگم شور درکار ہے اور یا میری سٹڈی کی خلوت..اگرچہ میں ان سہولتوں اور آرائش کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے ادیبوں کے لیے ایک شہرِ ممنوعہ تخلیق کر دیا ہے اور انہیں شہنشاہوں کا مرتبہ دے دیا ہے۔"

میڈم خوش مزاج نے میرے اس جھوٹ کی تھوڑی سی آمیزش والے کمپلی منٹ سے خوش ہو کر مجھے ایک نہایت چوڑی مقناطیسی مسکراہٹ سے نوازا۔

گیسو دراز چینی شاعرہ کے شعر چینی میں سن رہے تھے اور مسلسل اردو میں داد دیئے جا رہے تھے..

یہاں اخباروں اور متعدد رسائل کے صاف ستھرے دفتر بھی تھے..وہاں اپنے اپنے کمپیوٹرز پر جھکے رپورٹر..صحافی..وقائع نگار اپنے فرائض میں مگن ہونے کے باوجود ایک نظر ہم غیر مطلوبہ اشخاص پر ڈال کر ہمیں ایک خوش آمدید مسکراہٹ سے نوازتے تھے اور پھر سے مگن ہو جاتے تھے..

ایک دیوار تھی..

اس دیوار پر درجنوں چوکھٹے آویزاں تھے جن میں مختلف زبانوں میں لکھی ہوئی..اور موٹے سیاہ مارکر سے لکھی ہوئی مختصر تحریریں تھیں اور دستخط تھے۔"یہ وہ ادیب اور دانشور ہیں جن کی میزبانی کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے اور جو آپ کی طرح اس عمارت میں آ کر اس کی رونق بنے۔" میڈم خوش مزاج نے ہاتھ بڑھا کر کہا..

اس دیوار پر دنیا بھر کے معروف ادیبوں کے آٹوگراف آویزاں تھے..

ان میں میرے لیے غیر معروف جاپانی، ویت نامی، کوریائی، یورپی اور افریقی ادیبوں کے دستخط بھی تھے..اور کچھ امریکی مصنف بھی تھے جن کے نام شناسا لگتے تھے لیکن

ایک آٹوگراف ایسا تھا جسے دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا..

"خاور..میڈم سے پوچھو کہ کیا واقعی یہ گارسیا مارکیز کے دستخط ہیں.." ہنڈرڈ ایئرز آف سالی ٹیوڈ" کے مصنف کے..اور وہ کیسے تھے؟"

"ہاں.." میڈم خوش مزاج نے سر ہلایا۔"وہ بہت ہینڈسم اور متاثر کرنے والی شخصیت ہیں..وہ اس عمارت میں تشریف لائے تھے اور بہت دیر تک ہمارے ہاں ٹھہرے..میری خواہش ہے کہ آپ بھی ہمیں اپنے آٹوگراف سے نوازیں تا کہ ہم انہیں یہاں آویزاں کریں..کیونکہ خاور نے مجھے خاص طور پر آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔"

اس کا مطلب تھا کہ خاور کے ساتھ میری پبلک ریلشنگ رنگ لائی تھی اور اس نے میڈم خوش مزاج کو میری ادبی حیثیت کے بارے میں جانے کیا کیا سبز باغ دکھائے تھے..ہر ادیب..اگر وہ ادیب ہے تو ہمیشہ اپنی تحریروں کا موازنہ کرتا رہتا ہے..یہ جاننے کے لیے کہ میں تخلیق کی کس سیڑھی پر کھڑا ہوں..میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، اس کی کوئی حیثیت بھی ہے کہ بس دیگر متکبر قلم کاروں کی مانند جھک مار رہا ہوں..وہ ادیب جب..بلکہ یہ کہہ لیجیے کہ میں جب کلاسکس کو پڑھتا ہوں تو پورا یقین ہو جاتا ہے کہ جھک ہی مار رہا ہوں..پھر اپنے ہم عصر لکھنے والوں کی تخلیقات..وہ کسی بھی زبان میں ہوں..ان کی قربت میں جانے کی کوشش کرتا ہوں، یہ جاننے کے لیے کہ کیا میری تحریر میں بھی کوئی اس قسم کا طلسم..ایسی اثر انگیزی ہے کہ نہیں..میں نے کئی ایسے نوبل انعام یافتہ ادیبوں کو بھی پڑھا ہے جن سے کہیں بہتر ہمارے عہد ہماری زبان کی تحریریں ہیں..صرف ہم ایک معمولی زبان میں لکھنے والے کی حیثیت سے مار کھا جاتے ہیں..بے شک ہم اردو کی بڑائی کے بارے میں نعرے لگا لگا کر اپنے گلے بٹھا لیں کہ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے..لیکن یہ صرف خوش فہمی کی دھوم ہے..اردو دنیا کی بڑی اور اہم زبانوں میں شمار نہیں ہوتی..ہم نے تو جنم ہی فارسی، عربی، ترکی اور ہندی بھاشا وغیرہ سے لیا ہے تو کم از کم یہ زبان ان کے ہم پلہ تو نہیں ہو سکتی. تو ایک سزا تو ہر اس ادیب کو ملتی ہے جو ایک مائنر زبان میں لکھتا ہے..اور وہ ہے گمنامی کی سزا..ورنہ منٹو، بیدی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر دنیا کے نقشے پر کہیں تو ہوتے..بے شک

نجیب محفوظ، امین مالوف، یاشر کمال یا ایم جے، کوئٹزی کے ناولوں میں کچھ حصے ایسے آتے ہیں کہ آپ کو تھوڑا سا اطمینان ہوتا ہے کہ شاید ہم اتنا برا بھی نہیں لکھتے لیکن جو ناول نگار مجھے مکمل طور پر بے حوصلہ کر دیتا ہے وہ گارسیا مارکیز ہے..اس شخص کی تحریر اور بُنت میں وہ معجزہ ہے کہ اس کے ناول کے بعد کوئی اور ناول پڑھا نہیں جاتا..یہاں تک کہ کلاسیک بھی ماند پڑتے نظر آتے ہیں۔ مجھے اپنی ادبی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز اس لمحے ملا جب بی بی سی لنڈن پر ایک ریویو کے دوران ایک تبصرہ نگار نے میرے ناول ''بہاؤ'' کے بارے میں کہا کہ یہ گارسیا مارکیز کے ناولوں سے کسی طور کمتر نہیں..یقیناً تبصرہ نگار نے گارسیا کو پڑھا ہی نہ تھا ورنہ وہ اتنی سویپنگ سٹیٹ منٹ نہ دیتا..

تو اسی گارسیا مارکیز..جسے میں پسند کرتا ہوں..استاد مانتا ہوں، اسی گارسیا کے آٹوگراف میرے سامنے چوکھٹے میں جڑے تھے اور میڈم خوش مزاج مجھے پیشکش کر رہی تھیں کہ میرے ہاتھ کی تحریر بھی اس کے برابر میں آویزاں کی جا سکتی ہے..

میڈم خوش مزاج کے ایک بالکے نے ان کی ہدایت پر میرے سامنے ایک سفید کاغذ رکھا اور ایک موٹا مارکر تھما دیا..مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس پر کیا لکھ کر دستخط کر دیئے..عین اسی لمحے دیگر اراکین پُر از تشویش ہوئے کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے اور پھر انہوں نے بھی اپنی آگسٹ موجودگی ثابت کرنے کے لیے اس کاغذ پر آٹوگراف ثبت کرنے شروع کر دیئے..مجھے معلوم نہیں کہ شنگھائی رائٹرز کے اس محل میں گارسیا مارکیز کے برابر میں ہم سب کے آٹوگراف آویزاں کیے گئے یا نہیں..اگر کوئی جانبِ شنگھائی جاوے اور اس عمارت کی سب سے آخری منزل پر جاوے اور ان چوکھٹوں پر نظر ڈال کر آوے تو ہمیں بتلا دے..

''قزہانگ کاؤنٹی میں لنچ کے لیے روسٹ گدھا''

آج کے پروگرام سے کوئی بھی خوش نہ تھا..

شیڈول پر لکھا تھا ''وزٹ قزہانگ کاؤنٹی''

ہمارے میزبان ہمیں تازہ ہوا خوری کے لیے شنگھائی سے باہر ایک چینی گاؤں میں لے جا رہے تھے..ہم چونکہ خود ایک گاؤں سے آئے تھے، اس لیے ہم خوش نہ تھے کہ ایک اور گاؤں کا ہم نے کیا کرنا ہے۔ جوہڑوں، اُپلوں، بھینسوں اور کچے کوٹھوں کا کیا کرنا ہے..

البتہ دہقانی کہانی کار پُرمسرت تھا۔ ''یارو..یہ تو موج ہو گئی..ہم ایک روایتی چینی گاؤں دیکھیں گے جس میں چینی کسان تہمد باندھے بانس کے تیلوں کے ہیٹ پہنے دھان کے کھیتوں میں پستہ قد اور مڑے ہوئے سینگوں والی بھینسوں کے ہل چلا رہے ہوں گے اور انہیں چینی زبان میں ''اوئے مر جائیں۔ تینوں وباپئے'' کہتے ''ہوہو'' کر رہے ہوں گے بلکہ چینی زبان میں تو ''چوچو'' کر رہے ہوں گے...جوہڑوں میں بطخیں ہوں گی، کوڑے کے ڈھیروں پر مرغیاں ہوں گی۔ ڈھلوان چھتوں والے جھونپڑے ہوں گے..یہ تو موج ہو گئی۔''

''یہ پینڈو ہے ناں..اسے پنڈ ہی پسند ہے..'' حسرت ناک نے ناک چڑھائی حالانکہ اس ناک کا شہر کے بارے میں بھی علم واجبی سا تھا کیونکہ اس نے ساری عمر ٹی ہاؤس کی ایک میز پر ہی گزار دی تھی اور وہ ہم سب کی طرح دل ہی دل میں دہقانی کہانی کار کی

تخلیقی کاوشوں سے حسد کرتا تھا..

ہماری کوچ سفر کرتے کرتے ہانپنے لگی مگر شنگھائی ختم ہی نہ ہوتا تھا..ایک شنگھائی سے نکلتے تو دوسرا شروع ہو جاتا..

تقریباً ایک گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد ہمیں نوید ملی..کہ ہم شنگھائی سے باہر آ گئے ہیں..یہ باہر بھی دراصل ایک اور شنگھائی تھا..چوڑی شاہراہ کے آس پاس نفیس عمارتوں، فیکٹریوں، گوداموں اور کارخانوں کے سلسلے تھے اور ان کی زنجیر بھی ختم نہ ہوتی تھی..

بالآخر ہم شاہراہ کو ترک کر کے دائیں ہاتھ پر ایک کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے جہاں ایک جدید عمارت کے داخلے پر ایک مختصر سکرٹ اور اونچی ایڑھی والی..ماہی منڈا ہیئر سٹائل والی ایک چلبلی سی میڈم ہماری منتظر تھی..اس نے ہمیں ملاقاتیوں کے ہال میں بٹھایا..چائے پلائی اور اپنے گاؤں کے بارے میں اس کی زرعی پیداوار کے بارے میں ایک لیکچر پلایا جس کے دوران بیشتر اراکین اونگھتے رہے..لیکن یہاں ہماری معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا کہ اب چین میں اجتماعی فارمنگ کا سسٹم تقریباً اختتام پذیر ہو چکا ہے اور اب چینی خاندان حکومت سے زمین ٹھیکے پر حاصل کر کے اپنی مرضی اور مارکیٹ میں کھپت کو مدنظر رکھتے ہوئے سبزیاں اور پھل وغیرہ اگاتے ہیں اور پھر انہیں کھلی مارکیٹ میں فروخت کر کے خوب منافع کماتے ہیں اور موج کرتے ہیں..

اس فارم میں شامل ایک وسیع فیکٹری کو بھی ہم نے بادل نخواستہ دیکھا اور اس میں کام کرنے والوں نے ہم سے کہیں بڑھ کر ہمیں بادل نخواستہ دیکھا..

فیکٹری میں..یہ مختصر سکرٹ والی..ماہی منڈا میڈم ہمارے آگے آگے ہائی ہیل سے ٹپ ٹپ کرتی تیزی سے چلتی جاتی تھی اور ہر لحہ یہی خدشہ رہتا تھا کہ کہیں وہ دھڑام سے گر ہی نہ جائیں اور ان کے گرنے سے ان کا منی سکرٹ جو مزید منی نہیں ہو سکتا تھا، کہیں کچھ چینی مقامات آہ و فغاں کو ظاہر ہی نہ کر دے..

ماہی منڈا میڈم ٹپ ٹپ کرتی ہمیں چند کھیتوں اور گرین ہاؤسز میں بھی لے گئی جہاں پودے تھے..شجر تھے..پھلوں کے درخت تھے..جو مصنوعی آب و ہوا میں اگائے جا رہے تھے..

''ہم گاؤں کب جائیں گے؟'' میں نے میڈم سے پوچھا..

''یہی گاؤں ہے..''

''کہاں ہے؟'' دہقانی نے دوہائی دی..

اتنی دیر میں میڈم ٹپ ٹپ آگے جا چکی تھی..

ہماری کوچ ایک اتنی چوڑی اور طویل شاہراہ پر گامزن تھی کہ اس پر آسانی سے ایک ہوائی جہاز لینڈ کر سکتا تھا..دونوں جانب ہریاول اور سجاوٹ تھی..ایک نہر تھی جو لاہور کی نہر کی نسبت کہیں ستھری اور شفاف پانیوں والی تھی..لیکن ایسی نہر کس کام کی جس میں تربوزوں کے چھلکے اور پلاسٹک کے لفافے نہ تیرتے ہوں..ننگ دھڑنگ بچے نہ تیرتے ہوں..اس علاقے پر کسی سیرگاہ کا گمان ہوتا تھا..نہر کنارے دور تک فلیٹوں کی کئی منزلہ عمارتیں چلی گئی تھیں..

''گاؤں کب آئے گا؟'' دہقانی پھر بے چین ہو گیا..

''گاؤں؟'' حسرت ناک بیدار ہو گیا اور اپنی نشست پر سر ہلاتا خود کلامی میں مصروف ہو گیا۔'' گا میرے منوا گاتا جارے..دور ہے سکھ کا گاؤں..گاؤں آئے گا..کیوں نہیں آئے گا..چینی کہتے ہیں تو آئے گا..لاہور کا اگر کالا شاہ کاکو ہے تو شنگھائی کا بھی تو کوئی کالا شاہ کاکو نہ سہی مرید کے تو ہو گا..آئے گا..آنے والا..''

ہم مزید چائے کے لیے ایک اور ستھری عمارت کے قریب جا رکے اور اندر چلے گئے..یہ دہقانوں اور کسانوں کی ایک کنٹری کلب تھی جس میں ایک لائبریری' ایک ریستوران اور بلیئرڈ روم تھا اور ڈھیر سارے کمرے تھے..ایک جمنزیم بھی تھا..ریستوران کے سامنے جو ایک صحن تھا، جہاں ہم نے چائے نوشی کی، وہاں ایک قدیم سینکڑوں جڑوں والے سوکھے ہوئے شجر کو ذرا سا تراش کر ایک مور کا روپ دیا گیا تھا..

یہ عجیب سا مور تھا جو اس کنٹری کلب میں ناچ رہا تھا..اور اسے ہم دیکھتے تھے اور اس کے ساتھ فرینڈلی ہو کر تصویریں اترواتے تھے..یہاں ہمیں کچھ کسان وغیرہ دکھائی دیئے جو سگار کے کش لگاتے جینیں پہنے اِدھر اُدھر مٹرگشت کر رہے تھے..غالباً مٹرگشت ان کی پسندیدہ فصل تھی..

''گاؤں کہاں ہے؟'' سفید ریش کا پیمانہ رُیش لبریز ہو گیا..

''ابھی اُدھر جاتے ہیں..'' خاور نے تسلی دی۔

ہم اس کنٹری کلب سے رخصت ہو کر ایک سیرگاہ میں سے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک رہائشی علاقے میں پہنچے جہاں سہ منزلہ فلیٹوں کی عمارتیں کثرت سے تھیں..

''اور اب ہم چینی کسانوں کو دیکھیں گے۔'' میڈم ماہی منڈا نے کوچ سے اترتے ہوئے کہا..

ایک فلیٹ کے مختصر صحن میں رسی پر کپڑے سوکھ رہے تھے جن پر ایک نظر ڈالنے سے کوئی بے وقوف بھی یہ جان سکتا تھا کہ فلیٹ میں خواتین بھی قیام پذیر ہیں.. پورچ میں ایک پرانا سکوٹر کھڑا تھا اور اندر ایک چھوٹے سے ڈائننگ ایریا میں ایک کسان کنبہ میز کے گرد بیٹھا دوپہر کے کھانے کے لیے دانت تیز کر رہا تھا..

میز پر خوراک کی جتنی ورائٹی تھی اسے دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ میڈم ماہی منڈا نے ہماری آمد کی خاطر انہیں کچھ خصوصی بندوبست کرنے کے لیے کہہ دیا گیا ہوگا.. اتنی زیادہ ڈشیں کھانے کے بعد کوئی بھی کسان کم از کم ہل چلانے جوگا تو نہیں رہ سکتا..

ایک کونے میں کسان کنبے کی دادی یا نانی نہایت اعلیٰ سفید شرٹ اور پاجامے میں.. نئے جوگرز پہنے لرزتے ہاتھوں میں چاپ سٹکس بمشکل تھامے نوڈلز کو پکڑنے کی جستجو میں تھیں.. اور یہ بھی خصوصی بندوبست لگتا تھا..

ہم نے کنبے کو ''بوں اپی ٹائٹ'' کی خواہش کی.. خاص طور پر دادی جان وغیرہ کی چند تصویریں اتاریں اور باہر آ گئے..

''کسان کہاں ہیں؟ کھیت اور کنویں کہاں ہیں.. چین کی دیہاتی زندگی کی تصویر کہاں ہے؟'' تقریباً سب نے واویلا کرنا شروع کر دیا..

''بس یہی ہے..'' لیو یکدم ہمارے مترجم اور میزبان کی حیثیت بھول کر آرمی میجر ہو گیا اور ڈانٹ کر بولا ''چین میں اب اسی قسم کے گاؤں ہوتے ہیں۔''

''یہ ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں..'' کسی نے سرگوشی کی...

''صاحبو کیا ہم نہیں جانتے کہ ایک گاؤں کیا ہوتا ہے..'' کائیاں گیسو دراز مسکرایا۔ ''یہ لامحالہ ہمیں متاثر کرنے کے لیے خصوصی بندوبست ہے۔ پر ہم کہاں متاثر ہونے والے ہیں۔''

سب سے آزردہ دہقانی تھا.. کچھ کہتا نہ تھا، صرف رنجیدہ نظروں سے میزبانوں کو دیکھتا تھا..

''اور اب ہم قزہانگ کاؤنٹی کے خصوصی ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔''

یہ ریستوران تو نہیں تھا۔ چینی تہذیب کی قدامت اور حسن جمال کا ایک نمونہ تھا.. چوکور عمارت کے درمیان میں ایک کائی زدہ.. جس پر بید مجنوں کی شاخیں جھکی اور ڈوبتی تھیں.. ایک تالاب تھا اور اس کے اندر سرخ مچھلیوں کے پرے تیرتے پھرتے تھے.. اس کے درمیان میں ایک پویلین تھی، سرخ ستونوں کے سہارے لیے ہوئے.. پسلیوں والی سرخ چھتوں پر قائم اور اس تک ایک کبڑا پل جاتا تھا.. کناروں پر مختصر شجر اور زیبائشی جھاڑیاں تھیں.. ایک مختصر سا قدیم چینی خواب تھا..

اور یہی وہی مقام تھا جہاں حسرت ناک نے گدھا کھایا..

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں نے بیجنگ میں خاور سے ایک عاجزانہ گزارش کی تھی کہ برخوردار خوراک کے معاملے میں مَیں بہت زیادہ احتیاط پسند اگرچہ نہیں ہوں.. یعنی اپنی مختصر زندگی میں جانے کیا کیا کھایا ہے لیکن میں حتی الوسع مینڈکوں.. چھپکلیوں، بندروں اور کیڑے مکوڑوں سے پرہیز کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے آئندہ کسی بھی طعام کے دوران اگر ان میں سے کوئی شے نہایت لذیذ حالت میں سامنے آ جائے اور میں اسے پہچان نہ پاؤں تو براہ کرم ذرا میرا ہاتھ روک دینا.. کہہ دینا کہ تارڑ صاحب یہ آپ کے لیے نہیں ہے.. تو میں نے قزہانگ کاؤنٹی کے اس ریستوران کے اندر ایک وسیع میز پر مسلسل رکھی جانے والی درجنوں ڈشوں میں سے ایک نہایت خستہ صورت آف وہائٹ گوشت کے قتلوں کی طرف رغبت بھرا ہاتھ بڑھایا اور انہیں اپنی پلیٹ میں منتقل کرنے کو تھا کہ خاور نے سرگوشی کی۔ ''تارڑ صاحب.. یہ آپ کے لیے نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے؟..'' میں تھوڑا سا بدمزاج ہو گیا کیونکہ میں نے خاور سے جو

عاجزانہ گزارش کی تھی، اسے فراموش کر چکا تھا۔ ''اتنا خوبصورت، خستہ صورت گوشت ہے.. ہنٹر بیف کی طرح..''

''نہ کھائیں..'' اس نے آس پاس دیکھ کر پھر آہستہ سے درخواست گزاری۔

''کیوں نہ کھائیں؟''

''اس لیے.. کہ یہ گدّا ہے۔''

''گدّا؟... یعنی جو چارپائی پر بچھایا جاتا ہے..''

''نہیں.. گدّا... جسے انگریزی میں ڈنکی کہتے ہیں۔''

''ڈا.. ڈا.. ڈنکی..؟'' میں نے ہکلا کر کہا..

''جی ہاں..''

''لیکن خاور..'' میں نے ہاتھ روک لیا تھا۔ ''ہمارے وفد میں وہ رکن جو حسرت ناک ہے.. وہ تو نہایت رغبت سے اسے کھا رہا ہے.. بلکہ بار بار اپنی مدد آپ کر رہا ہے۔''

''پھر بھی گدّا ہے تارڑ صاحب..'' خاور ذرا ناراض ہوگیا..

''او کے.. لیکن.. خاور تم نے اسے کیوں نہیں روکا؟''

''اس نے مجھے نہیں کہا تھا کہ میں گدّا نہیں کھاتا.. اور یوں بھی وہ بے حد انجائے کر رہا تھا تو میں نے روکنا مناسب نہ سمجھا..''

وہ آف وہائٹ رنگ کا خستہ گوشت نہایت پُرکشش اور پُرذائقہ لگتا تھا اور مجھے شدید افسوس ہوا کہ میں انجانے میں اسے کیوں نہ کھا گیا.. ملا نصیر الدین اور پیغمبروں کی پسندیدہ سواری کے ذائقے سے کیوں محروم رہ گیا..

یہ خاور بھی کیا گدّا تھا..

اگر وہ مجھے نہ روکتا تو میں گدھا خوری کا شرف حاصل کر لیتا..

لیکن یہ رتبۂ بلند حسرت ناک کو ہی ملنا تھا.. سو مل گیا..

اور میں صرف خاور کی وارننگ کی وجہ سے اس رتبۂ بلند تک نہ پہنچ سکا..

خاور بھی کیا گدّا تھا...

''جن ماؤ ٹاور شامِ شنگھائی یا شامِ تنہائی''

دریا پار عام طور پر رانجھن کا ڈیرہ ہوتا ہے لیکن شنگھائی کے جانگ جیانگ دریا کے پار جن ماؤ ٹاور تھا جو ساحلی سیرگاہ بُنڈ سے ٹیلی ویژن ٹاور کے غباروں اور دیگر عمارتوں میں سے ایک چوکور مصری یادگار کی طرح نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا..

یہ شنگھائی کا ایک اور نواں نکور معجزہ ہے... ان کا ورلڈ ٹاور ہے..

وہ اہل شنگھائی کا رانجھن ہی ہے جو دریا کے پار بلند ہوتا ہے اور اسی لیے دو چار فقروں کے تبادلے کے بعد پوچھا جاتا ہے۔ ''آپ نے جن ماؤ ٹاور دیکھا ہے.. اس کی اٹھاسی منزلیں ہیں اور چین کی سب سے بلند عمارت ہے۔''

جب ہم بُنڈ پر مٹرگشت کر رہے تھے تو شنگھائی کے میزبان بار بار دریا کے پار اشارہ کرتے تھے.. ہم کسی روز جن ماؤ ٹاور پر بھی جائیں گے.. اور آج وہی روز تھا اور ہم دریائے جانگ جیانگ کے نیچے تعمیر کردہ روشن گزرگاہ کے راستے پار جا رہے تھے.. بلکہ سُرنگ میں ڈبکی لگا کر دریا کے نیچے سے ہوتے ہوئے پار اترنا نہیں ابھرنا تھا.. اور ہم ابھرے تو سامنے جن ماؤ ٹاور تھا..

ٹاور شاید ابھی چند روز پیشتر ہی مکمل ہوا تھا.. اس کے نئے پن کے آثار ایسے تھے جیسے ابھی ابھی راج مستری اپنے دابڑے اور تیسیاں اٹھا کر اِدھر سے نکلے ہیں اور آرکیٹیکٹ کے نقشہ سمیٹ کر جانے کی سرسراہٹ ابھی تک فضا میں موجود ہے.. نئی چیزوں کی مہک الگ

ہوتی ہے..نیا سیمنٹ، نئے شیشے، نیا رنگ و روغن..ان سب کی مہک میں جو کنوار پن ہوتا ہے، وہ جن ماؤ ٹاور میں تھا..

اس کے گراؤنڈ فلور ابھی خالی تھے اور گونجتے تھے..اور گونج ان چینی سیاحوں کی سرگوشیوں اور چیخوں کی بھی تھی جو اسے دیکھ کر حیرت اور جذبۂ تفاخر کے احساس پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے تھے..

اٹھاسویں منزل تک سیڑھیاں بھی جاتی تھیں..مجھے یقین ہے کہ ان پر جانے سے جان بھی جاتی ہوگی..میزبانوں نے لفٹ کا ٹکٹ خرید کر ہم پر کرم کیا..

لفٹ کے باہر لفٹ والی بھی ایسی پُرکشش پٹاخہ تھی کہ اہلِ ایمان خواہش کرتے تھے کہ وہ لفٹ کرا دے..ہم اس لفٹ میں ٹھنس گئے اور لفٹ والی بھی ہمارے درمیان ٹھنس گئی۔ چنانچہ متعدد اراکین کو بے حد راحت ہوئی. لفٹ والی نے یہ اذیت بڑی خوش اخلاقی سے سہی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر بورڈ پر چمکتے بٹنوں میں ایک کو دبا دیا. دروازہ بند ہوا اور پھر اسی لمحے کھل گیا..اعلان ہوا کہ اب باہر بھی نکلیں، ہم اٹھاسویں منزل پر پہنچ گئے ہیں..یہ لفٹ ایک بُلٹ ٹرین کی طرح چلتی تھی۔ ایک خلائی راکٹ کی طرح اٹھی تھی لیکن بالکل چپ اور بے آواز اٹھاسویں منزل پر پہنچ گئی تھی..ہمیں اس کی برق رفتاری پسند نہ آئی..جیسے امانت علی خان کو لاہور کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی برق رفتاری پسند نہ آئی تھی..

خان صاحب ایک شب..اور گئی شب بلکہ بہت ہی گئی شب حالتِ خمار میں لکشمی چوک میں کھڑے تھے..ایک ٹیکسی کو روکا۔ اس میں براجمان ہوئے اور ڈرائیور سے کہنے لگے۔ ''یار لکشمی چوک چلو۔''

ڈرائیور ان کی حالت بے خودی سے آگاہ ہوا اور اس نے چابی گھما کر ٹیکسی کو سٹارٹ کیا اور پھر فوراً بند کر کے کہنے لگا۔ ''خاں صاحب لکشمی چوک آ گیا ہے۔''

خاں صاحب لرزتے ہوئے باہر نکلے اور کہنے لگے ''یار اتنی تیز نہ چلایا کرو۔''

تو ہمیں بھی اٹھاسویں منزل پر یوں پلک جھپکتے ہی پہنچ جانے پر تسلی نہ ہوئی اور ہم بھی لفٹ والی سے یہی کہنا چاہتے تھے کہ ''یار اتنی تیز نہ چلایا کرو۔''

جن ماؤ ٹاور سے شنگھائی کی رات کا منظر ششدر کرنے والا تھا۔ ہم آسمان پر تھے اور نیچے زمین پر بہت دور نیچے زمین پر اس شہر کے روشن حسن کی ایک کائنات ستاروں کی صورت بچھی ہوئی تھی. لیکن اس سے زیادہ تحیر کی حدوں سے آگے جانے والا منظر ٹاور کے اندرون کا تھا. عمارت کے درمیان میں پہلی منزل سے شروع ہو کر اٹھاسویں منزل تک ایک گولائی ایک خلا تھا..آپ ذرا جھانکئے اور اپنے کسی ساتھی کو مضبوطی سے پکڑ کر نیچے جھانکئے تو ٹاور کی پوری اٹھاسی منزلیں سنہری رنگت کے ایک بگولے کی صورت میں اٹھتی دکھائی دیتی تھیں اور انسان اس بگولے کی زد میں آ کر چکرا سا جاتا تھا....لوگ ٹاور کے سووینئر خرید رہے تھے..تصویریں اتروا رہے تھے اور نیچے پھیلے شنگھائی میں اپنے اپنے گھر تلاش کر رہے تھے..

نیچے بکھرے ستاروں میں سے کوئی میرا گھر نہیں تھا..

شنگھائی بہت شاندار، پُرشکوہ اور نواں نکور اور صاف ستھرا اور بہت ہی جدید سانچے میں ڈھلا شہر تھا لیکن اس نے ابھی تک میرے دل کو نہیں چھوا تھا..میرے دل کی چھوئی موئی اس انتظار میں تھی کہ شی آن ایسا کوئی ہاتھ آئے، اسے چھوئے اور وہ سمٹ جائے..نئی اور شاہانہ عمارتیں دیکھ دیکھ کر میرا من اوبھ چکا تھا اور مجھے ان ہزاروں نیون لائٹس اور جگمگاتی روشنیوں کی چکا چوند کی بجائے شی آن ایسا مٹی کا ایک دیا چاہیے تھا....نہ نیچے بکھرے ستاروں میں سے کوئی ایک میرا گھر تھا..

دل کی چھوئی موئی ان چھوئی تھی..

مٹی کا ایک دیا بھی نہ تھا..

کوچ ہوٹل واپس جا رہی تھی. شنگھائی کے کوچہ و بازار میں بہت رونقیں تھیں..

زندگی اپنے ہونے کا پُرشور اظہار کرتی تھی..

''لیو..آپ مجھے یہیں اتار دیں..میں ذرا گھومنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں نہیں..'' لیو خبردار ہو گیا۔ ''آپ گم ہو جائیں گے۔''

''یار میں گم نہیں ہوں گا..پلیز!''

''ہو جائیں گے..شنگھائی چین کے بقیہ شہروں سے ذرا مختلف ہے..یہاں جیب کترے ہیں..راہزن ہیں..اور طوائفیں ہیں۔''

''میں انہی سے تو ملنا چاہتا ہوں..''

''جوک..بگ جوک..'' لیو ہنسنے لگا اور پھر فوراً چپ ہو گیا..

''پھر لیو..مجھے جانے دو یار..''

''آپ کو واپسی پر ہوٹل کا راستہ نہیں ملے گا..''

''کچھ تو خدا کا خوف کر لیو..پورے شنگھائی سے..اس کے کونے کونے سے یہ تمہارا ہوٹل ایکوٹوریل نظر آتا ہے تو راستہ کیسے نہیں ملے گا..''

''اچھا میں مشورہ کرتا ہوں..''

لیو نے پہلے وانگ لی سے مشورہ کیا، پھر خاور سے کچھ پوچھا اور کچھ دیر اپنے آپ سے مشورہ کیا اور اتنی دیر میں وہ علاقے جن میں میں اترنا چاہتا تھا، گزر گئے اور ان کی جگہ ایک سنسان سی جگہ آ گئی..

''ابھی ہم نے ڈنر کرنا ہے..ڈنر کے بعد آپ سیر کر سکتے ہیں۔''

''لیو تم کتنے سویٹ ہو..'' سویٹ کو میں نے جتنی میرے اندر زہرناکی تھی، اس سے بھر دیا۔

ڈنر کے بعد میں ہوٹل سے نکل کر یونہی آوارہ ہوا تو آس پاس کے علاقے گہما گہمی سے خالی تھے..بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں اور فٹ پاتھ ویران تھے..البتہ حجاموں کی دکانیں کھلی تھیں جن کے اندر نہایت دیدہ زیب حجامنیاں گاہکوں کی حجامت بنا رہی تھیں..جی میں تو یہی آئی کہ ان نازنینوں کے سامنے سر جھکا دوں کہ جو مزاجِ یار میں آئے لیکن ایک تو میرے چھدرے ہوتے سفید بالوں کو دنیا کی ماہر ترین نائن بھی اب پُرکشش نہیں بنا سکتی تھی اور پھر اس گیسو تراشی اور چمپی مالش پر اخراجات بھی بہت اٹھتے تھے..میں نے معلومات حاصل کر لی تھیں..

یقیناً ہوٹل کے اس آس پاس سے دور جہاں سے ہماری کوچ گزری تھی وہاں رات ابھی جوان تھی لیکن نہ تو مجھے اس علاقے کا علم تھا اور نہ میں ان گلی کوچوں کے نام جانتا تھا جہاں شنگھائی جاگ رہا تھا اور گلاب کے پھول کھل رہے تھے..اس لیے میں ایک مختصر سی واک کے بعد کمرے میں واپس آ گیا..

تتلی میرے بستر کی چادر پر اپنے جوڑ سے خراٹے لے رہی تھی..

ایک تتلی کے خراٹے اتنے بلند نہیں ہوتے کہ آپ انہیں سن سکیں..صرف ان کا گمان گزرتا ہے..میں نے نہایت آہستگی سے چادر اٹھا کر بستر میں رینگنے کی کوشش کی تاکہ وہ ڈسٹرب نہ ہو لیکن اس کے پَر کھل گئے..

''تمہیں شنگھائی پسند نہیں آیا..''

''شنگھائی میوزیم اور میڈم خوش مزاج والی ادیبوں کی عمارت مجھے بے حد پسند آئے..''

''لیکن شنگھائی پسند نہیں آیا..اس نے تمہارے دل کی چھوئی موئی کو نہیں چھوا۔تمہارے لیے مٹی کا ایک دیا نہیں جلایا..''

''یہ تم کیسے جان گئیں..''

''بھول جاتے ہو کہ میں تم ہوں..''

''ہاں..یہ صرف شنگھائی نہیں ہے..مجھے نئی عمارتیں، اٹھاسی منزلہ ٹاور، شاہراہیں اور زندگی کے جدید ترین مظاہر کبھی بھی متاثر نہیں کرتے۔اگرچہ میں ان سے بے حد لطف اندوز ہوتا ہوں۔ان کی راحت اور سہولت میرے رگ و پے میں ایک عجیب تکبر اور آسودگی بھر دیتی ہے..لیکن نہیں...میرے اندر ایک شیشم کا شجر ہے..سرسوں کا ایک پھول ہے..مکی کی ایک روٹی اور مٹی کا ایک دیا ہے جو بجھتا ہی نہیں....اگرچہ یہ سب مجھے مل بھی جائیں تو بھی میں ناخوش رہوں گا..جدید سہولتوں کی خواہش کروں گا..تم کہہ سکتی ہو کہ میں منافق ہوں..لیکن یقین کرو میرے اندر بس یہی کچھ ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے..''

''سنو...ہر شہر..شی آن نہیں ہوتا۔''

''صحیح..''

''لیکن ہر شہر..شنگھائی بھی نہیں ہوتا..''

''جیسے ہر شہر لاہور نہیں ہوتا..''

''صحیح..''

''لیکن..ہر شہر کراچی بھی نہیں ہوتا..سویٹ ڈریمز!''

''قدیم شنگھائی کے یو بولانگ ریستوران میں ہم نے ریشم کے کیڑے نوش کیے''

آج ہم موج میں تھے..
اس لیے کہ ہم سب کی موج ہوگئی تھی..

اس لیے کہ ہمارے شیڈول میں درج تھا کہ..آپ یُو گارڈن کا ٹور کریں گے..ایک مشہور عالم ریستوران میں لنچ کریں گے اور پھر پوری دوپہر شاپنگ کریں گے..

ہمیں بھلا اس یُو گارڈن سے کیا لینا دینا تھا..مشہور عالم ریستوران میں بھی ہمیں پراٹھے اور بھنا ہوا مغز تو نہیں ملنا تھا، چینی کھانے ہی ملنے تھے..تو ہم جس شق پر موج میں آگئے تھے وہ یہی تھی کہ پوری دوپہر شاپنگ کریں گے..

ہم شاپنگ کے لیے ترس گئے تھے..ندیدے ہوگئے تھے..

ہم ان لمبی لمبی فہرستوں کا کیا کرتے جو ہماری جیبوں میں پڑی پڑی بوسیدہ ہو رہی تھیں اور جن پر ہماری بیویوں اور آل اولادوں نے چین میں ملنے والی اور نہ ملنے والی اشیاء کی بھی تفاصیل اہتمام سے درج کی تھیں..ان میں جہاں دو گھوڑا بوسکی..جیڈ کے مجسّمے، جاگرز، چینی موتی، ریشم کی چادریں اور سکارف.. یہاں تک کہ چینی فرنیچر بھی شامل تھا' وہاں صرف ایک لفظ ''شنگھائی'' کا بھی لکھا تھا..اور یہ شنگھائی مذکر نہیں بلکہ مونث تھا..ایک مدت

سے ہمارے ہاں جتنی بھی رضائیاں بنتی تھیں' ان کے لبادے یا او چھاڑ یا کو رصرف چینی سلک سے بنے ہوئے بڑے بڑے پھولوں والے بھڑ کیلے کپڑے سے بنتے تھے..اور اسے شنگھائی کہتے تھے..ایک مہمان ایک مدت تک تذکرہ کرتا تھا اور توصیف کرتا تھا کہ جناب میر نلاں چودھری صاحب کے ہاں رات ٹھہرا تو انہوں نے مجھے شنگھائی کی رضائی اوڑھنے کے لیے دی..جہیز دیتے ہوئے بھی شنگھائی کی رضائیوں کو اولیت دی جاتی تھی..اس لیے میری اولڈ فیشنڈ بیگم نے فہرست میں ''شنگھائی'' کا اضافہ کیا تھا۔اگرچہ اس لمحے وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی اکلوتی بیٹی فلوریڈا میں بیاہی جائے گی اور اس کے لیے اس نے جو درجنوں شنگھائی کی رضائیاں تیار کر رکھی ہیں، وہ اس کے کسی کام نہ آئیں گی..اور وہ لاہور میں ایک جستی پیٹی میں پڑی پڑی بوسیدہ ہو جائیں گی..

میں نے ہوٹل کے برابر میں ایک سپر سٹور کے شوکیس میں آویزاں ایک چیک کوٹ تاک رکھا تھا جو میں اپنی بیٹی کے لیے خریدنا چاہتا تھا..

دہقانی کے پاس بھی ایک لمبی فہرست تھی جو بیوی نے کم اور اس کے بہوؤں، خالاؤں، پھپھیوں اور ہمسائیوں نے زیادہ بنا کر دی تھی..اور وہ جان پر کھیل کر بھی اس شاپنگ لسٹ سے سرخرو ہونا چاہتا تھا..

صرف سفید ریش شاعر ہمیں بار بار خبردار کرتا تھا..کہ بھائی جی چین میں بہترین شاپنگ بیجنگ میں ہے..ہم نے وہیں واپس جانا ہے..آپ اپنے اپنے یوآن سنبھال کر رکھیں ورنہ کہے دیتا ہوں کہ پچھتائیں گے..

البتہ گیسو دراز کو شاپنگ کی کوئی ایمرجنسی نہ تھی..اس نے اپنے ڈالر..جو ہمیں زادِراہ کے طور پر تفویض کیے گئے' سینت سینت کر رکھے تھے...اور ان میں سے ایک ڈالر کو بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کیا تھا..پیٹ پر پتھر باندھ لیا تھا لیکن اپنے ڈالروں کو ہوا بھی نہیں لگوائی تھی۔''میاں ہم کاٹھ کباڑ خریدنے والوں میں سے نہیں ہیں..اہل دانش ہیں..اس لیے اس رقم سے صرف کتابیں خریدیں گے..یہ رقم ہم نے صرف علم کے لیے وقف کر رکھی ہے..اسی لیے ڈالر بھنائے نہیں..قیام اور طعام چینیوں کے ذمے ہے، باقی رہ گیا

جاتا ہے..اس لیے ڈالر بھنائے نہیں..اہلِ دانش ہیں۔"

بہرحال،ہم موج میں تھے کہ آج جی بھر کے ڈالر لٹائیں گے اور شاپنگ کریں گے..

"لیو..پیارے بھائی..ہم شی آن میں کیسے کیسے باغ دیکھ چکے..اب یہ ایک اور باغ..یُوگارڈن دیکھنا کیا ضروری ہے..آج کا پورا دن اگر شاپنگ کے لیے ہی مختص کر دیا جائے تو کیا حرج ہے؟"

"حرج ہے.."لیو یکدم دکھ بھرا ہو گیا بلکہ ایک زندہ جاوید شاعر دوست کے بقول دُکھی پریم نگری ہو گیا۔"یُوگارڈن کو زندگی میں کم از کم ایک بار نہ دیکھنا گناہ ہے..چینیوں کے نزدیک۔"

"لیکن ہم تو چینی نہیں ہیں.."

اس پر تتلی نے بہت برا مانا.متعدد بار پر پھڑپھڑائے اور کہنے لگی۔"لیکن میں تو چینی ہوں..اور میں یہ گناہ نہیں کر سکتی.. یُوگارڈن میرے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا تمہارا شالیمار گارڈن..."

"لیکن تتلی ڈیئر..شالیمار گارڈن تو میں نے گزشتہ دس برس سے نہیں دیکھا.."

"میں نے بھی یوگارڈن ایک عرصے سے نہیں دیکھا.تم بتاؤ کہ اگر محبوب کو ایک مدّت تک نہ دیکھیں..تو کیا وہ محبوب نہیں رہتا؟"

تتلی لی پو ایسے شاعر کی تخلیق تھی بھلا میں اس سے بحث میں کیسے جیت سکتا تھا..

"لیکن یوگارڈن سے پہلے ہم آپ کو شنگھائی کے مرکز میں واقع ایک ایسے چینی گاؤں میں لے جائیں گے...کیسے چینی گاؤں میں لے جائیں گے..یہ آپ تب جانیں گے جب آپ اس قدیم گاؤں میں جائیں گے اور ایک گہرا سانس لے کر ہم سے پوچھیں گے کہ کیا یہ ایک ہزار برس پرانا چین ہے جہاں ہم آ گئے ہیں..اور ہم جواب میں صرف مسکرائیں گے۔"

لیو کے اس اعلان پر کہنا تو میں یہ چاہتا تھا کہ جناب ہمارے لیے تو یہ معجزہ ہی کافی ہے کہ ایک چینی مسکرائے گا لیکن میں چپ رہا.کہ اسی میں عافیت تھی..

شنگھائی فلائی اوور کے نیچے سے..اور کبھی برابر میں سے گزرتے..اسے پار کر کے ہم شہر کی گہما گہمی اور تیز دھوپ سے نکلتے بالآخر ہماری کوچ چینیوں سے ابلتے ہوئے ایک گنجان آباد علاقے میں داخل ہوئی جہاں کچھ قدیم آثار سرخ چھتوں والی عمارتوں کے سامنے ایک ایسا پارکنگ لاٹ تھا جہاں پارکنگ کے لیے کوئی ایک انچ بھی خالی نہ تھا..کوچیں، کاریں اور بسیں تھیں اور ہر کوئی بے بس تھا کہ اسے پارکنگ کے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی..

ہماری کوچ کے ڈرائیور نے پاکستانی سٹائل میں دیگر ٹریفک کو بلاک کر کے..ہمیں تو اتار دیا اور پھر پورے وقت پر واپس آ جانے کی ہدایت کر کے..بلکہ دھمکی دے کر کوچ کو گھما کر پارکنگ لاٹ سے باہر کہیں لے گیا۔

ہم باہر آ گئے..

ایک انبوہ میں شامل ہو گئے..

انبوہ میں ہم جیسے سیاحوں کی کثرت تھی اور آٹے میں نمک کے برابر چینی بھی تھے..

پارکنگ لاٹ کے دائیں جانب..شنگھائی نہ تھا..کوئی اور بستی تھی..

گئے زمانوں کے چین کی ایک بستی..جس میں محل، منارے اور برج تھے..ڈھلواں چھتوں کے شاہانہ گھر اور سرخ دالان تھے،سنہری ستون تھے..جنہیں ہزاروں برس پیشتر کے زمانے سے اٹھا کر...ان کی گاچی بنا کر..انہیں یہاں جدید شنگھائی کے درمیان میں لایا گیا اور لگایا گیا..ایک پودے کی طرح..اور یہ مرجھایا نہیں تھا،پھل پھول رہا تھا،بہار دے رہا تھا..

یہ ایک شاک تھا..

شنگھائی کے بیچ میں قدیم چین کی روایتی خوبصورتی کا ایک جزیرہ سانس لے رہا تھا..

کھڑکی کی سرخ بالکونیاں پیچیدہ نقش و نگار سے مزین، جن میں سنہری رنگ غالب تھا..دو منزلہ عمارتیں جن کا بیرون چوبی کاریگری کا کمال تھا.عیسائی راہبوں کے نوکیلے ہیٹوں

ایسی چھتوں والی دلفریب آماجگاہیں کہ جن میں سرخ رنگوں کے بہت سے شیڈ تھے۔ وہاں کوچے تھے تنگ اور ہم آغوش ہوتے.. بازار تھے کھلے بازو پھیلائے لیکن ٹریفک نہ تھی .صرف لوگ تھے..اطمینان سے چلتے اور اس مجموعۂ حیرت کو حیرت سے تکتے..

لیکن یہ گھر، عمارتیں اور حویلیاں محض دکھاوا تھے، ان کے اندر نہایت جدید سپر سٹور تھے..کافی ہاؤس، ریستوران، مے خانے، سووینئرز کی دکانیں، قالینوں کے شوروم۔ یہاں تک کہ ڈونٹس اور دیگر امریکی خوراکوں کے بھی بدمزہ بندوبست تھے لیکن..سب کے سب پوشیدہ تھے..ان کے باہر جتنے بھی سائن بورڈ تھے، ان میں سے بیشتر چینی خطاطی کے مظاہر تھے..

اہل شنگھائی اور غیر ملکی سیاح قدیم چین کے اس اوپن ایئر عجائب گھر میں آئس کریم، برگر اور ڈونٹ کھاتے نوڈل نگلتے یونہی بے مقصد گھومتے تھے..شاپنگ کرتے تھے یا ریستورانوں اور شراب خانوں کی باکمال تزئین کے اندر آرام کرتے تھے..

گئے زمانوں کے سکوت سے آشنا اس جزیرے کی کسی کو توقع نہ تھی..یہ شنگھائی کے جدید سمندر میں سے یکدم ابھر کر ہمارے سامنے آ گیا تھا.. یہاں چند لمحے تو کیا ایک عمر بتائی جا سکتی تھی..لیکن تنہا نہیں..کسی زرد شہزادی کے ساتھ..

سرخ عمارتوں اور ان پر آویزاں خطاطی کے طغروں اور سلیٹی رنگ کی چھتوں کی نفاست اور قدیم کاریگری کے درمیان میں سے کبھی کبھی جن ماؤ ٹاور نظر آ جاتا تھا، صرف یاد دہانی کروانے کی خاطر کہ یہ شنگھائی ہے آج کا..یہ دراصل وہ پرانا چین نہیں جس کے تم نے خواب دیکھے تھے..چونکہ خواب بھی سراب ہوتے ہیں، اس لیے فی الحال اسی سراب سے گزارہ کرو..

یہاں ڈولی لے کے کہار بھی آئے ہوئے تھے..

یہ ابھی چند روز پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ہاں دولہنیں ڈولی میں رخصت کی جاتی تھیں..لیکن وہ ڈولی مجھے ہمیشہ بلیک ہول کی یاد دلاتی تھی کیونکہ بچپن میں ایک مرتبہ دولہن کے ہمراہ مجھے بھی جھونگے کے طور پر ڈولی میں بٹھا دیا گیا تھا..بلکہ دولہن کی گود میں بٹھا

دیا گیا تھا اور اندر اتنی تاریکی تھی کہ میں چیخیں مار مار کر یوں رویا تھا کہ دولہن نے رونا دھونا موقوف کر دیا تھا اور مجھے فوراً ڈولی بدر کر دیا تھا..

یہ چینی طرز کی ڈولیاں تھیں..انہیں شہنشاہیت کے عہد میں استعمال کی جانے والی پالکیوں کی طرز پر بنایا گیا تھا..ایسی ہی پالکیوں میں بیٹھ کر شاہان چین شہر ممنوعہ میں سفر کرتے ایک داشتہ سے دوسری یا ساٹھویں داشتہ کے کمرے تک لے جائے جاتے تھے..ظاہر ہے اتنی داشتاؤں سے اگر سرسری راہ و رسم کی جائے تو بھی انسان چلنے پھرنے کے قابل تو نہیں رہتا، اسے پالکی میں ڈال کر ہی لے جایا جا سکتا ہے..البتہ یہ چینی پالکیاں آپ کو کسی مہربان خاتون تک تو نہیں لے جاتی تھیں بلکہ اس چینی بستی میں گھما پھرا کر آپ کے ڈالروں میں شدید کمی کا باعث بنتی تھیں..ڈولیاں قدیم تھیں لیکن کہاروں نے جینیں کس رکھی تھیں..

"تتلی.."

وہ ایک جن کی طرح حاضر ہو گئی..

"مجھے شک ہے کہ یہ بستی اور اس کے کوچہ و بازار تم نے کسی قدیم سحر کے زور سے شب بھر میں صرف میرے لیے تخلیق کر دیئے ہیں کیونکہ میں شنگھائی سے مطمئن نہیں تھا.."

"تم اس لیے شک کرتے ہو کہ چینی کردار کے بارے میں قطعی طور پر ناواقف ہو..میں اگرچہ اپنے ازلی دشمن جاپان کا حوالہ دینا تو نہیں چاہتی مگر مجبوری ہے..جیسے جاپانی دنیا کے سب سے جدید ترین انسان ہونے کے باوجود اپنی روایتی ثقافت فراموش نہیں کرتے، آپ اس سے راستہ پوچھ لیں تو وہ جھک جھک کر دوہرا ہو جاتا ہے..گھر جاتا ہے تو سوٹ اتار کر کمینو پہن لیتا ہے..چائے کی تقریب..سوموکشتی اور گیشا گرلز پر جان دیتا ہے اور اب بھی عزت نفس مجروح ہو تو خودکشی کو سب سے شاندار موت سمجھتا ہے..ہم چینی بھی بے شک جتنے بھی جدید ہو جائیں اپنے ورثے کو نہیں بھولتے..دنیا بھر میں جہاں جہاں چینی گئے، اپنا چین ساتھ لے کر گئے..اسے اپنے اپنے چائنا ٹاؤن میں حفاظت سے رکھا..سنبھال کر رکھا..چاہے یہ ہوائی کا جزیرہ ہو یا سان فرانسسکو..اس لیے تمہیں حیرت نہیں ہونی

چاہیے..تمہارے ہاں بھی تو چینی ہیں..''

''ہاں..ایک زمانے میں دندان ساز صرف چینی ہوا کرتے تھے..یا بہترین شوز چینی کاریگر بناتے تھے لیکن اب صورت حال یکسر بدل چکی ہے..اب وہ بیوٹی پارلر..ہسپتال اور ریستوران چلاتے ہیں..میں شائد تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ چکن کارن سوپ ہمارا قومی سوپ بن چکا ہے..ہمارے بچے چینی کھانے کھا کھا کر چائنیز ہو چکے ہیں..یہاں مجھے سٹیو یاد آ رہا ہے جو لاہور میں سب سے اعلیٰ اور منافع بخش چینی ریستورانوں کا مالک ہے..اس کے ریستورانوں میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ لگتا ہے باراتیں اتری ہوئی ہیں اور کھانا مفت میں مہیا کیا جا رہا ہے..سٹیو کی جم پل لاہور کی ہے..پکّا لاہوریا ہے اور پنجابی اتنی ٹھیٹھ بولتا ہے کہ سن کر پسینہ آ جاتا ہے..اور اس کے باوجود جب اولاد نہ ہونے کے باعث اسے کسی بچے کو گود لینے کی خواہش ہوئی تو وہ شاید پہلی مرتبہ چین واپس گیا..اس گاؤں میں گیا جہاں سے اس کے آباؤ اجداد رزق کے حصول کے لیے نکلے تھے..اور وہاں کا ایک بچہ متبنیٰ بنا کر لاہور لایا..چنانچہ میں آگاہ ہوں کہ چینی کبھی بھی اپنی جڑوں کو نہیں بھولتے..''

''تو اگر ہم چین میں ہی ہیں..'' تتلی خوش ہوگئی۔ ''تو ہم اپنی جڑوں کو کیسے بھول سکتے ہیں؟''

پھر ہم سب بکھر گئے..

شاپنگ کی فہرستیں تھامے جس کا جدھر منہ آیا، نکل گیا..

ایک شاہانہ قدامت والے سنہرے دروازے کے اندر گئے تو ایک وسیع سپر سٹور کی دنیا کی گہما گہمی کی لپیٹ میں آ گئے..

ہم وہ کچھ بھی خریدتے جاتے تھے جو خریدنے نہیں آئے تھے..

سٹورز کے اندر..اطالوی، برطانوی اور جرمن اداروں کے ملبوسات، شوز اور دیگر سامان آسائش و آرائش نمائش پر تھا..

لیکن یہاں بھی وہی بھاؤ تاؤ چلتا تھا..ہزار یوآن کی شے ڈھیٹ بنے رہنے سے..آتے جاتے قیمت گھٹاتے بڑھاتے..چار سو یوآن میں مل جاتی تھی..

ابھی ہم شاپنگ کی حسرتیں پوری نہ کر پائے تھے کہ لیو، خاور اور وانگ لی کی تثلیث نے ہمیں ہر سٹور، ہر ریستوران اور ہر دوکان سے جانے کیسے دریافت کر کے برآمد کر لیا..اور اعلان کیا کہ..شیڈول کے مطابق اب ہم اس علاقے کے مشہور عالم ریستوران..لیو بولانگ میں لنچ کے لیے جائیں گے..

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ چینی برادر بے شک ماؤ اور تاؤ کی تعلیمات سے منحرف ہو جائیں لیکن اوقات طعام میں ذرہ برابر انحراف نہیں کرتے..ایک مذہبی فریضہ کے طور پر ان کی پابندی کرتے ہیں..معزز مہمان اگر نا پسند کرے تو بھی زبردستی اس سے پابندی کرواتے ہیں..اور بے شک اس لمحے مہمان بائی پاس آپریشن کے دوران آپریشن تھیٹر کی میز پر پڑا ہو..اس کے سینے اور پسلیوں کو ایک آری سے کاٹ کر ان میں سے اس کا دِل تلاش کرنے کی کوشش جاری ہو تو بھی...اگر وقت طعام آن پہنچا..تو اسے اٹھا دیا جائے گا کہ برادر بے شک اپنے شق سینے اور کھلے دل کو سنبھالتے آؤ..لیکن پہلے کھانا تناول کر لو، اس لیے کہ وقت آ گیا ہے..یوں بھی اس قسم کے آپریشن ہوتے ہی رہتے ہیں..

اس لیے ہم نے نہ کوئی احتجاج کیا اور نہ کوئی اعتراض..سرِ تسلیم خم کر کے ان تینوں اور شنگھائی کے میزبان ادیبوں کے ساتھ ہو لیے..اپنے شاپنگ بیگ اور تھیلے گھسیٹتے..

یو بولانگ ریستوران میں داخل ہوئے تو احساس ہوا کہ ہاں بائی پاس آپریشن کے دوران مریض کو کھلے سینے اور کٹی ہوئی پسلیوں اور ہاتھ میں اپنا خون آلود دل سنبھالتے بھی اگر یہاں لے آیا جائے تو اس میں مضائقہ نہیں..یہ اس لائق تھا۔

ڈھکی چھپی چینی روشنیاں..لیکن روشنیاں چینی کیسے ہو سکتی ہیں..ہو سکتی ہیں..ان میں روشنی، سایوں اور نیم اندھیروں کا جو امتزاج تھا وہ صرف چینی مزاج کو ان کی حسِ جمال کو اجاگر کرتا تھا۔ مختلف قومیں اپنی عمارتوں کے اندرون کو کس طرح روشن یا نیم روشن کرتی ہیں، یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے لیکن پاکستانی چکا چوند کر دینے کے قائل ہیں کہ انسان بے شک اندھا ہو جائے اور ٹھوکریں کھاتا پھرے..اس چکا چوند کر دینے میں صرف امریکی ہم پر سبقت لے جاتے ہیں..فرانسیسی اتنی کم روشنی کرتے ہیں کہ بدصورت خواتین بھی دل کش نظر

آنے لگیں..جرمن بالکل درست اور پریکٹیکل روشنی کرنے کے قائل ہیں..جہاں روشنی درکار ہے، ہونی چاہیے..جہاں ضرورت نہیں وہاں نہیں ہونی چاہیے..اطالوی اور ہسپانوی عام طور پر مکمل اندھیرے کو پسند کرتے ہیں..بہرحال لیو بولانگ ریستوران میں سائے اور نیم تاریک روشنیاں چینی مزاج کی عکاسی کرتی تھیں..سیاہ ستون جن پر سنہری بیل بوٹے، چینی مصوری کی بے مثل تصویریں..قدیم فرنیچر اور سیاہ آبنوسی کھڑکیاں جن کے پار سرخ چھتیں..ایک تالاب جس میں کنول تیرتے تھے اور کبڑے پلوں پر کھڑے سیاح تصویریں اترواتے تھے..پگوڈا نما عمارتیں..اندرون بھی دل کش اور یہاں سے جو بیرون دکھائی دے رہا تھا، وہ بھی نظر نواز..

داخلے پر ایک دیدہ زیب سنہری فریم جس میں سے پورا ریستوران ایک تصویر کی مانند جڑا نظر آ رہا ہے..

داخلے کی بائیں دیوار پر ان شہرۂ آفاق ہستیوں کی تصاویر آویزاں تھیں جنہوں نے اس ریستوران میں قدم رنجہ فرمایا اور تب ہمیں احساس ہوا کہ ہم کتنے بے وقعت اور حقیر ہیں..بلکہ ہمیں تو احساس نہیں ہوا کیونکہ ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں تھے لیکن ریستوران کے اہلکاروں نے تصاویر کی جانب متوجہ کر کے ہمیں احساس دلوایا..یہاں چیلسی اور ہلیری کے ہمراہ کلنٹن بھی تھے..فیڈل کاسترو..یاسر عرفات اور سوہارتو بھی تھے..اور زمن تو تھے ہی..

ہم اگر کبھی ذاتی یعنی چڑ کناتی حیثیت میں شنگھائی آتے تو اس ریستوران کے دروازے پر صرف اِک آہِ سرد بھر کر چلے جاتے..یہ تو صرف سرکاری میزبانی کا کمال تھا..نوازشیں بے پناہ تھیں کہ ہمارے بس سے باہر جو بین الاقوامی شہرت رکھنے والا ریستوران تھا، اس میں ہم لنچ فرمانے کو تھے..

صرف آگاہی احساس کمتری کو جنم دیتی تھی..

ہم چند لمحے پیشتر اس ریستوران کی اہمیت سے قطعی طور پر ناواقف تھے اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن جب ہم آگاہ ہوئے یا ہمیں آگاہ کیا گیا تو ہم کمتر ہو گئے..
شاید یہ اس ریستوران کی اہمیت..گرانی اور ماحول کا اثر تھا...یا شاید وانگ لی کی

سرخ ٹی شرٹ کا..جو اسے پہلی بار تقریباً قبول صورت بنا رہی تھی کہ ہمیں چینی خوراک بھی کسی حد تک قابل قبول لگی..اس کی وہ ناگوار مہک معدوم ہو گئی جو بیجنگ میں ہمارے معدے اتھل پتھل کرتی تھی..یہ اس ریستوران کا کمال تھا یا ہمیں عادت ہو گئی تھی..جیسے چماروں کی بہو کو عادت ہو گئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ میرے آنے سے تمہارے گھر کی بُو ختم ہو گئی ہے..وفد کے بیشتر اراکین بیجنگ میں آمد کے پہلے روز کی احتیاط کا دامن چھوڑ چکے تھے اور میز پر سجی خوراکوں کو نہایت دل جمعی سے کھاتے جاتے تھے..

البتہ سفید ریش اور دہقانی مسلسل تشویش میں تھے..

ڈشیں آتی چلی جاتی تھیں..طشتریاں بجتی چلی جاتی تھیں..ایک اور ڈش آئی جو مکمل طور پر نامحرم دکھائی دیتی تھی..چنانچہ ہر ایک نے شدید سوالیہ نظروں سے باری باری لیو، خاور اور وانگ لی کو دیکھا..

ہمارے صرف دیکھنے سے ان پر کچھ اثر نہ ہوا، اس لیے ہم نے باری باری پوچھا کہ یہ کیا ہے..یہ کیا ہے..

اور انہوں نے ہماری کم علمی پر ماتم کرنے کے انداز میں کہا۔ ”آپ نہیں جانتے؟“

”بالکل نہیں۔“

”یہ تو ایک انتہائی مہنگی اور زندگی میں ایک بار سامنے آنے والی ڈش ہے اور آپ نہیں جانتے؟“

”ہم نہیں جانتے۔“ ہم نے تقریباً کورس میں جواب دیا۔

”یہ...“ لیو نے چٹخارے لیتے ہوئے بآواز بلند اعلان کیا۔ ”ریشم کے کیڑے ہیں۔“

جنرل صاحب نے انہیں للچائی ہوئی نظروں سے پرکھا۔ ”حلال ہیں؟“ حالانکہ وہ تقریباً ہر شے کھا جاتے تھے اور بعد میں ہمیں اسلامی تعلیمات کے بارے میں بصیرت آموز لیکچر دیتے تھے..سب نے اپنے اپنے ذہن میں ریشم کی ریشمی تاریخ دہرائی..ریشمی پیراہنوں میں لپٹے بدن۔ یورپ کی حیرانی۔ کھالوں سے بدن ڈھانپنے والے یورپ کی اس لباس کی نزاکت اور نرمی پر حیرت دہرائی..دوگھوڑا بوسکی..کے بارے میں سوچا..دینے پاکستان کے

حال مقیم بمبئی گلزار کی اپنی بیٹی کو ''بوسکی'' کا نام دینے پر بہت دیر غور کیا. لیکن اس کے باوجود... ہم اس ریشم کے کیڑوں کو نہیں کھا سکتے تھے..

ہم نے اس ڈش کو ذرا پرے پرے کیا..

اس پر خاور جو بہت خنک اور ٹھہرے ہوئے معتدل مزاج کا بچہ تھا، عینک سنبھالتے ہوئے ہاتھ احتجاج میں پھیلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ اس میز پر سجے درجنوں کھانوں کی جو مشترک قیمت ہے، یہ ریشمی کیڑے ان سے کہیں زیادہ مہنگے ہیں۔''

''تو آپ کھاؤ۔'' حسرت ناک بولا۔

''اگر آپ نہیں کھائیں گے تو ہم نہیں کھا سکتے۔'' لیو نے بیچارگی سے کہا..

''کیوں؟''

''آپ مہمان ہیں اور ہم میزبان..''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''آپ نہیں کھائیں گے تو... اخلاقی طور پر ہم بھی انہیں ہاتھ نہیں لگا سکتے..''

''لیکن شی آن کی آسمانی آفت تو ہر اس خوراک کو ہاتھ لگاتی تھی بلکہ ہڑپ کر جاتی تھی جسے ہم ہاتھ نہیں لگاتے تھے..''

''یہ شی آن نہیں. شنگھائی ہے۔'' تتلی شاید کسی ریشم کے کیڑے پر بیٹھی اسی لمحے کی منتظر تھی..

''تو میں کیڑوں کو کھا جاؤں؟''

''یہ ریشم کے کیڑے ہیں..''

''ہیں تو کیڑے..''

''میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتی. تم اپنے وطن میں اس سے کہیں کمتر کیڑے کھا سکتے ہو تو یہاں کیوں اجتناب کرتے ہو؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں نے آج تک کوئی کیڑا مکوڑا کھایا ہو. تم ثابت کر

دو تو میں انہیں بھی بے دریغ کھا جاؤں..''

''تم تو ٹڈیاں بھی کھا جاتے ہو..''

''نہیں..''

''ہاں.. یاد کرو وہ دن جب لاہور کے آسمانوں سے ایک ٹڈی دل سیاہ بادل کی مانند پرواز کرتا تھا..اور تمہارے گھر کے سامنے یُو پی سے آئے ہوئے جو مہاجر ہمسائے تھے، وہ بیڈمنٹن کے ریکٹوں سے انہیں شکار کرتے تھے اور پھر ان کی بڑی اماں نے انہیں فرائی کر کے تمہیں سوغات کے طور پر بھیجا تھا. تو تم نے کس مزے سے چٹخارے لیتے ہوئے وہ کڑکڑاتی تلی ہوئی ٹڈیاں کھائی تھیں..''

''تتلی میں تمہارے وجود سے سفر چین کے دوران.. لی پو کی شاعری کے دوران آگاہ ہوا تھا. تم میرے بچپن سے کیسے واقف ہو؟''

''اس لیے کہ وہ میرا بھی بچپن تھا.. بتاؤ تم نے وہ فرائی شدہ ٹڈیاں کھائی تھیں یا نہیں؟''

''شائد کھائی تھیں..''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ حلال تھیں۔''

''تم خود انصاف کرو..اگر ایک مکروہ شکل کی ٹڈی حلال ہو سکتی ہے تو اس کے مقابلے میں ایک نہایت کومل اور نازک ریشم کا کیڑا کیسے حلال نہیں ہو سکتا..ہر چینی اس ڈش کی خواہش کرتا ہے لیکن یہ اتنی مہنگی ہے کہ اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی. تم نہیں کھاؤ گے تو وہ بیٹھے رہیں گے..اس سے محروم رہ جائیں گے..''

تب میں نے ہاتھ بڑھا کر اس ڈش میں سے گہرے سلیٹی رنگ کی کچھ سپّیاں سی جو گھنے سیاہ شوربے میں تھیں، انہیں اپنی پلیٹ میں منتقل کیا اور ان میں سے ایک کو کانٹے میں پرو کر اپنے منہ میں رکھا..اور چکھا..ذائقہ نمکین تھا، برا نہ تھا..البتہ سپیاں دانتوں تلے آتیں تو کرچ کرچ کرتیں..

''کیسی ہیں؟'' دہقانی نے پوچھا..

''بہت ریشمی..'' میں نے سر ہلایا..

میری شہہ پا کر دیگر اراکین نے بھی ریشم کے تلے ہوئے کیڑے یا گھونگھے جو بھی وہ تھے، چکھے..اور میری طرح سر ہلایا..

میں نے اس روز اتنے کیڑے تو کھائے ہوں گے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو کم از کم دو گھوڑا بوسکی کے دو تھان ضرور بنا لیتے..

لیو، وانگ لی اور خاور خوش ہو گئے اور انہوں نے بقیہ ریشم کے کیڑوں کا تیا پانچہ کر دیا..ادھر جنرل صاحب تو یوں بھی تیا پانچہ کرنے کے ماہر تھے..سچ مچ کے جنرل تو ملکوں کا تیا پانچہ کر دیتے ہیں جب کہ ہمارے والا جنرل تو صرف خوراک کا کرتا تھا..وہ اپنی درجن بھر بیماریوں اور ان میں پیچیدگیوں کے باوجود یا شاید انہی کی وجہ سے ہر کھانے کو اپنا آخری کھانا سمجھ کر کھاتے تھے اور حق ادا کر دیتے تھے۔کسی بھی ڈش کو چکھے بنا رخصت نہ کرتے اور ان کی عقابی نظریں پل بھر میں میز کا طواف کر کے یہ جان لیتی تھیں کہ ان تین چار درجن خوراکوں میں سے کونسی خوراک ایسی ہے جس پر ابھی ہاتھ نہیں ڈالا گیا اور جب ہاتھ ڈالتے تھے تو پھر نہ کوئی بندہ رہتا تھا اور نہ کوئی بندہ نواز..گویا ہاتھ کیا ڈاکہ ڈالتے تھے..چنانچہ اس ریستوران میں جنرل صاحب فل فارم میں تھے..

گیانی صاحب پہلی بار ذرا رومینٹک ہو رہے تھے۔انہوں نے نیلی جین اور جوگرز کے ہمراہ ایک شوخ دھاریوں والی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی..اپنی مونچھیں ترشوا رکھی تھیں اور تیکھی کروا رکھی تھی اور برابر کی میز پر براجمان ایک چینی خاتون کو ایک خفیف سی تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ مسلسل نوازتے تھے..

دہقانی کہانی کار کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ردِّعمل کے تمام پتے میز پر رکھ دیتا تھا اور آپ اس کے چہرے سے اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ اس لمحے تین یکوں کی سرشاری میں سے گزر رہا ہے یا بیچارے کے پاس دو تین چھ آ گئی ہیں اور وہ بھی مختلف رنگوں کی۔یعنی وہ اپنے احساسات کو پوشیدہ نہیں رکھتا تھا..اور اس لمحے لیو بولانگ ریستوران میں اور اس کے سحر

آفریں ماحول میں دہقانی تاش کا بادشاہ محسوس کر رہا تھا جب کہ گیسو دراز مسلسل مسکرا رہا تھا۔ گنگنا رہا تھا اور وانگ لی کی جانب متوجہ ہو رہا تھا..

لیکن سب سے دلچسپ ردِعمل حسرت ناک کا تھا جسے کسی مخاطب کی حاجت پیش نہیں آتی بلکہ وہ خود کلامی میں خود کفیل ہو کر اپنے آپ سے باتیں کرتا اس خوبصورت ماحول کو انجائے کر رہا تھا... یار بڑا کمال کا ہوٹل ہے.. ہیں جی.. پردے سرخ رنگ کے ہیں۔ روشنیاں مخفی ہیں۔کرسیاں البتہ آرام دہ نہیں ہیں.. پتہ نہیں کیوں نہیں ہیں۔کھڑکی کے پار جھیل نظر آ رہی ہے..جھیل میں کنول ہیں اور ایک پگوڈا سا تیر رہا ہے..اچھا تیر کیسے سکتا ہے..پگوڈے بھی کبھی تیرتے ہیں..اچھا اس کے ستون جھیل کی تہ میں ہوں گے اس لیے لگتا ہے کہ تیر رہا ہے۔ میں بھی کہوں پگوڈا کیسے تیر سکتا ہے..یہ تارڑ ریشم کے کیڑے کھا گیا ہے..عجیب آدمی ہے.. پتہ نہیں ریشم کے کیڑے حلال ہوتے ہیں کہ نہیں..اتنے چھوٹے کیڑوں کو پتہ نہیں حلال کیسے کرتے ہیں..

لیڈر البتہ ذرا دلگیر سا دکھائی دے رہا تھا..کیونکہ اس کے نہایت عمدہ نیلے سوٹ اور میچنگ ٹائی کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا تھا..ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ اپنے وفد کے اراکین کی جانب ایک مربیانہ نگاہ ڈال کر کہتا۔''کاش اس وقت یہاں فریدہ خانم ہوتی اور وہ میری غزل... گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے...گا رہی ہوتی..''

اور اس ماحول میں واقعی فریدہ خانم..کیسے سجتی..سینے سے جان بوجھ کر ساڑھی ڈھلکاتی..اپنی ترچھی ہوتی آنکھوں کو برابر میں لانے کی کوشش میں انہیں نیم وا کرتی اور یہ گاتی..کہ گو ذرا سی بات پہ..

بہت برس پہلے ہالینڈ میں ایک شب میں اپنے مرحوم دوست حنیف اور اس کے ڈچ دوستوں کے ہمراہ ایک ایسے ہی قدامت کی مہک لیے ہوئے ریستوران کے سکون آور ماحول میں گیا تھا اور وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے ہم سب نے ریستوران کے ایک نیپکن پر اپنے اپنے دستخط کیے تھے تا کہ یہ شب یاد رہے..یہ نیپکن اب بھی کبھی کبھی پرانی کتابوں، خطوں اور پوسٹ کارڈوں کے انبار میں سے یکدم برآمد ہو کر مجھے ان زمانوں میں

لے جاتا تھا. تو میں نے یہاں شنگھائی کے لیو بولانگ ریستوران میں بھی اپنی گود میں بچھے نیپکن کو اٹھایا اور اسے میز پر پھیلا کر اپنے ہم سفروں سے گزارش کی کہ وہ آج کے دن کی یاد میں اس پر اپنے اپنے دستخط کر دیں..

''اللہ آپ سب کو زندگی دے..'' یہ لیڈر کی دعا تھی..

گیسو دراز نے حیرت انگیز طور پر اپنے ہم سفروں کی توصیف کی۔ ''اچھے ہم سفر بہت یاد رہیں گے۔''

سفید ریش شاعر نے اِک آہ سرد بھری..

جب اگلے سال یہی وقت آ رہا ہوگا
یہ کون جانتا ہے، کون کس جگہ ہوگا

باقی کم پڑھے لکھے لوگوں نے صرف دستخط کر دیئے..

یہ سطریں لکھتے ہوئے وہی سفید براق لنن کا نیپکن جس کے اندر سفیدی میں ہی چینی حروف اور نقوش ابھرے ہوئے ہیں، میری سٹڈی ٹیبل پر پھیلا ہوا ہے جیسے میں نے ابھی ابھی کھانا کھانے کے بعد لیو بولانگ ریستوران میں اسے اٹھا کر میز پر رکھا ہو.. اس پر جو تحریریں اور آٹو گراف ہیں، ان کی سیاہی اتنی تازہ اور کپڑے پر پھیلتی ہوئی لگتی ہے کہ شاید یہ سب لوگ ابھی کچھ دیر پہلے میری سٹڈی میں موجود تھے.. ابھی ابھی دستخط کر کے رخصت ہوئے ہیں.. ہمارے شنگھائی کے میزبان ادیب، وانگ لی، خاور، لیو، حسرت ناک، دہقانی، گیانی، جنرل صاحب، گیسو دراز، لیل پوری، لیڈر... سب کے سب ابھی یہاں موجود تھے.. اور ہاں تتلی بھی تھی کہ اس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ نیپکن میں ابھی تک لرزش ہوتی تھی.. یہ سب کتنے شاندار لوگ تھے اور میں کتنا خوش نصیب تھا کہ ان کی رفاقت میں تھا۔ ہم ریستوران سے باہر آ گئے..

باہر وہی آب و ہوا، وہی قدیم موسم تھے.. تنگ گلیاں، بازار، خوش نما چینی گھر، لکڑی کے منقش چھجے، بالکونیاں اور جھروکے.. اور چینی خطاطی کے وہ دل فریب حروف جن پر تصویروں کا گمان ہوتا تھا.. ہر شے سینکڑوں برس پہلے کی تھی سوائے اس بستی میں چلتے

پھرتے لوگوں کے ملبوسات کے.. جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم ''کل'' میں نہیں ''آج'' میں ہیں اور ہمارے ارد گرد محض ایک شعبدہ ہے جو ہمیں عہدِ عتیق میں لیے جاتا ہے.. نظر کا دھوکا ہے..

تتلی خوراک دیکھ دیکھ کر ہی اتنی بوجھل ہو چکی تھی کہ اب میرے کندھے پر بیٹھی اونگھتی تھی۔

ریستوران سے باہر آئے تو تازہ ہوا لگنے سے فوراً چوکنی ہو گئی اور باتونی ہو گئی۔

''ہم شنگھائی میں ڈاکٹر سن یات سن کے گھر بھی جا سکتے تھے..''

''تو کیوں نہیں گئے.. وہ گھر نہیں ہوں گے۔''

''تم اب اتنے بھولے بھی نہ بنو.. ڈاکٹر سن یات سن اور اس کی بیوی میڈم سونگ چینگ چینی انقلاب کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے پہلے قومی کمیونسٹ اتحاد کی بنیاد رکھی..''

''ہاں میں نے سن رکھا ہے۔''

''اور ہم ''ایک پاگل کی ڈائری'' کے مصنف لوہشون کی قبر پر بھی حاضری دے سکتے تھے۔''

''تو کیوں نہیں دی..''

''اس لیے کہ ہمارے پاس وقت کم ہے.. اور لوہشون کے میوزیم اور اس کے ہال کو دیکھنے کے لیے پورا دن درکار ہے.. لیکن میں بتاتی ہوں کہ لوہشون کی یاد میں جو ہال تعمیر کیا گیا ہے اس میں اس کے مسودے، مضامین اور نادر تصاویر نمائش پر ہیں.. اور اس ہال کو ہو بہو لوہشون کے آبائی گاؤں شاؤشنگ کے طرزِ تعمیر کے مطابق بنایا گیا ہے اور پارک میں اس کی قبر پر جو کتبہ آویزاں ہے اس پر صرف یہ لکھا ہے ''جناب لوہشون کی قبر..''

''لکھنے والے کے پاس غالباً وقت کم تھا..''

''شائد..'' تتلی مسکرائی۔ ''تم جانتے ہو یہ کتبہ کس نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا؟''

''جس کے پاس وقت کم تھا..''

''ہاں..خود چیئرمین ماؤزے تنگ نے۔''

''تو پھر ہم وہاں کیوں نہیں گئے؟''

''ہمارے پاس بھی وقت کم ہے..شیڈول کی پابندی ہے..لیکن یہ تاریخی شخصیتیں ایسی ہیں کہ انہیں تم ان کی تحریروں اور کارناموں کے حوالے سے گھر بیٹھے بھی جان سکتے ہو..لیکن یُوگارڈن ایک ایسی جگہ ہے جسے تم صرف دیکھنے سے ہی جان سکتے ہو..اس لیے یُوگارڈن..''

''یُوگارڈن کے حیرت کدے میں..عشقِ خاص کی یاد''

باغ..گارڈن..گلستاں..کا تصور ہر ملک کی ثقافت، تاریخ اور ادب کے حوالے سے جنم لیتا ہے اور ہمیشہ مختلف ہوتا ہے..

جنت بھی ایک باغ ہے..یا ہوگا..دل کے خوش رکھنے کو..یہ خیال...

باغِ ارم کا خیال اچھا تو ہے..

ایرانیوں کے گلشن میں بے شک ایک مرجھائی ہوئی بیل اور گلاب کی ایک پژمردہ جھاڑی ہو، وہ اس کی توصیف میں دیوان کے دیوان سیاہ کر دیں گے..

عربوں کے لیے کھجور کے چند درخت..اور اگر کچھ پانی میسر آ جائے تو..

اندلس والوں کے لیے ''جنت العارفین'' میں پوشیدگی اور فوارے ضروری ہیں..

اطالوی اور فرانسیسی باغ ہمیشہ نہایت باقاعدہ..منصوبہ بند..ترشے ہوئے اور حجامت شدہ ہوں گے..

پاکستانی شمال میں جھاڑیوں اور خودرو پھولوں کی بے ترتیبی ہی باغ کی علامت ہیں اور ترتیب کو بدتہذیبی کی علامت سمجھا جاتا ہے..

مغلوں کے باغوں میں..فوارے، روشیں، تختے، سرو کے درخت، بارہ دریاں اور ان باغوں میں پڑے جھولے..اور تم بھول گئے ہم کو اور ہم تم کو نہیں بھولے..

اپنے پنجاب میں اگر باغ میں پھلدار درخت نہ ہوں..آموں کے گھنے پیڑ یا

مالٹوں کے ٹھگنے شجر نہ ہوں.. یا کم از کم جامن تو ٹپ ٹپ گریں.. تو وہ کاہے کے اور کیسے باغ.. نرے پھولوں، جھاڑیوں اور دیدہ زیب درختوں کو ہم باغ نہیں کہتے..

جاپانی ہزاروں برسوں سے اپنے باغ کو اتنی نفاست اور خوبصورتی سے ترتیب دیتے آئے ہیں کہ یہی حسن ترتیب انہیں کمپیوٹر تک لے آیا ہے.. چند پتھر، ایک تالاب، تھوڑی سی بجری اور چند ٹھگنی جھاڑیاں.. اور آپ اس باغ میں سے ایک سنگریزہ بھی اِدھر اُدھر کر دیں تو ان کا باغ برباد ہو جائے گا.. جاپانی اپنے باغ میں اپنے قد سے بڑی کوئی بھی شے برداشت نہیں کر سکتے، اس لیے درخت بھی پستہ قد ہوں گے..

غرض کہ ہر قوم اپنے مزاج اور تاریخ کے مطابق باغ تخلیق کرتی ہے.. چنانچہ چین جب باغ کے تصور کو روپ دیتا ہے تو وہ دوسری اقوام کی نسبت سراسر مختلف ہوتا ہے.. یہ کچھ اور ہوتا ہے..

یہ کچھ اور... اور بہت کچھ اور.. یُوگارڈن کے اندر تھا..

داخلے پر وہی احتیاط.. وہی پردہ پوشی کہ جو کچھ اندر پوشیدہ ہے، وہ یکدم ظاہر نہ ہونے پائے..

داخلے کے سامنے ایک حجاب.. ایک پردہ.. آپ کی نظر روکنے کے لیے.. اکثر اوقات یہ ایک قدرتی تخلیق کا بڑا اسارا پتھر ہوگا..

لیکن یہاں.. یوگارڈن کی تصویر کو اوجھل کرنے کے لیے ایک بون سائی درخت پھیلا ہوا تھا.. ایک بڑے شجر کا منی ایچر.. اور میں نے آج تک اتنا مکمل.. اتنا مصورانہ اور ہرا بھرا مختصر شجر نہیں دیکھا تھا.. اور اس کے عقب میں یُوگارڈن..

یُوگارڈن کسی چینی سوداگر.. کسی صاحبِ حیثیت اور صاحب ذوق کی حسِ جمال کا شاہکار تھا..

اس میں بارہ دریاں، سیاہ اژدھے، آرائشی چٹانوں کی زیبائش، تالاب.. اور تالابوں میں پرے کے پرے تیرتی سنہری مچھلیاں... کائی زدہ کنارے، قدرتی پتھروں اور سوکھے ہوئے درختوں کی شاخیں.. قدیم پیڑ، عجیب جھاڑیاں، خواب گاہیں، راہداریاں، سیاہ

اژدھے دیواروں پر رینگتے ہوئے ساکت.. اور ایسے کُنج جن میں خلوت کے لیے در و بام کی حاجت نہ تھی..

کہتے ہیں کہ قدیم چین میں شہنشاہ کے سوا کوئی بھی شخص اپنے گھر میں اژدھوں کے مجسموں یا تصویروں سے آرائش نہیں کر سکتا تھا.. اس جرم کی سزا بے حد کڑی تھی.. لیکن یوگارڈن کے خالق نے.. اُس بندۂ خدا نے اپنا یہ گاؤں نما گھر اتنا پیچیدہ اور پوشیدہ بنایا تھا کہ شہنشاہ کے ہرکاروں کو ایک مدت خبر نہ ہو سکی کہ ایک عام شخص نے یہاں اژدھے تراش کر اسے سجایا ہے..

مجھے یہ علم نہیں کہ جب انہیں خبر ہوئی تھی تو پھر انہوں نے کیا کیا تھا..

اس یُوگارڈن کا سب سے بڑا معجزہ یہ تھا کہ جو بھی موڑ آتا تھا، اس کے پار منظر بدل جاتا تھا..

جو بھی دروازہ کھلتا تھا، وہ کسی اور حیرت کدے پر کھلتا تھا..

اس باغ میں.. شالیمار باغ یا ورسیلز کی مانند کوئی ایسا تسلسل نہ تھا کہ اس کی صرف ایک تصویر اتار کر آپ کہیں کہ جناب یہ ہے یوگارڈن..

آپ ایک منظر میں داخل ہو کر ابھی اسے اپنے اندر اتار رہے ہوتے تھے.. اس کے پھول، بوٹوں، بارہ دریوں اور تالابوں پر جھکے بید مجنوں کی شاخیں شمار کر رہے ہوتے تھے اور بے دھیانی میں کسی اور دروازے میں داخل ہو جاتے تھے تو دوسری جانب ایک سراسر مختلف مزاج کا.. چینی مزاج کا اور ماحول کا منظر کھل جاتا تھا..

میں تو ہمیشہ حساب میں کمزور رہا ہوں لیکن حساب کتاب کے ماہرین نے حساب لگایا تھا کہ یوگارڈن میں چالیس کے لگ بھگ مختلف منظر ہیں.. باغ اور آرام گاہیں اور خلوت گاہیں ہیں جن میں سے آپ گزرتے جاتے ہیں اور سرسری گزرتے جاتے ہیں کیونکہ آپ شیڈول کے پابند ہوتے ہیں۔

ایک منظر یوں کھلتا ہے کہ بید مجنوں کی شاخیں ایک کائی زدہ تالاب کی سطح کو چھوتی ہیں اور جہاں وہ پانی کو چھوتی ہیں، وہاں سنہری مچھلیوں کے غول ان شاخوں سے کھیلتے

ہوئے تیرتے گزرتے ہیں۔ تالاب کی گہری سبز رنگت میں ان کے سنہری بدن سورج کی پہلی شعاعوں کی مانند نظر کو خیرہ کرتے ہیں. سرخ چھتوں کے ڈھلتے سائے میں ایک پویلین ہے... جھاڑیوں اور بید مجنوں کی شاخوں کی اوٹ میں جہاں اس یُوگارڈن میں منہ کھولے حیرت زدہ سیاحوں کے وجود سے قطعی بے خبر ایک چینی جوڑا بوس و کنار کی خواہش پر بند باندھے اپنے جہان میں.. اک دوجے میں گم ہے..

پھر منظر بدلتا ہے تو گھنے درختوں کی اوٹ میں ایک ایسی نشست گاہ ہے جہاں آپ دنیا جہان سے الگ ہو جاتے ہیں۔ نشست گاہ کے ستون تالاب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان کے پانی جیسے سینکڑوں برسوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں..

یہ ایک چینی.. فردوس بر روئے زمیں است.. تھی..

چینی بے شک تاؤ، بدھ، مسلمان یا عیسائی ہوں، ان کی جنت کا تصور یہی تھا.. وہ کسی اور جنت میں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے.. اژدھوں میں لپٹی دیواریں، خاموشی، تالاب میں ڈوبتی شاخیں اور سنہری مچھلیاں.. سرخ ڈھلوان چھتوں کی راہداریاں اور راستے.. کائی زدہ پانی اور کنول.. اور خلوت.. ہمیں است و ہمیں..

تتلی میری حیرت اور بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی..

''اب کہو.'' اس نے مجھے چھیڑا..

''میں کچھ کہنے جوگا رہا ہی نہیں تو کیا کہوں..''

''کچھ تو کہو...''

''ایک تو یہ کہ ان بھید بھرے قدیم سکوت اور مکمل تنہائی میں.. اس کے باوجود کہ یہاں سینکڑوں سیاح موجود ہیں.. پھر بھی مکمل تنہائی میں یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہ تنہائی شنگھائی ایسے پُرشور شہر میں ہے۔''

''اور کچھ؟''

''اور یہ کہ.. ہر در کے پار ایک نیا منظر ایک نئی خلوت ہے جو پیچھے رہ جانے والے منظر سے سراسر مختلف ہے اور عجیب ہوش ربا اور گنگ کر دینے والا ماحول ہے تو جس چینی تاجر

نے یہ ''گھر'' تعمیر کیا تھا، اس نے اسے صرف ایک بیوی کے لیے تو نہیں بنایا تھا.. ایک بیوی کے لیے تو صرف ایک منظر ہی کافی ہوتا ہے.. یوگارڈن کے چالیس مختلف رخوں کے لیے چالیس مہ رخوں کی ضرورت ہے۔''

''تو کیا تم اپنی پوری زندگی کھنگال کر اس میں سے ایسے چالیس مہ رخ تلاش نہیں کر سکتے جن کے لیے تم ان چالیس مختلف مناظر کی مکمل خلوت کی خواہش کر سکو؟''

''میں اپنی زندگی کھنگالتا ہوں تو وہاں کچھ بھی حسب آرزو نہیں ملتا..''

''کوئی ایک عشقِ خاص؟''

''تتلی.. ایک عشقِ خاص کے لیے.. اگر وہ تمہارے نصیب میں ہو تو.. اتنے بڑے کامپلیکس کی ضرورت نہیں ہوتی..''

''تم کچھ پوشیدہ کر رہے ہو.. اس یُوگارڈن کے منظروں کی طرح..''

''نہیں.. میرا جھوٹ، سچ اور نفرت اور محبت سب کچھ عیاں ہوتا ہے.. اور میں اس کی قیمت بھی ادا کرتا ہوں..''

''تو پھر اس عشقِ خاص کے لیے.. اگر وہ تمہارے نصیب میں ہو.. کیا ضرورت ہوتی ہے؟''

''ایک ڈھلوان چھت والی سرخ رنگ کی بارہ دری کی.. صرف ایک سنہری مچھلی کی.. ایک اژدھے کے مجسمے کی.. بیدِ مجنوں کی ایک پانی میں ڈوبی ہوئی شاخ کی.. اور اس کی سوہنی شکل کی.. بس!''

یوگارڈن میں ہر کوئی بے قرار اور بے چین پھرتا تھا..

خواہش کرتا تھا کہ کاش ان چالیس مختلف مناظر میں صرف ایک ہی میری قسمت میں ہوتا تو میں کتنا خوش بخت ہوتا..

یہاں تک کہ حسرت ناک کو بھی ڈپریشن ہو گیا تھا اور وہ معمول سے زیادہ خود کلامی میں مگن تھا.. کمال ہے.. دنیا میں ایسے گھر بھی ہیں.. ایسے گہرے سبز تالاب.. سیاہ اژدھے اور سنہری مچھلیاں بھی ہیں اور ہم لاہور کے اچھرے میں رہتے ہیں تو کیوں رہتے

ہیں.. پتہ نہیں کیوں رہتے ہیں..

ہم ہوٹل ایکوٹوریئل میں واپس آ چکے تھے..

تتلی آج اپنی بھرپور آوارہ گردی کے باوجود ابھی تک تازہ دم اور چلبلی تھی اور میرے کمرے کی آرائش کی ہر شے پر پھڑ پھڑاتی بیٹھتی اور فوراً اڑ جاتی تھی. کبھی اس گلدان پر.. کبھی اس گلاس پر.. کبھی ٹیلی ویژن کے ریموٹ کنٹرول پر اور کبھی کھڑکی کے اس شیشے پر جس کے پار شنگھائی کی روشنیاں تھیں اور عمارتیں زرافوں کی مانند گردن اٹھائے میرے کمرے میں جھانکتی تھیں... وہ اپنی ثقافت کے غلبے پر بے حد پُرمسرت تھی۔ ''اب کہو.. ہمارا یوگارڈن.. تمہارے شالیمار سے کہیں بڑھ کر دلربا اور ہوش ربا نہیں ہے..''

''نہیں ہے..'' میں نے چڑ کر کہا..

''لیکن کیوں؟'' تتلی کے پروں میں شرارت پُھل جھڑیوں کی مانند چھوٹتی تھی..

''اس لیے کہ تمہارے اس یُوگارڈن کا ماحول ایسا ہے کہ وہاں چالیس منظر یکے بعد دیگرے کھلتے جاتے ہیں اور ان کے لیے جو چالیس مہ رخ درکار ہیں، وہ ظاہر ہے تمہاری چینی ثقافت اور خوبصورتی کے معیار کے مطابق سب کی سب چپٹی ناکوں والی یعنی چھینی ہوں گی.. اور ہم اہلِ گجرات کا معیار ناکوں کے حوالے سے کچھ مختلف ہے.. ہم اگر سکندر یونانی وہاں سے نہ بھی گزرتا، اپنا پسندیدہ گھوڑا پھالیے میں نہ بھی دفن کرتا تو بھی تیکھی ناکیں رکھتے اور انہی کو حسن کا آخری معیار گردانتے.. شالیمار یکدم تمہاری نظروں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے.. یوگارڈن کی مانند اپنے آپ کو پردہ پوش نہیں رکھتا.. اور وہاں ایک تیکھی ناک اور نشیلی آنکھوں والا مہ رخ ہی سجتا ہے.. ادھر تم لوگوں کی ناکیں چپٹی ہیں اور ذرا مسکراتے ہو تو آنکھیں معدوم ہو جاتی ہیں.. اس لیے مجھے تنگ نہ کرو اور سونے دو۔''

''ویسے ادھر چین میں جس کی ناک ستواں ہو اور آنکھیں بڑی ہوں، اسے ہم گنوار ذات کا گردانتے ہیں۔''

''اپنے اپنے معیارِ حسن ہیں تتلی.. مجھے سونے دو۔''

''ویسے تم کچھ چھپا گئے ہو۔'' تتلی کی آنکھیں کوری تھیں اور وہ ہرگز سونے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ''تم نے مجھے اپنے عشقِ خاص کے بارے میں نہیں بتایا.. گول کر گئے ہو..''

''نہیں.. میں نے کچھ بھی نہیں چھپایا.. لیکن سنا ہے کہ عشقِ خاص ایک وہم ہوتا ہے.. ایک ناقابلِ حصول جھیل ہوتی ہے۔ ایک زرد پیرہن شہزادی ہوتی ہے جس کے دامن کو چھونے کی آرزو میں تم خاک ہو جاتے ہو.. ایک واہمہ ہوتا ہے تو میں تمہیں کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں..''

''سویٹ ڈریمز ان شنگھائی.. اب ہانگ چُو میں ملاقات ہو گی..''

''کہاں؟''

''یہ شنگھائی میں تمہاری آخری رات ہے.. کل ہانگ چُو کے لیے روانگی ہے..''

''ہانگ... بھئی یہ کہاں ہے؟''

''جہاں پیکنگ کی ایک تتلی تمہاری منتظر ہے.. سویٹ ڈریمز ان شنگھائی..''

''یہ ہانگ چُو کیا بلا ہے؟.. پَو چوِای کے دُھند کے پرندے''

سبز رنگ کے پانی کی ایک بوند...شہر کے شور، عمارتوں، ٹریفک کے ہجوم، لوگوں کی بھیڑ..شاہراہ کے گرد بلند ہونے والے درختوں کے پتوں کے درمیان میں سے کہیں یکدم نمودار ہوئی جیسے ابھی ابھی وجود میں آئی ہو..اور پھر یہ بوند پھیلتی گئی اور اس نے عمارتوں، درختوں اور شہر کے شور کو پرے دھکیل دیا اور ہر شے پر حاوی ہو کر اتنی بڑی ہوتی ہو گئی کہ ایک جھیل میں بدل گئی جس کے پس منظر میں ہریاول سے ڈھکی چینی مصوری کی شباہتوں ایسی پہاڑیاں اور سرسبز جزیرے تھے اور ان پر گرمی کی دھند معلق تھی جو منظر کو دھندلاتی تھی...

وسیع جھیل کے پانیوں میں سے کہیں کہیں پگوڈا نما کائی زدہ پتھریلے ستون نمودار ہو رہے تھے اور ان کے آس پاس قدیم طرز کی کشتیاں آہستگی سے تیرتی تھیں اور ان میں لوگ تھے...میں نے کوچ کی کھڑکی سے نظر نہیں ہٹائی..جان بوجھ کر بُت بنا اس جھیل کے آبی سحر کو دیکھتا رہا کیونکہ میں اپنے بائیں کندھے پر بیٹھی تتلی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا..

بے شک ایک تتلی کا کوئی بوجھ نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود میں جانتا تھا کہ وہ میرے بائیں کندھے پر براجمان ہے کیونکہ وہ اپنے پر بھاری پلکوں کی مانند جھپکتی تھی اور میری ٹی شرٹ کے کپڑے پر ایک نامعلوم سی لرزش کا احساس ہوتا تھا..

''شنگھائی میں تم نے پوچھا تھا کہ یہ ہانگ چُو کیا ہے..تو یہ ہانگ چُو ہے..تم نے پوچھا تھا کہ یہ ہانگ چُو کیا بلا ہے..تو یہ بلا ہے..''

''ہاں..میں جان گیا ہوں کہ ہانگ چُو ایک بلا ہے..بلکہ اس میں ایک بلا ہے جو یہ جھیل ہے..اور جھیلیں وہ بلائیں ہوتی ہیں جو ہمیشہ مجھے بلاتی ہیں اور مجھے نگل لیتی ہیں، فنا کر دیتی ہیں..میں ان کے پانیوں میں اتر کر اپنا وجود کھو بیٹھتا ہوں..''

''ہانگ چُو کی جھیل ایسی ہے کہ اس میں بہت سوں نے اپنا وجود کھویا اور ان میں چین کا عظیم کلاسیکی شاعر پو چوای بھی تھا جو 822ء میں یہاں کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ گورنری کے دوران اس شاعر کی زندگی اتنی سادہ تھی اور عوام کے ساتھ اس کا رویہ اتنا مشفقانہ تھا کہ جب وہ یہاں سے رخصت ہوا تو لوگ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکتے تھے اور دھاڑیں مار مار کر روتے تھے..''

''ہاں..میں جہاں تمہارے لی پَو اور طوفو اور ہان شان کا مداح ہوں، وہاں میں پو چوای کی شاعرانہ عظمت سے بھی متاثر ہوں..اس کی نظمیں ''ایک پردیسی ہنس کو رہا کرنے پر..'' ''خواب''..''اس صندوق پر جس میں شاعر کی نگارشات ہیں''..''اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کے نام ایک پاگل نظم..'' ''سرخ کاکاتوا'' وغیرہ میں درجنوں بار پڑھ چکا ہوں اور وہ مجھے ہمیشہ ایک انجانی مسرت سے دوچار کرتی ہیں جو ہماری شاعری میں کم ہے..لیکن اس کی دو نظمیں ایسی ہیں جو بے مثل ہیں..''سنہری گھنٹیاں'' اور ''سنہری گھنٹیوں کی یاد میں''..

''اوہو..''

''کیا اوہو...''

''میں کچھ حسد محسوس کر رہی ہوں..''

''کیوں؟''

''تم اگر میرے لی پَو کی نسبت پو چوای کے زیادہ مداح ہو تو مجھے حسد تو ہو گا..''

''ایسا نہیں ہے تتلی..انسانی احساسات کی لاتعداد مختلف جھیلیں ہوتی ہیں۔ سوگواری، اداسی، سرخوشی، فنا اور محبت کی..اور ان سب میں صرف کسی ایک شاعر کی شاعری کی کشتیاں نہیں تیر سکتیں..ہر جھیل کے لیے ایک الگ شاعر ہوتا ہے جو اس کے پانیوں کی زبان سمجھ سکتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے....جہاں میر کا نازک کلام اثر کرتا ہے، وہاں غالب

بے اثر ہو جاتا ہے..جس جھیل میں غالبؔ کی کشتی تیرتی ہے وہاں دیگر شعراء کی ناؤ ڈوب جاتی ہے..عدمؔ کا اپنا خمار ہے اور منیرؔ نیازی کا مرنے کا شوق الگ ہے..فیضؔ اپنے دشت تنہائی میں جدا ہے اور مجید امجد کی برف کہیں اور گرتی ہے..''

''تم چین میں ہو..تو چین کی بات کرو۔''

''کرتا ہوں..لیکن صرف ایک شاعر ہے جس کی کشتی جس جھیل میں بھی اترے..تیرتی ہے..رواں رہتی ہے..اور وہ بلھے شاہ ہے۔''

''تم چین کی بات کرو..''

''تو تلی اس طرح مجھ پر بھی تمہارے چین میں..ہر شاعر جدا جدا کیفیتوں میں..میرا من پسند ہو جاتا ہے..یوں بھی آپ جب کسی ایسے شہر میں داخل ہوتے ہو جو کسی ایک شاعر کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے تو تم اسی کو یاد کرتے ہو..بے شک یہ شہر گجرات ہو اور شاعر امام دین ہو..اس لیے میں اگر ہانگ چو میں پو چوای کو یاد کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں..اس میں حسد کی آگ بھڑکانے کا تو کوئی جواز نہیں۔''

''صحیح..''تلی مان گئی..''یہ درست ہے کہ ہانگ چو میں صرف پو چوای یاد آتا ہے اور اس کے کچھ مصرعے یاد آتے ہیں..''

''تم سناؤ..میرے پاس نہ تو اچھی یادداشت ہے اور نہ چینی زبان..''

''تو سنو... ہانگ چو... پو چوای کی شاعری کے بغیر کچھ بھی نہیں..سنو..

- شراب کے بخارات لمبے راستے کو مختصر کر دیتے ہیں
پروں والا گھوڑا ہوتا ہے اس شخص کا..
جو موسم بہار کے کسی دن کو
اس پر سوار ہو کر گھر جانے والی سڑک پر سفر کرتا ہے
لیکن سب سے زیادہ مجھے چاہت ہے کھڑکی کے پاس لیٹنے کی..
تاکہ میں بانس کے پودوں کی شاخوں میں سرسراتی بادِ خزاں کی آواز سن سکوں..

- جب پودے کو ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگایا جائے اور
اس پر پانی چھڑکیں اور جڑوں کو مٹی سے ڈھانپ دیں..
تو ان کا حسن ضائع نہیں ہوگا..

- جب سحر ہوئی، میں نے خواب دیکھا کہ میں نے تمہارا ہاتھ تھاما ہوا ہے..
اور تم سے پوچھتا ہوں کہ بتاؤ تم کیا سوچتی ہو..
اور تم نے کہا ''مجھے شدت سے تمہاری یاد آتی ہے''
لیکن..یہاں ایسا کوئی نہیں جسے خط دے کر تمہارے پاس بھیجوں

- میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں، وقت اڑا جا رہا ہے اور میری مختصر زندگی..
ختم ہو رہی ہے..

- جھیل اتنی پھیل گئی ہے کہ اس نے تقریباً افق پر آسمان کو جا چھوا ہے..
بادل یوں اتر آئے ہیں کہ پانی کے چہرے کو چھونے لگے ہیں
دُھند کے پرندے زرد ہوا میں گم ہو گئے ہیں

''یہ پو چوای کافی نہیں ہو گیا؟'' میں نے ایک جمائی لے کر کہا..

''نہیں..''تلی بھڑ گئی۔''عجیب بے بہرا شخص ہو..ہانگ چو میں ہو اور پو چوای کے لازوال مصرعے سنتے ہوئے گنواروں کی مانند جمائیاں لینے لگے ہو..اب تم جو بھی کہو، میں تمہیں اس کی ایک مختصر نظم ضرور سناؤں گی جو اس نے لاؤ چو کے بارے میں لکھی تھی اور لاؤ چو کے ماننے والوں نے بہت برا مانا تھا..لاؤ چو کا سب سے مشہور قول ہے اور تم نے بھی کہیں اس کا حوالہ دیا ہے کہ جو بولتے ہیں، کچھ نہیں جانتے..اور جو جانتے ہیں وہ بولتے نہیں..تو پو چوای نے کہا..اور یاد رہے آج سے بارہ سو برس پیشتر کہا..

"جو بولتے ہیں، کچھ نہیں جانتے
اور جو جانتے ہیں، وہ بولتے نہیں''
یہ الفاظ میں نے سنا ہے،
لاؤ چو نے کہے تھے..
اگر ہمیں یہ یقین کرنا ہو کہ لاؤ چو
خود ایسا شخص تھا جو جانتا تھا..
تو پھر یہ کیا ہے کہ اس نے..
پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے؟..

''تتلی... کیا اب اجازت ہے کہ میرے سامنے جو جھیل ہے' اُس پر ایک اور نظر ڈال لوں..''

''یہی تو وہ جھیل ہے جس کے بارے میں اس نے یہ لکھا تھا کہ جھیل اتنی پھیل گئی ہے کہ اس نے تقریباً افق پر آسمان کو جا چھوا ہے..''

''ہاں.. اور میں دیکھ سکتا ہوں کہ بادل یوں اترے ہوئے ہیں کہ پانی کے چہرے کو چھونے لگے ہیں.. لیکن تتلی دھند کے وہ پرندے کہاں ہیں جو زرد ہوا میں گم ہو گئے ہیں..''

''دھند کے پرندوں کو دیکھنے کے لیے پوچوای ہونا ضروری ہے جو کہ تم نہیں ہو۔''

ہانگ چُو میرے لیے ایک ایسی نا معلوم کوہستانی خیمہ گاہ تھی جس کی جانب سفر کرتے ہوئے.. پُرخطر اور جان لیوا راستوں پر.. تھکاوٹ سے ٹوٹتے اور چکنا چور ہوتے بدن کے ساتھ قطعی طور پر یہ علم نہیں ہوتا کہ آج کی شب ہم کہاں خیمہ زن ہوں گے.. پتھروں کی دنیا میں.. کسی ہیبت ناک تنہائی کے ویرانے میں.. یا وہاں کوئی گاڑھے رنگوں کا سبزے میں بھیگا ہوا.. ایسا سبزہ زار ہو گا جس کی ہریالی میں برفانی نالیوں کے پانی سرسراہٹوں کی موسیقی سے ہم آہنگ ہو کر بہتے ہوں گے اور آس پاس کے بلند پہاڑوں میں سے خاموش آبشاریں گرتی ہوں گی..

یہ نا معلوم کا جوا تھا..

اور میں ہمیشہ سے اسی نا معلوم پر داؤ لگانے والا جواری رہا تھا..

اپنا وقار.. گھر کی سہولت.. بچوں کی محبت اور جعلی شہرت کو داؤ پر لگا دیتا تھا.. اکثر ہار جاتا تھا.. لیکن کبھی کبھار.. جیت بھی جاتا تھا..

اس کبھی کبھار جیت کے لالچ میں.. میں سب کچھ داؤ پر لگا دیتا تھا..

کبھی کبھار کی اس جیت میں.. میں نے وہ کچھ جیتا تھا جو کسی کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا..

میں نے شاہ گوری، جھیل کرومبر اور سنو لیک کو جیت لیا تھا..

اور اس جھیل کو دیکھتے ہوئے.... جو افق پر آسمان کو جا چھو رہی تھی اور بادل پانی کو چھو رہے تھے.. میں نے جانا کہ میں نا معلوم کا یہ جوا پھر جیت گیا تھا جو ہانگ چو کی جھیل کی صورت میں میری کوچ کی کھڑکی میں سے گزر رہا تھا..

ہانگ چُو کا حُسن البتہ گرم مرطوب تھا.. ہوا ٹھہری ہوئی تھی اور اہل ہانگ چُو لُو کی دعا مانگنے والوں میں سے تھے.. گرمی زوروں پر تھی..

''ویسے تارڑ...''

''کون؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''میں اور کون..'' تتلی تھی..

''تمہیں آج کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے منہ اس کی جانب کیا کیونکہ وہ میرے کندھے پر بیٹھی تھی اور پھر جان بوجھ کر ایک گہرا سانس کھینچ کر پھر اسے لبوں کے راستے اس کے پروں پر ایک جھونکے کی صورت چھوڑا..

''نہ کرو۔'' وہ تلملا اٹھی۔ ''تمہارے سانس ہانگ چُو کی گرمی سے دو آتشہ ہو گیا ہے۔ میرے پروں کو جلا کر راکھ کر دے گا.. نہ کرو.. ویسے مجھے آج کیا ہو گیا ہے؟''

''تم نے اس مسافت کے دوران پہلی بار میرا نام لیا ہے..''

تتلی ہنسی..'' ہاں.. تم تو جانتے ہو کہ محبوب کے لبوں سے اپنا نام سننے کی آرزو کتنی

شدید ہوتی ہے..ظاہر ہے میں تمہاری محبوب تو نہیں لیکن صرف محبوبیت کا اظہار کر رہی تھی کیونکہ یہ ہانگ ژو کے موسم ہیں جو مجھ پر اثر کرتے ہیں..یہ موسم محبت کے ہیں۔''

''تھینک یو تتلی..میں تمہاری محبوب توجہ کا شکر گزار ہوں اور میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک خاص ترنگ میں کیوں ہوں تو..یہ ہانگ ژو ہے..اچھا تو میں تمہیں لی پُو کے چند مصرعے سناتا ہوں..سناؤں؟''

''نہیں..پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو..ہانگ ژو کی جھیل کو دیکھتے ہی تم پر لی پَو اور تو چو ای کے مصرعے اترنے لگتے ہیں تو اس کا کیا جواز ہے؟''

''ہانگ چو..''

''نہیں..سنہری وانگ لی..''تتلی پھر پھڑ پھڑائی اور ہنسی..''تم مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے..یاد ہے ہم دونوں تقریباً ایک ہی وجود ہیں...وہ تمہیں بہت اچھی لگتی تھی..کیوں؟''

''دیکھو تتلی..ہر شخص کے دو بُت تخلیق ہوتے ہیں..دونوں میں ایک ہی روح تیرتی ہے..ایک پر زمانہ اور موسم گزرتے ہیں یہاں تک کہ اعضاء میں اعتدال نہیں رہتا..ماس ڈھلکنے لگتا ہے۔دانت جھڑنے کو آتے ہیں،نظر دھندلانے لگتی ہے اور اٹھنے بیٹھنے میں دِقت ہونے لگتی ہے تو وہ بُت چینی شاعروں کی مانند شہر سے دور ایک جھونپڑے میں تنہائی کا آرزو مند ہوتا ہے۔ایک ندی..ندی کے پار بانسوں کا جنگل..اور اس میں سے آنے والی خنک ہوا...وہ اپنی قمیض کا اوپر والا بٹن کھول کر لیٹا رہنا چاہتا ہے..عام دیکھنے والے ایک تھکے ہوئے بوڑھے شخص کو دیکھتے ہیں..لیکن یہ جو دوسرا بُت ہوتا ہے ناں،اس پر نہ زمانے نے اثر کیا ہوتا ہے اور نہ برسوں کے گزرنے نے..اس میں جوانی کا خمار اور خون کی حدّت جوں کی توں قائم رہتی ہے..نہ اس کا ماس ڈھلکتا ہے اور نہ ہی نظر دھندلاتی ہے۔اس کی مٹی عمر سے راکھ نہیں ہوتی بلکہ اس کے ہر ذرّے میں سے شرارے پھوٹتے رہتے ہیں..تو میرا یہ دوسرا بُت تھا جس نے سنہری وانگ لی کو دیکھا تو وہ اس کو اچھی لگی..''

''تمہارے وفد کے تمام اراکین کے بھی دوسرے بُت آج ظاہر ہو گئے ہیں۔تم

نے دیکھا تھا کہ وہ سنہری وانگ لی کو کیسے دیکھ رہے تھے؟''

''جیسے میں دیکھ رہا تھا..''

''اور وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی تھی..''

''اس لیے کہ ہم سب میں سے کوئی ایک بھی دیکھے جانے کے لائق نہیں رہا..''

اور یہ سنہری وانگ لی کون تھی؟

وہی جس کے بارے میں پچھلی شب..شنگھائی میں..تتلی نے کہا تھا کہ ہانگ ژو...وہی ہے جہاں پیکنگ کی تتلی رہتی ہے..

ہم ہوائی جہازوں کے ہوائی سفروں سے تنگ آ چکے تھے..

اسلام آباد سے بیجنگ..بیجنگ سے شی آن..شی آن سے شنگھائی..تو جب ہم نے اپنے شیڈول میں ''فرام شنگھائی ٹو ہانگ چو بائی ٹرین'' پڑھا تو خوش ہو گئے۔ہم آسمان سے زمین پر آ گئے تو گویا اپنے آپ میں آ گئے۔

شنگھائی کے ریلوے سٹیشن پر ابھی باہر شہر میں جو جدید تبدیلیاں آ رہی تھیں،ان کا اثر نہیں ہوا تھا اور وہاں وہی افراتفری تھی اور ابتری تھی جو خانیوال جنکشن یا میر پور ماتھیلو میں ہوتی ہے۔سوائے اس فرق کے کہ..درجنوں پلیٹ فارموں سے چلنے والی ٹرینیں عین وقت پر روانہ ہوتی جاتی تھیں..

ہماری ٹرین نے شنگھائی شہر سے باہر آنے میں ہی ایک مدت گزار دی..اور جب خدا خدا کر کے باہر آئی تو آس پاس کھیتوں،نہروں اور کئی منزلہ فلیٹوں کی اُنہی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو ہم نے قزہانگ کاؤنٹی میں ملاحظہ کیے تھے..

کھیتوں کے ہموار سرسبز میدانوں میں نہروں کا ایک سلسلہ تھا..یہ نہریں نہر اپر جہلم یا لوئر چناب قسم کی دریا نما اونچے کناروں اور کناروں پر شیشم کے درختوں کی قطاروں والی نہریں نہ تھیں بلکہ قدرتی سی سُست رو پانیوں والی نہریں تھیں جن میں دبلی اور نوکیلی اٹھان والی قدیم چینی کشتیوں کو بانسی ہیٹ پہنے دہقان لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے کھے رہے

تھے..چینی دہقان کی یہ پہلی قدیم تصویر تھی جو ہمارے سامنے آئی..ان کشتیوں میں سبزیاں، پھل اور گھریلو استعمال کی اشیاء تھیں جو دہقان اپنے ''گاؤں'' میں لے جا رہے تھے..

''یہ کونسا علاقہ ہے جس میں سے ہم گزر رہے ہیں؟'' میں نے لیو سے دریافت کیا..

''یہ چینی گاؤں ہیں..'' وہ شرارت سے مسکرایا۔''میں جانتا ہوں کہ کل آپ لوگ اس شک میں مبتلا تھے اور اس کا اظہار کر رہے تھے کہ ہم نے آپ کو متاثر کرنے کے لیے ایک خصوصی گاؤں کا بندوبست کیا ہے جو عام چینی گاؤں کی نمائندگی نہیں کرتا..تو ذرا دیکھئے کہ ہم نے کتنا وسیع بندوبست کیا ہے کہ ابھی تک ویسے گاؤں ہی جاری ہیں..''

حسرت ناک اب بھی ایمان نہیں لایا تھا۔''بھئی یہ شنگھائی تو چین کا متمول ترین علاقہ ہے اور اسی لیے یہ چینی ہمیں صرف اِدھر لے کر آتے ہیں ورنہ میں نے سنا ہے کہ اوپر شمال میں تو بہت غربت ہے۔''

اوپر شمال میں یقیناً غربت ہوگی لیکن یہاں تو دور دور تک اس کے کوئی آثار نہ تھے..شنگھائی سے ہانگ چُو تک کا سفر ایک پکنک کی طرح تھا.... پُرلطف اور آرام دہ..

ویسے یہاں بھی..ٹرین میں بھی..چینی مسافروں اور خاندانوں نے ہم غیر ملکیوں کو زیادہ توجہ کے قابل نہ سمجھا اور اپنی تہذیب اور ثقافت میں ہی یکسر مگن رہے..یعنی آپس میں چہلیں کرتے رہے اور چینی میں کرتے رہے..چائے پیتے رہے اور سگریٹ پیتے رہے..نہ صرف یہ کہ چینی برادران دنیا میں چائے نوشی میں اول نمبر ہیں بلکہ سگریٹ نوشی میں بھی سب سے آگے ہیں..ان کے بیشتر لیڈران کرام برسرِ عام دھوئیں کے مرغولے اڑاتے نظر آتے ہیں اور ایک چینی لیڈر تب تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کی انگلیوں میں پھنسے سگریٹ کی راکھ قالین پر گرنے کو نہ ہو..بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہم سفر چینی حسبِ روایت زیادہ فرینڈلی نہیں تھے..

ٹرین یکدم ہانگ چُو سٹیشن پر رکی اور پھر یکدم چل دی..ہم نے بھی ہراساں ہو کر یکدم پہلے اپنا اپنا سامان پلیٹ فارم پر پھینکا اور اس کے پیچھے چھلانگیں لگا دیں..جب ہمارے وفد کا آخری رکن پلیٹ فارم پر لینڈ کر رہا تھا، اس لمحے ٹرین نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی..

ہانگ چُو کا پلیٹ فارم بھی کالا شاہ کاکو کے پلیٹ فارم کی طرح تھا..میرا خیال ہے ویسا بھی نہیں تھا..انگریز سرکار کو یہ کریڈٹ تو بہرطور جاتا ہے کہ جو نہریں اس نے کھود دیں ان میں آج بھی پانی رواں ہے اور جو ریلوے سٹیشن بنائے وہ آج بھی قائم ہیں..اور پلیٹ فارم تو ان کا عشق تھے..ساہیوال شہر اتنا بڑا نہیں ہے جتنا طویل اور خوش نظر اس کے ریلوے سٹیشن کا پلیٹ فارم ہے..

جونہی ہمارے حواس بحال ہوئے..ہم کپڑے جھاڑتے ہوئے پلیٹ فارم سے اٹھے..اپنا اپنا سامان تلاش کر کے اسے سائیکل ریڑھیوں پر لادنے لگے تو سفید ریش شاعر نے آہ و زاری شروع کر دی کہ صاحبو..میرا وہ رُک سیک غائب ہے جو شی آن میں مقیم پاکستانی طالب علموں نے مجھے نہایت سستے داموں خرید کر دیا تھا اور اس میں تو میرے بچوں اور دوستوں کے لیے جو تحائف تھے، وہ پیک تھے..

یہاں ایک عجیب اور افسوس ناک سلسلہ یہ تھا کہ شنگھائی کے ریلوے سٹیشن پر صرف سفید ریش تھا جس نے اپنی مددگار خصلت سے مجبور ہو کر وفد کے تمام اراکین کا سامان خود ٹرین میں رکھوایا تھا اور اس دوران انہیں اس سامان کو ہاتھ تک لگانے نہیں دیا تھا..اور اس کا رُک سیک غائب تھا..

فوراً ہی لیل پوری نے بھی الارم سگنل آن کر دیا اور دوہائی دینے لگا کہ میرا دیگر سامان تو موجود ہے لیکن میرا بھی وہ رُک سیک جو شی آن میں پاکستانی طالب علموں نے مجھے سستے داموں خرید کر دیا تھا..غائب ہے..اور اس میں تو چینی وال ہینگنگ بھی تھیں..اب میں اپنے گھر کی دیواروں پر کیا ہینگ کروں گا..

اب یہ طے نہیں ہو رہا تھا کہ یہ رُک سیک شنگھائی کے ہوٹل سے ہی نہیں لائے گئے تھے یا ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم سے اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں..

اس خواہ مخواہ کی بدمزگی اور گمشدگی نے ہم سب کو بے حد رنجیدہ کر دیا..

پھٹیچر سی سائیکل ریڑھیوں پر لدے سامان کو کھینچنے والے چینی پورٹر بے حد ناتواں تھے اور مشکل سے برادر ملک پاکستان کا بوجھ کھینچ رہے تھے..

ہم ہانگ چُو ریلوے سٹیشن سے باہر آ گئے..

اور باہر وانگ لی تھی..

ایک وانگ لی تو ہمارے پاس پہلے سے موجود تھی.. پائیدار اور بیجنگ سے یہاں تک ہمارا ساتھ دینے والی..دوسری یہ تھی..اور ان دونوں کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ سبحان تیری قدرت..تو کیسے ہر وانگ لی کو اتنا جدا جدا بناتا ہے..

میرا خیال ہے کہ میں اس وانگ لی کو..جسے اس کی دمکتی ہوئی رنگت اور روپہلی چہرے کی بنا پر سنہری وانگ لی کہا گیا..اس حیرت اور مسرت بھرے غبار کے حوالے سے بیان نہیں کر پایا جو اس کی پہلی جھلک پر ہم سب کے کہولت زدہ بدنوں میں سے شمپئن کے بلبلوں کی طرح اٹھا تھا..اِن بلبلوں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ نوجوانی میں اٹھیں تو تادیر اس سفید یا گلابی انگوروں کی شراب کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں اور ہر بلبلے میں خمار اور غبار کی کیفیت ایسے پوشیدہ ہوتی ہے جیسے سیپی میں موتی....اور اگر یہ بلبلے، عمر رسیدہ حالت میں..جو کہ ہماری تھی..کہ جیسی میری حالت اب ہے کبھی ایسی تو نہ تھی..تو اس حالت زار میں اٹھیں..اگر اٹھیں..تو فوراً ہی یا تو بیٹھ جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک پٹاخہ سا چھوڑ کر معدوم ہو جاتے ہیں..

بہر طور یہ بھی غنیمت تھا کہ یہ بلبلے..مدتوں سے خفتہ بلبلے دورہ چین میں کہیں اٹھے تو سہی..

تو جناب ہم ناتواں چینی پورٹروں کے ہاتھوں سے دھکیلی جانے والی سائیکل ریڑھیوں پر لدے سامان کو نظر میں رکھے جب ہانگ چو کے سٹیشن سے باہر آئے ہیں تو باہر وانگ لی تھی..

ہماری پائیدار منگول آنکھوں والی وانگ لی نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ بھی وانگ لی ہیں..چینی حکومت کے محکمہ خارجہ کے فلاں میزبانی کے شعبے سے متعلق ہیں اور ہانگ چو میں ہماری میزبان اور راہبری کے فرائض سرانجام دیں گی...مزید یہ کہ موصوفہ صرف چینی بولتی ہیں اور انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتیں..یہاں تک کہ No بھی نہیں

کہہ سکتیں..چنانچہ بزرگانِ دین نے اس ہانگ چُوئی میزبان سے فرینڈلی ہونے کے لیے انگریزی کے جو فقرے بڑے تردد سے جوڑ رکھے تھے، وہ بس لبوں پر ہی رہ گئے..

یہ سنہری وانگ لی..ایک بوٹے سے قد کی خاتون تھیں..اور بوٹا بھی متناسب طور پر گھنا اور اتنا دیدہ زیب کہ اس نوعیت کا بوٹا اس سے پیشتر ہم نے چین بھر میں نہ دیکھا تھا..اس نے ہمیں دیکھا تھا..یعنی کھنڈروں اور شکستگی سے دو چار چہروں کو دیکھا تھا اور فتح کر لیا تھا..

ہم اس کے سامنے ٹیرا کوٹا سولجرز کی مانند بُت بنے کھڑے تھے..ہم ایسے اس کے محکوم ہو گئے تھے..اس کی مسکراہٹ کا لشکارا ہر ایک کو گھائل کرتا تھا..وہ مسلسل مسکراتی ہمیں ہانگ چو کے قیام کے بارے میں بتاتی..پورٹروں کو ہدایات دیتی..اپنے پنجوں پر گھومتی اتنی پھرتیلی تھی کہ چابی والی گڑیا لگتی تھی..یہی تتلی پیکنے کی تھی..

شاید ہمارے چندھیا جانے کی ایک وجہ شی آن کی قہر آلود آسمانی آفت کے بعد اس سنہری آفت کو اپنے سامنے پانا تھا لیکن نہیں..اس خاتون کی ایک ایسی موجودگی تھی جس میں حسن کا تکبر کہیں نہ تھا..ایک بے ساختہ سادگی تھی جس کے سامنے ہر کسی کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دے..

مجھے اپنی دائمی اور پائیدار وانگ لی پر بڑا ترس آیا..وہ اگرچہ پہلے سے ہی قدرے بجھی ہوئی سی تھی لیکن اس وانگ لی کی جگمگاہٹ کے سامنے وہ بالکل ہی ماند پڑ گئی تھی..نظر ہی نہیں آتی تھی..اور اس نے بھی اراکین کی اضطراری حالت کا اندازہ کر لیا اور فوری طور پر یہ اطلاع ہم پہنچا دی کہ یہ وانگ لی جس پر آپ سب ریشہ خطمی ہو رہے ہیں، شادی شدہ ہے بلکہ ایک بیٹے کی ماں بھی ہے..لیکن اس کے باوجود اس کے چمکیلے پن میں کوئی نمایاں کمی واقع نہ ہوئی..

ہم کوچ میں سوار ہوئے..بلکہ سوار کر دیئے گئے..

سفید ریش اور لیل پوری اپنے گمشدہ رُک سیکوں کو فراموش کر چکے تھے..

ریلوے سٹیشن چونکہ شہر کے درمیان میں ہی واقع تھا، اس لیے ہم وہاں سے نکلے تو شہر کی رونق میں براہ راست شامل ہو گئے..

البتہ ہم لیڈر کو نہایت رشک بھری نظروں سے تکتے تھے جو سنہری وانگ لی کے پہلو میں بن سنور کے بیٹھا فرفر چینی بول رہا تھا اور کم از کم سات سانپ تھے جو ہمارے سینوں پر لوٹ رہے تھے.. کیونکہ وفد کے اراکین کی کل تعداد سات تھی..

یہی وہ لمحہ تھا جب شہر کے شور، عمارتوں، ٹریفک کے ہجوم اور درختوں میں سے سبز رنگ کی ایک بوند نمودار ہوئی اور پھر پھیلتی چلی گئی..

ہانگ چُو جھیل نمودار ہوئی..

اور ہم سنہری وانگ لی سے غافل ہو گئے کہ اس کے اور ہمارے درمیان برسوں کا ایک وسیع سمندر تھا. لیکن یہاں جھیل کی صورت میں ایک ایسی حسینہ دکھائی دے رہی تھی جس کو ہم اپنی آنکھوں سے اسیر کر کے اپنا بنا سکتے تھے..

''یہ سُنہری وانگ لی کیا بلا ہے.. کھڑکی میں جھیل ہانگ چُو جو میرے لیے نہیں تھی''

ہانگ چُو جھیل نمودار ہوئی...

ہماری کوچ نے جھیل سے منہ موڑ کر ایک نسبتاً ویران شاہراہ کا رخ کر لیا جس کے آخر میں ''ہانگ چُو ہوٹل'' کی عمارت تھی اور اس عمارت کے پورچ میں ہماری کوچ جا رکی.. ایک گہرا سانس لیا اور تھم گئی..

سنہری وانگ لی اپنی کوتاہ قامتی کے باوجود ایک جمناسٹ ایسی پُروقار آہستہ خرامی سے اتری اور بدستور مسکراتی استقبالیہ کاؤنٹر تک چلتی گئی.. ہم چونکہ سفید ریش اور لیل پوری کے رُک سیکوں کی گمشدگی سے کچھ ہراساں ہو چکے تھے۔ اس لیے ہم نے ہوٹل کے پورٹروں پر قطعی انحصار نہ کیا اور اپنے اپنے سوٹ کیسوں اور بیگوں کے کان کھینچتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ داخل ہوئے تو اسی لمحے ایک چینی دولہا دلہن ہماری جانب چلتے آ رہے تھے.. دولہا میاں نیلے تھری پیس سوٹ میں، کوٹ کے کالر پر ایک گلدستہ نمائش آویزاں کیے اور دولہن سفید لیس کے گاؤن میں.. ان کے پیچھے پیچھے پھول برساتے، غُل مچاتے اور وہ غُل بھی چینی میں ہی مچا رہے تھے جو بہت ہی غُل ہوتا ہے.. ان کے عزیز و اقارب اور دوست اور ان کے بچے.. ہمیں یکدم سامنے پا کر دولہا دولہن ٹھٹک سے گئے کہ یہ براؤن رنگ

کی اجنبی بھیڑیں راستے میں کہاں سے آ گئیں..اور یہ کوئی اچھا شگون نہ تھا کہ آپ اپنی شادی والے دن یکدم اپنے سامنے سات بوکھلائے ہوئے غیر ملکی دیکھ لیں جن میں سے ہر ایک منہ کھولے آپ کو دیکھ رہا ہو..یعنی ایک سفید ریش، ایک لیل پوری، ایک دہقانی، ایک گیسو دراز کا سانولا..اور ایک توندیلے ساٹھویں برس میں قدم رکھتا سابقہ اداکار اور حالیہ ڈبہ پیر قسم کا ادیب..اپنی شادی کے پہلے دن ہی اپنے سامنے دیکھ لینا یقیناً یہ کوئی اچھا شگون نہ تھا..بہر حال ہم نے اپنی دیرینہ وانگ لی سے درخواست کی کہ وہ اس نو بیاہتا جوڑے کو ہماری جانب سے بھی مبارکباد پیش کر دے..چونکہ شگون اچھا نہ تھا، اس لیے قابل فہم طور پر وہ اتنے زیادہ خوش نہ ہوئے بلکہ قدرے رنجیدہ نظر آئے اور ہمیں ایک واجبی سی مسکراہٹ پر ٹرخا کر ہوٹل کے ہال سے نکل کر پورچ میں چلے گئے جہاں ایک سجی سجائی سیاہ رنگ کی کار ان کی منتظر تھی..

استقبالیہ کاؤنٹر پر سنہری وانگ لی ہم سب کا بندوبست کر چکی تھی اور اب چابیوں کا ایک پلندہ تھامے ہماری منتظر تھی..جیسا کہ میں پہلے گوش گزار کر چکا ہوں کہ ہر نئے چینی شہر میں لیو، خاور اور وانگ لی کی اتھارٹی ختم ہو جاتی تھی اور مقامی انتظامیہ ہمیں اپنی تحویل میں لے لیتی تھی..چنانچہ یہاں ہانگ ژو میں سنہری وانگ لی وہ انتظامیہ تھی اور ہم سب دل و جان سے چاہتے تھے کہ وہ فوراً ہمیں اپنی تحویل میں لے لے..کس کو زیادہ تحویل میں لینا ہے اور کس کو کم، اس کا فیصلہ اسی نے کرنا تھا..

کمروں کی چابیاں سینے سے لگائے ہم اس ہوٹل کے جانے کون سے فلور پر پہنچے اور پھر اپنے اپنے کمروں میں سما گئے۔ ہمارے پاس لنچ سے پہلے ایک گھنٹے کی فراغت تھی جس میں ہم اپنی تھکن اتار سکتے تھے....میں نے کمرے میں داخل ہو کر حسب عادت سب سے پہلے باتھ روم کا معائنہ کیا اور اسے تسلی بخش پایا۔ پھر پلنگ کے گدّے پر تھوڑا سا کود کر اسے بھی مناسب پایا اور اس کے بعد حسب عادت کھڑکی کے پردے وا کر کے باہر دیکھا..باہر ہانگ ژو کی کچھ گودام نما عمارتیں اور ایک ویران سی سڑک تھی۔ میں نے اپنی گردن کو بل دے کر دائیں جانب دیکھا کہ شاید جھیل کا کوئی حصہ نظر نواز ہو جائے مگر وہاں

بھی سوائے بے وقعت عمارتوں اور گھروں کے اور کچھ نہ تھا..اور ہانگ ژو کے بارے میں یہی سنا تھا کہ ہانگ ژو..سوائے جھیل کے اور کچھ نہیں..تو جھیل نہیں تھی..وہ یقیناً ہوٹل کے دوسرے چہرے کی جانب تھی اور میرا کمرہ اس کی جانب پشت کیے لاتعلق کھڑا تھا..

میں نے کمرے سے باہر آ کر برآمدے میں جھانکا تو وہاں لیو کو ٹہلتے دیکھا..

''لیو..میرے کمرے سے جھیل نظر نہیں آتی۔''

''میرے کمرے سے بھی نظر نہیں آتی..'' وہ چونکہ اس شہر میں ہمارے لیے ذمہ دار نہیں تھا، اس لیے بے حد اطمینان اور سکون میں تھا..

''بھئی تم تو چینی ہو..یہاں آتے رہتے ہو..تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔''

''اگرچہ میں ایک چینی ہوں لیکن..میں یہاں ایک عرصے کے بعد آیا ہوں..لنچ کے بعد ہم جھیل کی سیر کو جائیں گے تو تم جی بھر کے اسے دیکھ لینا..''

''لیو..کیا یہ ممکن نہیں کہ میرا کمرہ تبدیل ہو سکے..یعنی جس رخ سے جھیل دکھائی دیتی ہے، مجھے وہاں شفٹ کر دیا جائے..''

لیو اس درخواست پر فوراً منظّم ہو گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے استقبالیہ کاؤنٹر پر لے گیا۔ وہاں موجود خاتون سے کچھ تبادلہ خیال کیا اور پھر کہنے لگا۔''آئی ایم سوری..لیکن دوسرے ونگ میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے..آپ اسی کمرے میں گزارہ کر لیں۔''

میں نے اپنے آپ کو بے حد لعن طعن کی کہ میں ابھی تک اس معاملے میں نابالغ تھا..بڑا نہیں ہو سکا تھا کہ کھڑکی سے منظر نظر آنا چاہیے اور میں نے لیو ایسی نیک روح کو خواہ مخواہ زحمت دی تھی..اور اس کی اس شرمندگی کو دیکھا جو میری خواہش کے مطابق کمرہ نہ ملنے پر اس کے چہرے کو سرخ کرتی تھی..میرے چہرے پر بھی شرمندگی کے آثار تھے اور میں لیو کا شکریہ ادا کر کے معذرت کر کے واپس اپنے کمرے میں چلا آیا..چونکہ ابھی لنچ سے پہلے ایک گھنٹے کی مہلت تھی، اس لیے میں نے اپنے آپ کو ایک چُرمُر اور ڈھیلے شلوار کرتے میں آرام دہ کیا اور بستر پر دراز ہو گیا..بلکہ مکمل طور پر دراز تو نہیں ہوا، ابھی نیم دراز پوزیشن سے دراز کی پوزیشن تک جانے کو تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی..یہ ہوٹل کی جانب سے پھلوں کی

خوش آمدیدی ٹوکری تھامے ایک ویٹر ہوسکتا تھا..میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو آنکھیں نہ کھلیں..چندھیا گئیں کہ روشنی اتنی تیز تھی..

باہر سنہری وانگ لی کھڑی تھی اپنے گلابی فراک میں اور حسب معمول اپنے چاند چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ سجائے جسے دیکھنے سے راہ چلتے لوگ کھمبوں سے ٹکرا جاتے ہیں..اب پوزیشن یہ تھی کہ میں اپنے شلوار کرتے کی چُرمراہٹ میں ایک چغد کی صورت کھڑا ہوں اور میرا ازار بند لٹک رہا ہے..میں نے اپنے تئیں نہایت پوشیدگی سے اسے اڑسنے کی کوشش کی لیکن وہ اڑسے جانے سے انکاری ہوکر پھر سے لٹکنے لگا..

سنہری وانگ لی نے ظاہر ہے چینی میں کچھ کہا..

میں نے بھی کچھ کہا..اور ظاہر ہے چینی میں نہیں کہا..کندھے سکیڑے..اپنے خضاب زدہ بال درست کرنے کی کوشش کی..قدرے مسکرایا..

سنہری وانگ لی جو یقیناً اپنے حسن اور آفتابی مسکراہٹ کی اثر انگیزی سے واقف تھی، مجھے نادان اور نروس جان کر میرا ہاتھ تھام لیا اور سر جھٹک کر اشارہ کیا کہ بیوقوف میرے ساتھ آؤ..بیوقوف کے کمرے کے عین سامنے سنہری وانگ لی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا..وہ اسی طور میرا ہاتھ تھامے ہوئے مجھے اندر لے گئی..اور اس لمحے مختلف قسم کی قیامتیں میرے اندر برپا ہوئیں..کچھ خفتہ آتش فشاں لاوا اگلنے لگے کہ یا اللہ خیر یہ خاتون میرا ہاتھ پکڑے مجھے اپنے کمرے میں کس سلسلے میں لے جا رہی ہے..لیکن یکدم اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوکر باہر کی جانب اشارہ کیا..کھڑکی سے ہانگ چُو کی جھیل نہ صرف پورے کینوس پر پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی بلکہ اُڈتی ہوئی کمرے کے اندر تک آتی تھی..

''بیوٹی فل..'' میں نے سر ہلا کر داد دی۔

سنہری وانگ لی نے پھر کوئی مٹھاس بھری بات کی اور زور زور سے سر ہلایا..میں نے بھی تائید میں سر ہلایا اور بھرپور مسرت کا اظہار کیا..اس نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا..اب ضرور کوئی گڑبڑ ہے، میں گڑبڑا گیا اور وہ مجھے کھینچتی پھر سے مجھے اپنے کمرے میں

لے گئی..میرے بیگ کی جانب اشارہ کیا..میں بدھو بنا کھڑا رہا تو اس نے میرا بیگ اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گئی..یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے..واپس آئی تو اپنے چند ملبوسات اٹھائے چلی آئی جنہیں اس نے میرے بستر پر رکھ دیا..جی ہاں بستر پر اور ان میں ایک نہایت باریک نائٹی بھی تھی..اس بار اس نے میرے سوٹ کیس کو گرفت میں لیا اور اسے اپنے کمرے میں چھوڑ آئی..لوٹی تو اپنا سوٹ کیس گھسیٹتی آرہی تھی..اور اب جا کر یہ کھلا..میری ناقص عقل میں آیا کہ سنہری وانگ لی کو کہیں سے بھنک پڑ گئی تھی کہ میں جھیل کے منظر والے کمرے کا طلبگار ہوں اور وہ محض ایک اچھی میزبان ہونے کے ناطے مجھ سے کمرے کا تبادلہ کر رہی تھی۔محض..اب میں نے انگریزی میں کچھ احتجاج کیا تو اس نے چینی میں جو کچھ کہا، وہ مجھے اردو اور پنجابی میں سمجھ آ گیا کہ..میں تو ہانگ چُو کی رہنے والی ہوں اور اس جھیل کو دیکھتی ہی رہتی ہوں.تم مہمان ہو..تمہیں اس کمرے میں ہونا چاہیے..اور میں جواب میں صرف ''نی ہاؤ'' ہی کہہ سکا..البتہ میں نے اس کے اَن پیکڈ ''سامان'' کو اپنے کمرے میں شفٹ کرنے میں مدد دی..اور یہ ''سامان'' اٹھاتے ہوئے میرے کانوں کی لوئیں قدرے سرخ ہوئی جاتی تھیں کہ ان میں ہر قسم کے جامے وغیرہ تھے..جب یہ شفٹنگ مکمل ہوگئی تو اس نے اپنی مسکراہٹ کو مزید آتش ساماں کیا اور کمرے کا دروازہ بند کرلیا..

میں نے نوٹ کیا کہ میرا ازار بند ابھی تک لٹک رہا تھا..

کھانے کی میز پر ابھی تک وہی مسائل تھے..

کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے..یہ کہیں وہ تو نہیں..اور وہ جو ہے یہ وہی ہے جو دکھائی دے رہا ہے یا کچھ اور ہے..البتہ ایک حیرت ناک تبدیلی ظہور پذیر ہوچکی تھی..وفد کے بیشتر اراکین اب زیادہ اجتناب نہیں کرتے تھے..زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرتے تھے۔شاید کسی نے انہیں اطلاع کردی تھی کہ بے خبری میں جو گناہ ہو جائے، وہ قابل معافی ہوتا ہے۔اس لیے کھانے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ بے خبر ہو جاتے تھے..لنچ کی میز پر آنے سے پیشتر میں نے ہوٹل ہانگ چو کا جغرافیہ جاننے کے لیے کچھ مٹرگشت کی تھی اور اس

چہل قدمی کے دوران میں نے مشاہدہ کیا تھا کہ یہ ہوٹل اہلِ ہانگ چُو کا پسندیدہ ہے اور وہ اس کے متعدد ریستورانوں میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں.. ان نہایت دل فریب طعام گاہوں کے داخلے پر چینی دستور کے مطابق شیشے کے شوکیسوں میں وہ تمام ''اشیاء'' زندہ حالت میں نمائش پر تھیں جنہیں آپ حسب ذائقہ اپنی میز پر پکوان کی حالت میں دیکھ سکتے تھے.. ان میں کچھوے، مینڈک، جھینگے، بام مچھلیاں وغیرہ تو معمول کے مطابق تھیں لیکن وہاں نہایت عنقا اقسام کے سانپ بھی سرسراتے تھے اور اپنے تکونے منہ اور دیدہ زیب زبانیں ہلاتے ہوئے گویا کہتے تھے کہ بچہ ہمیں کھاؤ گے تو یاد کرو گے..

چنانچہ لنچ کی میز پر براجمان ہمیں تو کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے.. اور ابھی تھوڑی دیر پہلے کون سے مرتبان میں یہ زندہ تھا.. برابر کے ڈائننگ روم میں سے مستی اور مسرت کا ملا جلا شور ہم تک آ رہا تھا.. اور ویٹریس خوراک اور شراب کی طشتریاں اپنے ہاتھوں پر بیلنس کیے نہایت شتابی سے چلتی ہمارے پاس سے گزر کر اُدھر کو جا رہی تھیں..

ایک ویٹرس گزری اور اس کے پاس کوئی طشتری نہ تھی بلکہ اس کے ایک ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما ہوا ایک جال تھا جس میں ایک نہایت تنومند اور جال میں سے نکلنے کی سعی میں گھمن گھیریاں کھاتا ایک ڈب کھڑبہ سانپ تھا..

''ہیلو'' میں نے صدا لگائی اور وہ چونک کر.. پھر مسکرا کر ہماری میز کی جانب آ گئی۔

''وانگ لی اس خاتون سے دریافت کرو کہ یہ کہاں جا رہی ہے.. بلکہ اس غریب سانپ کو کہاں لے جا رہی ہے؟''

ہماری قدیم وانگ لی نے اپنی منگول ناک سکیڑی اور ویٹرس سے بات کی اور پھر کہنے لگی۔ ''آپ لوگ جب اس ہوٹل میں داخل ہوئے تھے تو یہاں ایک چینی شادی ہو رہی تھی۔ برابر کے ڈائننگ ہال میں اسی شادی کی ضیافت ہو رہی ہے اور یہ سانپ ایک خصوصی ڈش کے طور پر ان کے سامنے کاٹ کر تلا جائے گا.. اگر آپ خواہش کریں کیونکہ آپ معزز مہمان ہیں تو ہماری ٹیبل کے لیے بھی ایک ایسا ہی سانپ مہیا کیا جا سکتا ہے۔''

وانگ لی نے جب یہ پیشکش کی تو وہ اگرچہ ہماری ماضی کی خوراکی کارکردگی سے

مایوس تھی لیکن پھر بھی اس کے ہونٹ ذرا سکڑے کہ وہ یقیناً ایک سانپ کے تلے جانے کی خواہش میں تھی..

اس پیشکش کا ہم سب پر نہایت ناروا اثر ہوا اور ہم طرح طرح کی ناروا شکلیں بنانے لگے اور میز پر جو خوراک دھری تھی، اس کی جانب جو بے خبری تھی، اس میں واضح طور پر کمی آ گئی..

میں خود کردہ بے خبری کے عالم میں تو شاید اس سانپ کا سوپ.. سمندری خوراک کے سوپ کے طور پر نوش کر جاتا کہ میں نے آخر اندلس میں آکٹوپس بھی تو چکھا تھا یا اسے مچھلی کی کوئی نایاب قسم کے طور پر کھا جاتا لیکن یوں اسے اپنے سامنے ایک جال میں سرسراتے اور اپنی زبان سوراخوں میں سے باہر نکال کر لہراتے دیکھ کر.. میں بھی ہمت ہار گیا.. آخر بے خبری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..

جب کبھی پاکستان میں کسی اور ملک کا تصور ذہن میں آتا ہے تو جانے کیوں یہی خیال آتا ہے کہ وہاں یہاں کی نسبت موسم خوشگوار ہوگا.. درخت خنکی میں جھومتے ہوں گے اور اس گرمی اور حبس سے نجات مل جائے گی..

ہانگ چُو میں موسم ایسا تھا کہ ہم پاکستان کی گرمی اور حبس کو ترس گئے..

پہلی بار کوچ کی ایئر کنڈیشنڈ خنکی سے باہر آئے.. ہانگ چُو میں آئے.. جھیل کنارے آئے تو ہمارے بدن پسینے کے آبشار ہو گئے.. چنانچہ پراپر لی ڈریسڈ اراکین کے پہلے کوٹ اترے.. پھر ٹائیاں کھلیں.. پھر گریبان کھلے.. پھر حیا مانع آ گئی کہ اب کیا کیا اتاریں.. کیا بند قبا بھی کھول دیں.. میں حسب عادت اور حسب ناپسندیدگی لیڈر اگرچہ ایک نیلی نیکر اور ٹی شرٹ میں ہی ملبوس تھا لیکن میں بھی یوں جل تھل ہوا جیسے کپڑوں سمیت نیاگرا کے پانیوں میں اشنان کر کے آیا ہوں..

ہاں.. تتلی بہت آسودہ، بہت چلبلی اور زندہ ہوتی جاتی تھی کہ حبس کے موسم اس کے من کو بھاتے تھے... کہ جیسے ایک مچھلی پانیوں کو ترستی ہے۔ ایسے ایک تتلی گرم اور حبس زدہ موسم

میں نکھرتی ہے اور اسی لیے اس کے پروں کے رنگ شوخ اور ناقابل یقین حد تک سوہنے ہوتے جاتے تھے.. یہ موسم اس کی چندروزہ حیات کے لیے آبِ حیات تھے..

ہاں.. یہ صرف سنولیک کی تتلیاں تھیں جو منجمد موسموں اور ازلی برفوں میں بھی اپنے رنگ دکھاتی تھیں۔ اگرچہ فوراً ہی مردہ ہو کر برف میں حنوط ہو جاتی تھیں..

جھیل میں موٹر بوٹ رواں ہوئی تو چہرے پر ہوا آہستگی سے نم پنکھے جھلنے لگی اور کچھ افاقہ ہوا..

ہانگ چُو شہر کی بلند عمارتیں دور ہوتی جا رہی تھیں اور شام سے پہلے کی چھوئی موئی روشنی میں.. چھدرے بادلوں تلے جھیل کے پانی ان پر حاوی ہو رہے تھے..

جھیل کو گھیرے ہوئے سرسبز پہاڑیاں، جزیرے اور ٹاپو.. قدیم بارہ دریاں.. جن میں گئے زمانے ٹھہرے ہوئے تھے.. پانیوں میں سے بلند ہوتے ستون اور مندر اور ان کے آس پاس کہیں کہیں آوارہ خرام کشتیاں اور ایک بڑی وسعت جس کے اندر ہم اور ہماری موٹر بوٹ چلی جا رہی تھی... میں نے ایک بار مونترے میں جھیل جنیوا میں ایک کشتی کرائے پر حاصل کر کے دوسرے کنارے پر نظر آتے فرانس کے ساحل تک جانے کی کوشش کی تھی اور دوسرا کنارا.. شام تک.. بلکہ رات تک قریب نہیں آیا تھا اور میں بمشکل مانترے واپس آیا تھا.. جھیل ہانگ چو کے دوسرے کنارے پر بھی جو طلسم نظر آ رہے تھے وہ سب کے سب ..پگوڈے، بارہ دریاں، مندر.. سب کے سب یقیناً فریب تھے اور ان تک رسائی ناممکن تھی..

دوسرا کنارا تو دور کی بات تھی..

بہت دور کی بات تھی..

اس جھیل ہانگ چُو تک بھی میری رسائی نہ تھی..

اگرچہ میں اس کے پانیوں میں سفر کرتا تھا لیکن ان کی پھوار اور نمی میرے بدن میں نہ تھی.. یہ مجھ سے الگ تھی.. اجنبی تھی..

یہ ایک عجیب حقیقت تھی کہ یورپی جھیلیں.. بے شک وہ جھیل ونڈرمیر ہو یا جھیل لوسرن.. یا کومو ہو.. وہاں میں اجنبی اور غیر محسوس نہیں کرتا تھا۔ ان میں ایک اپنائیت تھی لیکن

یہاں.. اپنے مشرق میں.. مشرق کے ایک ہمسائے ملک میں یہ جھیل مجھ سے بیگانی تھی.. شائد یہ ملک چین کی خصلت ہے کہ وہ اپنے آپ میں مگن ہے.. اپنی قدامت اور ورثے کو ایک حسد اور ایک شک کے ساتھ دوسروں سے محفوظ رکھتا ہے.. کسی کو بھی اپنے آپ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا.. چنانچہ مجھے واضح طور پر احساس ہوا کہ جھیل ہانگ چُو مجھے قبول نہیں کر رہی.. مجھ سے بیگانی ہے.. اجنبی ہے.. صرف لی پَو اور پو چوری کے لیے ہے.. تتلی کے لیے ہے.. میرے لیے نہیں ہے..

کمرے میں ابھی تک سنہری وانگ لی کے بدن پر چھڑکے گئے یوڈی کولون کی مہک موجود تھی.. ٹھہری ہوئی تھی..

باتھ روم میں اس کے میک اپ کے سامان اور زیر جامہ ملبوسات کی ایک بُو تھی..

"تم اگرچہ پہلے سے ہی موٹے ہو لیکن اب.. ہانگ چُو کی جھیل دیکھنے کے بعد ایک رنجیدہ موٹے ہو.. کیوں؟" تتلی جرح کرنے لگی..

"تم کہاں تھیں؟"

"میں نے تمہاری رنجیدگی میں شامل ہونا مناسب نہ جانا.. کیونکہ میں تو جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا.."

"تتلی... جھیلوں نے کبھی مجھ سے پردہ نہیں کیا.. ہمیشہ مجھے اپنا سمجھا.. اس لیے کہ پانیوں کی تو کوئی قومیت نہیں ہوتی.. کوئی عقیدہ، کوئی مذہب نہیں ہوتا.. لیکن ہانگ چُو جھیل کے پانی اتنے بنیاد پرست ہوں گے، یہ میرے گمان میں بھی نہ تھا.."

"چینی تین چیزوں میں واقعی بنیاد پرست ہیں تارڑ... اپنے عقائد، تہذیب اور خوراک کے بارے میں.. یہاں تک کہ ان کے دریا، پہاڑ، زمینی منظر اور جھیلیں بھی اس بنیاد پرستی کے اثر میں ہیں... تم ان کے ساتھ دوستی نہیں کر سکتے.. انہیں دیکھ سکتے، محسوس کر سکتے ہو لیکن وہ تمہیں قبول نہیں کر سکتے.. جیسے سنہری وانگ لی نے تمہیں اپنا کمرہ دے دیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ تم سے غافل ہے.. تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ ایسا ہی کرتی.. کہ یہ

اس کی مہمان نوازی کی روایت میں شامل ہے...تم چین کو صرف اپنے کمرے کے اندر بیٹھ کر ایک فاصلے پر رہ کر تو دیکھ سکتے ہو..اس کے اندر نہیں جا سکتے..'' تتلی نے کھنچے ہوئے پردے وا کر دیئے اور کھڑکی میں جھیل ہانگ چُو کی رات اور اس کے پانی پھیل گئے۔ ''بس یہاں سے اسے دیکھو اور اس کے اندر جانے کی تمنا نہ کرو...کہ یہ ایک چینی جھیل ہے..''

''یوفی کا عالی شان معبد، شیر کا چشمہ اور پگوڈۂ اعظم''

تتلی نے بتایا کہ آج ہم یوفی کا معبد اور مقبرہ دیکھنے جائیں گے..

''کیوں جائیں گے؟''

''اس لیے کہ جو بھی ہانگ چُو آتا ہے، وہ یوفی کا معبد دیکھنے ضرور جاتا ہے۔''

''اپنی مرضی سے جاتا ہے یا اس کی چینی میزبان اسے زبردستی لے جاتے ہیں۔''

''تم یوفی سے اتنے الرجک کیوں ہو...؟''

''نہ میں اس سے الرجک کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں نے تو آج تک اس مرد یا عورت کا نام تک نہیں سنا..بھئی اگر ہانگ چُو ایک جھیل ہے تو ہمیں اس کے کناروں پر ہی قیام کرنا چاہیے مقبروں اور معبدوں میں بھٹکنے سے فائدہ...''

''جھیل تو تمہیں قبول نہیں کرتی اور تم پھر بھی اس کے کناروں پر قیام کرنا چاہتے ہو؟''

''کیا میں ایک قہقہہ لگا سکتا ہوں؟''

''میں نے کوئی مزاحیہ بات کی ہے؟''

''ہاں..''

''تو پھر لگا لو قہقہہ۔''

''نہیں اس قہقہے کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں..''

''تم یہ تو بتا سکتے ہو ناں کہ میں نے کونسی مزاحیہ بات کی تھی؟''

''دیکھو تتلی ڈارلنگ..ہم مروت کے مارے لوگ ہیں..ہماری آنکھوں میں اس لیے زیادہ شرم ہے کہ یہ تم لوگوں کی نسبت ذرا بڑی بڑی ہیں..صرف اس لیے تمہاری اس ہانگ چوئی جھیل کو لفٹ کرواتے ہیں ورنہ آپس کی بات ہے اس کی کوئی زیادہ حیثیت نہیں اور اگر یہ ہمیں قبول نہیں کرتی تو نہ کرے..اس سے بڑھ کر کہیں شاندار اور سوہنی جھیلیں ہمیں قبول کرتی ہیں اور ہم ان کے اندر جا سکتے ہیں..تم نے تو جھیل کرومبر اور سیف الملوک کا نام تک نہیں سن رکھا ہو گا تو تم سے آدمی کیا بحث کرے..''

''ہم یہاں بحث کرنے نہیں آئے ہانگ چُو دیکھنے آئے ہیں..''

''تو ٹھیک ہے،ہم تمہارے اس یوفی کا معبد دیکھ لیتے ہیں لیکن آئندہ جھیل ہانگ چُو کے مجھے نہ قبول کرنے کا طعنہ نہ دینا..ویسے یہ یوفی کون تھا..یا تھی؟''

''یوفی..سونگ خاندان کا سپہ سالار تھا..اور اس نے نو سو برس پیشتر شمال سے آنے والے حملہ آوروں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا..''

''شمال میں تو بیجنگ ہے..''

''ہاں..''

''تو اس نے بیجنگ والوں کو شکست دی تھی؟''

''یہ فقرہ بلند آواز میں تو نہ کہو..'' تتلی چوکنی ہو گئی..''یہ تو نو سو برس پہلے کا قصہ ہے اور اس زمانے میں بیجنگ والوں کی اور ہانگ چُو والوں کی سخت دشمنی تھی..''

''اور اب؟''

''اب بھی ہے..لیکن ہانگ چُو والے ظاہر نہیں کرتے کیونکہ راج بیجنگ کا ہے..اس لیے یوفی آج کے چین کا نہیں صرف ہانگ چُو والوں کا ہیرو ہے..''

''تو اس ہیرو کے بارے میں کچھ اور بتاؤ؟''

''اگرچہ وہ ایک عظیم فاتح تھا لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے' وزیر اعظم نے اس کے خلاف سازش کی اور شہنشاہ گاؤ زونگ نے بدگمان ہو کر اسے قتل کروا دیا..''

''ایک تو یہ شہنشاہ بڑی آسانی سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔''

''اور پھر اسی آسانی سے تائب بھی ہو جاتے ہیں۔چنانچہ اس کے قتل کے اکیس برس بعد شہنشاہ کو خیال آیا کہ او ہو یوفی کو یونہی مروا دیا وہ تو بہت گریٹ سپہ سالار تھا۔چنانچہ اس کی دوبارہ مناسب تدفین کی گئی اور فوری طور پر سوگ منایا گیا۔''

''اب مجھے یوفی کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہو گئی ہیں تو کیا اب بھی اس کا معبد اور مقبرہ دیکھنا ضروری ہے؟''

''بہت ضروری ہے کیونکہ یہ تمہارے شیڈول میں شامل ہے..اور شیڈول اٹل ہے۔''

آج پھر ہانگ چُو میں گرمی، حبس اور سنہری وانگ لی جوبن پر تھے۔

اگر جوش یہاں ہوتے تو پکار اٹھتے کہ..میرا جوبناں کا دیکھو ابھار سجناں..

ہوٹل کے ٹھنڈک بھرے وجود میں سے باہر نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا..کوچ میں بیٹھ گئے تو اس کی ایئر کنڈیشنگ سے بچھڑنے کو دل نہیں مانتا تھا..لیکن یوفی کا معبد دیکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا..

جھیل بھی دکھائی دی..اس کے کناروں پر سفر کیا..اس کی رونق گرمی کے باوجود عروج پر تھی..تمازت کے باوجود پانیوں پر کشتیاں اور موٹر بوٹس رواں تھیں..

ہم معبد کے اندر گئے..

ایک وسیع ہال..جسے نہایت دیدہ زیب سرخ اور سنہری ستون سہارا دیئے ہوئے تھے اور وہاں یوفی ایک بڑے چبوترے پر براجمان تھا..ایک منقش سنہری رنگ میں پینٹ کیا ہوا،تہمد نما لباس پہنے..ایک ہاتھ گھٹنے پر، دوسرے میں تلوار تھامے، فرنچ کٹ داڑھی والا یوفی ایک نہایت ہینڈسم اور پُراثر شخص تھا۔یورپی مجسموں کی مانند یہ پتھر کا سادہ سا بت نہ تھا بلکہ اسے ایک چینی گڑیا کی مانند نفاست سے اس طرح پینٹ کیا گیا تھا کہ وہ زندہ لگتا تھا..سینکڑوں سیاحوں کے سروں سے بلند ہوتا چھت کی قربت میں جاتا یوفی کا مجسمہ اتنے بڑے حجم کا تھا کہ ہم اس کے چبوترے تلے کھڑے اس کے تہمد کے نیچے سے جھانکنے والے نوکدار جوتوں کی نوکوں تک بھی نہ پہنچ پاتے تھے..مجسمے کے عقب میں ایک قدیم چینی پردہ

تھا جو اس کے وجود کو اور زیادہ نمایاں کرتا تھا.. جیسے ایک فلم سکرین میں سے ایک شخص باہر آ رہا ہو..

واقعی یوفی سے ناواقفیت کے باوجود اس کا یہ بارعب اور عظیم الشان مجسمہ اس لائق تھا کہ اسے حیرت سے دیکھا جائے..

ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ یوفی کے ہمراہ کم از کم ایک تصویر تو کھنچوائے لیکن سیاحوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اس کے ساتھ تنہا ہونا ممکن نہ تھا..

لیکن ایک لمحہ ایسا آیا جب یہ ہال یکدم سیاحوں سے خالی ہو گیا..

ہمارے وفد کے اراکین بھی ہر دو وانگ لیوں کے ہمراہ.. بلکہ ان کے پیچھے قطار بنا کر رخصت ہو چکے تھے اور ہال یکسر خالی ہو گیا..

صرف میں تھا اور یوفی تھا..

وہ آج سے نو سو برس پیشتر کے چینی سپہ سالاروں کی وردی میں.. اسی آن بان میں.. تلوار تھامے بالکل زندہ لگ رہا تھا اور میں ایک بونے.. ایک للّی پٹ کی مانند سر اٹھائے اسے تک رہا تھا.. اور وہ مجھے دیکھ رہا تھا.. اور وہ اتنا زندہ لگ رہا تھا کہ اس لمحے اگر میں اس سے درخواست کرتا کہ اے یوفی! تم عرش پر فائز ہو اور میں فرش پر ہوں، میں تمہارے نقش نہیں دیکھ سکتا۔ تو وہ اپنے چبوترے سے اتر کر میری سطح پر آ جاتا اور گھٹنے پر رکھے ہاتھ کو اٹھا کر مجھ سے دست پنجہ لیتا اور باقاعدہ "ہاؤ ڈو یو ڈو" کہتا.. اور اسی لمحے سیاحوں کا ایک اور ریلا ہال میں امڈ آیا اور یوفی پھر سے مجسمہ ہو گیا..

اس ہال کے برابر میں جو برآمدے تھے وہاں یوفی کی زندگی کی کہانی نہایت کلاسیکی انداز کی چینی مصوری کی صورت میں بیان کی گئی تھی.. اس عہد کے ہر چینی کی مانند.. یوفی بھی شاعر تھا.. اور اس کی شاعری نہایت پُرکشش خطاطی میں دیواروں پر آویزاں تھی..

ہم کھلی فضا میں آ گئے جہاں گھنے درختوں.. اور بہت قدیم درختوں کے جھنڈ میں ایک سبزہ زار میں یوفی کی قبر تھی.. یعنی جہاں وہ دوبارہ دفن کیا گیا تھا.. پہلی بار جانے کہاں دفن ہوا تھا.. اور اس قبر کے گرد پتھر کے گھوڑے اور مینڈک نما اجسام پہرہ دے رہے تھے.. قبر کے

پس منظر میں جنوبی امریکہ کی اِن کا تہذیب ایسے نقش و نگار سے مزیّن ایک مستطیل کتبہ آویزاں تھا.. قبر کے دونوں جانب نہایت قدیم کاریگری کے تین تین مجسمے سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں جیسے سوگ اور شرمندگی میں ہوں.. ایک روایت کے مطابق یہ وہ لوگ ہیں جو یوفی.. اس کے بیٹے.. اور اس کی بیوی کے قتل کے ذمہ دار ہیں.. ویسے شکل سے یہ سب کے سب نہایت پاکیزہ اور پوِتّر لگتے ہیں۔ جیسا کہ تاریخ کے اکثر قاتل لگتے ہیں.. میں نے ان مجسموں کے درمیان میں کھڑے ہو کر انہی کے انداز میں سر جھکا کر ہاتھ باندھ کر سوگ اور شرمندگی کی اداکاری کرتے ہوئے ایک تصویر اتروائی... شائد میں بھی کسی نہ کسی یوفی کے قتل کا ذمہ دار تھا..

کس یوفی کا؟..

کوئی ایک یوفی تھوڑا تھا جس کے قتل کا میں ذمہ دار تھا.. جس کے قتل کا میں نے فتویٰ دیا تھا..

انا الحق کہنے والے ہر منصور حلاج اور چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو.. کہنے والی ہر قرۃ العین طاہرہ کے قتل کا فتویٰ میں نے ہی تو دیا تھا..

گرمی کا زور ہم سب کو نڈھال کرتا تھا... اور جب ہم نے یوفی کے معبد کے آخری مجسمے اور آخری بارہ دری کو دیکھ لیا تو سامنے ایک مختصر سا سووینئر بازار تھا جہاں سے سنہری وانگ لی نے ہمارے سوکھے حلق اور لٹکتی زبانوں کے لیے ٹھنڈے منرل واٹر کا بندوبست کر دیا.. پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد جب کچھ ہوش آیا تو پہلی بار احساس ہوا کہ کیا غضب ہے۔ سنہری وانگ لی بھی تو ہمارے ہمراہ ہے.. گرمی کی یہ شدت صرف ہمیں نڈھال کرتی تھی.. جب کہ یہ وانگ لی اس میں کھلتی چلی جاتی تھی، وہ زینیا کا ایسا پھول تھی جو جیٹھ ہاڑ کی تپتی دھوپوں میں کِھلتا ہے اور کُھلتا ہے اور رنگ رنگ کے رنگ دکھاتا ہے.. ملتان کے آموں کی مانند گرمی کی شدت اس کے بدنی رس کو میٹھا اور گاڑھا کرتی تھی.. وہ ایک بے پناہ خاتون تھی اور اس کی انرجی اور مسکراہٹ کا کوئی انت نہ تھا..

یوفی معبد کے اس سووینئر بازار سے میں نے براؤن.. کافی براؤن رنگ کی چینی

مٹی کا ایک ٹی سیٹ خریدا جس کے قدیمی ڈھنگ اور شکل اور اس پر سیاہ حروف میں ابھری ہوئی خطاطی نے مجھے موہ لیا..

"یہ ٹوٹ جائے گا.." حسرت ناک نے مجھے خبردار کیا۔ "مجھ سے شرط لگا لو، یہ پاکستان نہیں پہنچ سکتا.. پہنچ سکتا تو میں نہ خرید لیتا۔"

"بے شک ٹوٹ جائے.." میں نے جل کر کہا۔ "لیکن اس وقت تو یہ میرے پاس ہے۔"

بقیہ سفر کے دوران حسرت ناک تقریباً روزانہ مجھے اس ٹی سیٹ کی صحت کے بارے میں دریافت کرتا اور جب میں اسے بتاتا کہ میں اسے سینے سے لگائے پھرتا ہوں اور ابھی وہ بالکل سالم حالت میں ہے تو وہ کہتا۔ "تم نے ڈبہ کھول کر چیک کیا ہے؟ نہیں کیا ناں. تم کھول کر دیکھو، ایک آدھ پیالی یا چائے دانی کی ناک تو ضرور ٹوٹ چکی ہوگی۔"

ٹی سیٹ خریدنے کے بعد میں نے انگریزی دان وانگ لی سے پوچھا کہ "ان پیالیوں اور اس چائے دانی پر جو دل کش خطاطی ابھری ہوئی ہے اور یقیناً کسی قدیم چینی شاعر کے مصرعے ہیں تو کیا تم انہیں پڑھ کر مجھے ان کا مطلب بتا سکتی ہو.."

"ہاں بتا سکتی ہوں۔" وہ خوش ہوگئی کہ سنہری وانگ لی کہ آمد کے بعد اس کی مارکیٹ ویلیو میں شدید کمی واقع ہوگئی تھی۔ "واقعی یہ تو بہت ہی قدیم شاعری ہے۔" اس کی منگول آنکھیں مسکراہٹ میں میچی گئیں۔ "ان پر چینی زبان میں لکھا ہے... گڈ مارننگ۔"

وطن واپس آ کر میں نے سب کو یہی بتایا کہ یہ تو چینی زبان میں کنفیوشس کے اقوال چائے کی پیالیوں پر لکھے ہوئے ہیں تا کہ آپ چائے پیتے، سُرکیاں لگاتے اس عظیم دانشور کے اقوال سے مستفید ہو سکیں.. گڈ مارننگ کا بالکل نہیں بتایا..

یوفی کے معبد کے باہر درختوں کی چھاؤں میں ہماری کوچ استراحت فرما رہی تھی اور اس میں وہ ٹھنڈک تھی جس کے لیے ہم ہانپ گئے تھے..

"تتلی.. یہ اب ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

مجھے احساس ہو گیا تھا کہ کوچ کا رخ اُدھر نہیں جدھر ہمارا ہوٹل ہے اور جس کے

خنک کمروں میں ہمارے بستر سرد ہو رہے تھے اور ہم ان پر لوٹنے کی چاہت میں دیوانے ہو رہے تھے..

"اب ہم ٹائیگر سپرنگ دیکھنے جا رہے ہیں!"

"کیوں دیکھنے جا رہے ہیں؟"

"پھر وہی احمقانہ سوال.. جو بھی ہانگ چُو آتا ہے، اسے ٹائیگر سپرنگ ضرور دکھایا جاتا ہے۔"

"اور اگر نہ دیکھنا چاہے تو؟"

"میں جانتی ہوں کہ گرمی اور حبس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے.. تمہیں دوسروں کی نسبت پسینہ بھی زیادہ آتا ہے. تم جانتے ہو کہ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ جانور ہوتا ہے، اسے اتنا ہی زیادہ پسینہ آتا ہے؟"

"اطلاع دینے کا شکریہ.. اور میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ کس جانور کو بہت پسینہ آتا ہے.. لیکن تتلی یاد رکھو میں ایک ایسے ملک سے آیا ہوں جس میں شیر دریا بہتا ہے اور تم مجھے محض ایک شیر چشمہ دکھانے لے جا رہی ہو.."

"وہ شیر دریا بھی تو چین میں سے ہی نکلتا ہے.. تبت کی جھیل مانسرور سے اور جن چٹانوں میں سے وہ برآمد ہوتا ہے، وہ شیر کی شکل کی ہیں۔ اس لیے اسے شیر دریا کہتے ہیں.."

"دکھانا ہے تو شیر دریا کا منبع دکھاؤ، شیر چشمہ دیکھ کر کیا کرنا ہے.."

"نہیں شیر چشمہ.. یعنی ٹائیگر سپرنگ کیونکہ.. شیڈول میں یہی درج ہے۔"

ٹائیگر سپرنگ.. میرا خیال تھا کہ برلب سڑک کوئی چشمہ سا ہوگا اور ہم اس میں ہاتھ منہ دھو کر چھینٹے اڑا کر شتابی سے فارغ ہو جائیں گے لیکن معلوم ہوا کہ ایک بلند چینی محراب ہے اور اس کے پار ایک جنگل سا ہے اور اس میں ایک پہاڑی سی ہے اور اس پر سیڑھیاں سی ہیں اور بہت سی ہیں اور پھر چوٹی پر کوئی تالاب وغیرہ ہیں اور خوش نما عمارتوں کا ایک جھنڈ ہے اور ان میں کہیں پوشیدہ وہ کمبخت ٹائیگر سپرنگ ہے.. مرے کو مارے ٹائیگر سپرنگ..

ویسے آپس کی بات ہے اگر شدید گرمی کی بجائے بہار یا خزاں کے موسم ہوتے تو یہ سیرگاہ ایسی خوش نظر اور خوش نما تھی کہ اس کی کائی زدہ ڈھلوانوں، پتھروں اور تالابوں اور بارہ دریوں میں جو خاموش سی اداسی اور دل کشی تھی، اس میں دِل زار کے سبھی اختیار چلے جاتے اور انسان اس کے کسی کونے کھدرے میں پھونس کی ایک جھونپڑی ڈال کر لی پَو وغیرہ ہو جاتا.. اتنے گہرے سبز سناٹے تھے جن میں صرف جھینگر بولتے تھے یا پانی گرتے تھے..

جنگل کے دو تین درختوں کے ساتھ سیڑھیاں لگائے شاخوں اور ٹہنیوں سے اپنی چپٹی ناکیں چپکائے سفید اوورآل میں ملبوس چینی خواتین جانے وہاں اوپر کیا کر رہی تھیں۔ وانگ لی نے بتایا کہ یہ درختوں کی ڈاکٹر ہیں اور یہ درخت بیمار ہیں، انہیں دوائیں لگا رہی ہیں اور انجکشن دے رہی ہیں..

پہاڑی پر پرانے پتھروں کی سیڑھیاں گھنے درختوں، جھاڑیوں اور تالابوں میں سے گزرتی بلند ہو رہی تھیں..

یہ مقام اتنا پُرسکون تھا ٹھہراؤ میں تھا کہ یہاں جوگ لینے کو جی چاہتا تھا۔ کنیں مُندراں پا کے، متھے تلک لگا کے.. چینی تصویروں میں جو ٹھگنے درخت، پتے اور کومل ٹہنیاں نظر آتی ہیں.. جو بارہ دریاں اور چھتیں دکھائی دیتی ہیں وہ سب یہاں سچ مچ اصل حالت میں موجود تھیں.. اور یہی گمان ہوتا تھا کہ ہم ایک قدیم چینی تصویر کے اندر چلے گئے ہیں..

البتہ اس رومان پرور قدیم فضا میں ایک زبردست ٹریجڈی ہوگئی..

اس قسم کی ٹریجڈی کا مجھے اکثر خدشہ رہتا تھا.. کہ انسان ایک نان سٹاپ بس پر سفر کر رہا ہو.. کسی تنظیم کے بورڈ آف گورنرز کی اہم میٹنگ میں شامل ہو.. خواتین کے کالج میں سٹیج پر بیٹھا صدارت کر رہا ہو اور یکدم آپ کے پیٹ میں گڑبڑ ہو جائے، دھماچوکڑی مچ جائے تو پھر کیا ہو.. لیکن اس قسم کی ایمرجنسی کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی جو ٹائیگر سپرنگ کو جاتے والی سیڑھیاں چڑھتے آ گئی.. کل لنچ یا ڈنر میں جانے میں نے کیا کیا تناول کر لیا تھا.. کوئی چھپکلی شائد.. کہ وہ میرے پیٹ میں کروٹیں بدلتی بڑبڑا رہی تھی اور باہر آنے کو تھی.. میں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی نہیں یہ پاٹی ایمرجنسی تو نہیں ہے

یونہی سرسری سا وہم ہے جو سرسراتا ہوا گزر جائے گا. تم ذرا اس تالاب کے کائی زدہ پانیوں میں گرتی دھار کی آہستگی تو دیکھو.. اور ذرا اس چینی اژدھے کے مجسمے پر تو غور کرو.. اور جناب کنفیوشس نے کیا خوب فرمایا تھا.. اور لی پَو نے ندی کے کنارے بیٹھ کر جو نظم لکھی تھی اور یہ جو مینڈک ہے سبز رنگ کا... لیکن درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی.. پیٹ میں جو کچھ تھا، اس نے تو دھماچوکڑی مچا رکھی تھی اور ایکدم ایک بے اختیاری سنسنی بدن میں دوڑنے لگی کہ ابھی.. اسی وقت کچھ کر لو.. ورنہ زمانہ قیامت کی پاٹی چال چل جائے گا اور سخت سُبکی ہوگی.. میں نے سنہری وانگ لی کو اس ناگہانی صورت حال سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا کہ ایسے پُرفضا مقام پر.. ایسے رومان سے نچڑتے ہوئے چائینز لَوسپاٹ میں.. میں اسے کیسے کہہ سکتا تھا کہ بی بی میرا کچھ کرلو.. ورنہ میں یہیں کہیں پنجاب کی دہقانی روایت کے مطابق بیٹھنے کو ہوں.. چنانچہ میں نے فوری طور پر لیو کو اعتماد میں لیا اور نہایت خجالت سے اسے حالات کے سخت دگرگوں ہونے کا بتایا..

''ڈونٹ وَری..'' وہ لاپروائی سے مسکرایا۔ ''ابھی ٹائیگر چشمہ دیکھنے کے بعد ہم سیدھے ہوٹل چلے جائیں گے صرف آپ کے لیے جہاں..''

''لیو بھائی۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فریاد کی۔ ''ایمرجنسی ہے.. بندوبست ابھی.. اسی لمحے ہونا چاہیے ورنہ میں یہیں کہیں براجمان ہو جاؤں گا اور تمہارے کسی قدیم چینی ورک آف آرٹ کا ستیاناس کر دوں گا.. نہیں سمجھے؟''

''سمجھ گیا..'' لیو نے ہراساں ہو کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں پہاڑی کے اوپر جاتی سیڑھیاں تیزی سے پھلانگنے لگے.. بقیہ اراکین نے یہی سمجھا کہ میں ٹائیگر سپرنگ دیکھنے کے لیے اتنا پُرشوق ہو رہا ہوں کہ بے تابی کی سرحدوں کو چھو رہا ہوں۔ بالآخر ایک عمارت آئی جس کے اندر اگرچہ صفائی مخدوش تھی لیکن بہرطور ایک ایسی تنہائی تھی جس میں بیٹھ کر میں نے زندگی کا سب سے اطمینان آور گہرا سانس لیا.. اس فراغت کے بعد تو دنیا ہی روشن ہوگئی.. اتنی خوبصورت ہوگئی کہ ہر جھاڑی، ہر پتھر اور ہر پتے کو چومنے کو جی چاہنے لگا.. شکر ہے کہ اس لمحے سنہری وانگ لی آس پاس نہیں تھی..

اب میں نے مکمل یکسوئی سے اپنے آپ کو ٹائیگر چشمے کی عمارتوں، مختصر تالابوں، ندیوں اور ان پر ایستادہ قدیم کبڑے پلوں کے لیے وقف کر دیا.. بلکہ ایک چھوٹے سے ہال میں کچھ دیر کے لیے بیٹھ کر سامنے براجمان نوجوان چینی سازندوں کی بجائی ہوئی قدیم دُھنوں کو بھی نہایت غور سے سنا اور سر دُھنا..اور یہ سب فراغت کا کمال تھا..ایک راہداری میں دیوار میں چند مستطیل شگاف تھے..

کیوں تھے؟

اس لیے کہ اس کے پیچھے ایک مختصر باغ تھا..اور ان مستطیل شگافوں میں سے اس باغ کے گل بوٹے یوں نظر آتے تھے جیسے ایک فریم میں تصویر جڑی ہو..انسان اگر بے دھیانی میں ادھر آ نکلے تو اسے کبھی اندازہ نہ ہوگا کہ یہ تصویریں نہیں..ان کے پھول' پتے اور شاخیں زندہ اور ہرے بھرے ہیں..

ٹائیگر سپرنگ..ایک چھوٹا سا تالاب تھا..چشمہ پتہ نہیں کہاں تھا البتہ جہاں ایک چٹان کی کوکھ میں سے ایک دھار اس میں گرتی تھی وہاں ایک شیر کھڑا تھا..کیونکہ یہ ٹائیگر سپرنگ جو تھا..

میں نے اس شیر کے سر پر ایک مربیانہ تھپکی دیتے ہوئے ایک شکاری کی طرح تصویر اتروائی..کیونکہ جیسے میں یہاں تک پہنچا تھا بس جی جانتا تھا یا آپ جانتے ہیں یا لیو جانتا تھا..

ایک کبڑے پل کے اوپر چند نوجوان چینی نیچے تالاب کے ٹھہرے ہوئے خوش رنگ پانیوں میں ایک کنڈی ڈالے کھڑے تھے اور ہر چند لمحوں کے بعد ایک سبز رنگ کا چھوٹا سا مینڈک شکار کر کے..مسرت سے چیخیں مارتے اسے ایک تھیلے میں ڈال لیتے تھے..سیر کی سیر اور ہاتھ سے مینڈک نہ گیا..

ہانگ چُو میں جھیل نہ بھی ہوتی..صرف یہ ٹائیگر سپرنگ ہوتا، جسے ایک چینی راہب کی تپسیا کے نتیجے میں ایک شیر نے حاضر ہو کر کھود نکالا تھا..تو بھی ہانگ چُو میں آنا جائز ٹھہرتا..صرف اس احتیاط کے ساتھ کہ پچھلے روز آپ نے ڈنر میں کوئی چھپکلی وغیرہ تناول نہ فرمائی ہو..

ہانگ چو میں دریائے چانگ جیانگ بھی ہے..شنگھائی والا...
لوگ جھیل میں اتنے مگن رہتے ہیں کہ بے چارے دریا کی جانب کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا..

چانگ جیانگ کے کناروں پر ایک عظیم اور بلند پگوڈا..کے ٹو پہاڑ کی جسامت کا..کھڑا تھا..آج تک میں نے جتنے بھی پگوڈے دیکھے تھے' یہ اُن کا اہرام تھا..

اس کی قدامت میں جو سج دھج تھی، وہ بے مثل تھی..

باور کرنا آسان نہ تھا کہ اتنی بلند عمارت سینکڑوں برسوں سے جوں کی توں قائم کیسے ہے..

لیکن ہم یہاں بھی آئے نہیں..لائے گئے تھے..

ٹائیگر سپرنگ میں کوہ پیمائی کی مشقت سہنے کے بعد ہمیں یقینِ محکم تھا کہ اس کے بعد ہم رہا کر دیئے جائیں گے اور ہوٹل کو لوٹ جائیں گے لیکن قسمت کو..جو چینی میزبانوں کی صورت میں زرد چہرے اور پھینی ناکیں رکھتی تھیں، کچھ اور ہی منظور تھا..وہ ہمیں شیڈول میں جکڑ کر اس شاندار پگوڈے تک جانے والی بے انت سیڑھیوں کے دامن تک لے گئے..

''اب آپ چین کے اس نفیس، قدیم اور عالی شان پگوڈے کو دیکھیں گے۔''

''دیکھ لیا بھیا..'' گیسو دراز اپنی نشست سے اٹھا نہیں' صرف بال سنوارتا کسمسا کر پھر سے بیٹھ گیا..

''ہاں جی دیکھ لیا..'' پتہ نہیں کس دل جلے نے فریاد کی لے بلند کی..

لیڈر نے ایک جھرجھری سی لی اور بوکھلا کر اپنی تقریر شروع کر دی۔''میں عظیم ملک چین کے دوستوں کو عظیم ملک پاکستان کے دانشوروں اور ادیبوں کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں..یہ عظیم پگوڈا عظیم چینی قوم کی جانب سے ہمارے لیے ایک تحفہ ہے..لیکن ہم دوست ہیں اور آپ کے بیان پر یقین کرتے ہیں کہ یہ چین بھر میں سب سے عالی شان پگوڈا ہے..تو جب ہم یقین کرتے ہیں تو کوچ سے نیچے اتر کر وہ سیڑھیاں طے کر کے پھر اس کی جتنی بھی منزلیں ہیں، ان کی سیڑھیاں چڑھ کر اس کی چوٹی پر جانے کی کیا ضرورت ہے..''

سفید ریش جو ابھی تک شی آن سے خرید کردہ اپنے رُک سیک کی گمشدگی کے سوگ میں تھا، داڑھی کھجا کر بولا۔ ''اگر تو یہ کوئی قدیم سی مسجد ہوتی تو ہم کچھ تردد کر لیتے.. کچھ نفل ادا کر لیتے.. پگوڈے میں جا کر کیا ادا کرنا ہے۔''

لیل پوری، دہقانی اور جنرل نے بھی تھکاوٹ اور گرمی سے مغلوب ہو کر علمِ بغاوت بلند کر دیا. اپنے نیزوں پر انکار سجا دیا.. کہ اس گرمی میں کوچ سے باہر نہیں آئیں گے۔ پگوڈا یہیں سے صاف نظر آ رہا ہے.. بس دیکھ لیا..

تب میں نے.. اور میں یقیناً دیگر اراکین کی نسبت کہیں زیادہ نڈھال اور گرمی سے چُور چُور بلکہ شرابور تھا. تب میں نے صرف اپنی بہادری کی دھونس جمانے کی خاطر گیانی کی طرف دیکھا..

گیانی ایک ایسا شخص تھا جو ''گیم'' تھا۔

وہ ہمیشہ ایک ایڈونچر کے لیے کمربستہ رہتا تھا..

جب کبھی کسی عمارت، قدیم یادگار، تصویر یا کسی لڑکی کو دیکھ کر اس کے بیوروکریٹک دل میں چلبلاہٹ سی ہوتی تو وہ ایکسائٹ ہو کر جہاں کھڑا ہوتا.. وہاں سے تھوڑا پیچھے ہٹتا اور پھر ایک گگلی باؤلر کی مانند چند نپے تلے قدم اٹھا کر بازو گھما کر غیر موجود بال کو غیر موجود بیٹس مین کی جانب پھینک دیتا اور مونچھوں کو سکیڑ کر اپنے آپ سے ہی اپیل کرتا کہ ہاؤز یٹ؟.. اور پھر خود ہی انگلی کھڑی کر کے آؤٹ دے دیتا.. کرکٹ میں اس کی دلچسپی کریز کی حد تک تھی اور وہ مجھے تارڑ کی بجائے اکثر ''سکپر'' کے نام سے مخاطب کرتا..

جونہی میں نے گیانی کی طرف دیکھا تو اس نے اپنی نشست سے اٹھ کر مجھے ایک جعلی سا سلیوٹ کیا اور نعرہ لگایا۔ ''او کے سکپر۔''

ہم دونوں کوچ سے اتر گئے..

اور کوچ کے باہر جو گرمی اور جو حبس تھا، اس نے ہمارے منہ ٹیڑھے کر دیئے.. لیکن ہم پگوڈے تک جانے والی پتھریلی سیڑھیوں پر ہانپتے نچڑتے چڑھتے گئے..

اور جب ہم اس بلند سطح پر پہنچے جہاں سے یہ تیرہ منزلہ پگوڈا اپنی سینکڑوں

کھڑکیوں اور قوس نما چھتوں کے ساتھ آسمان کو جاتا تھا اور ہم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو ہمت ہار گئے اور ہماری غیر موجود دستاریں گر گئیں..

''سکپر... یہ تو بہت ہی اونچا ہے۔''

''ہمتِ مرداں.. اور مددِ خدا گیانی جی.. ہم انشاء اللہ اس کی تیرہویں منزل پر پہنچ کر ہانگ چُو اور اس کی جھیل کا ایک طائرانہ نظارہ کریں گے اور کوچ میں بیٹھے سست الوجود اراکین کے لیے عبرت کا سامان پیدا کریں گے۔''

''سوچ لیں سکپر.. آپ کا سانس تو ابھی سے اکھڑ رہا ہے۔''

''سوچ لیا گیانی جی.. آپ کی کرکٹ کے بارے میں ہی تو کہا جاتا ہے کہ یہ گلورئس چانسز کا کھیل ہے.. تو یہ بھی ایک گلورئس چانس ہے.. یہ چانس لیتے ہیں..''

بلندی بادشاہی مسجد کے مینار سے کم نہیں لگتی تھی..

ہم پگوڈے کے مرکزی دروازے میں سے داخل ہو کر اندر گئے تو وہاں ایک کاؤنٹر تھا جس کے عقب میں ایک شی آن کی آسمانی آفت ایسی مائی بیٹھی گرمی کی ماری اونگھ رہی تھی.. اس نے ہماری آہٹ سن کر پہلے ایک آنکھ کھولی اور پھر دوسری نیم وا کی اور ہمیں یہ دل دوز اطلاع دی کہ پگوڈے کے اوپر جانے کے لیے پتہ نہیں کتنے ڈھیر سارے یوآن کا ٹکٹ خریدنا ہوگا.. اس اطلاع نے ہماری آتشِ شوق کو فی الفور ٹھنڈا کر دیا اور ہم بجھ سے گئے کہ ایک تو اتنی شدید گرمی میں پگوڈا پیمائی کی مشقت کریں اور پھر اپنے پلّے سے ادائیگی بھی کریں.. اتنی رقم سے تو یونی کے سووینئر بازار سے ایک اور چینی ٹی سیٹ ''گڈ مارننگ'' خریدا جا سکتا تھا..

''سر،'' میں گیانی سے مخاطب ہوا۔ ''کبھی کبھار ناگزیر وجوہات کی بنا پر میچ منسوخ بھی تو کیا جا سکتا ہے.. کیا خیال ہے؟''

''میچ ابانڈنڈ..'' گیانی نے ایک امپائر کی طرح فیصلہ دے دیا..

ہم باہر آئے اور پگوڈے کے دامن میں واقع سووینئر شاپس کے برابر میں جو قہوہ خانہ تھا اور درختوں تلے ویران تھا، وہاں بیٹھ گئے.. یہاں سے دریائے چانگ جیانگ بہت نیچے پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا.. اور وہیں کہیں ہماری کوچ تھی جس میں سے برآمد ہوتے ہوئے ہم

نعرہ لگا کر آئے تھے کہ اے کم ہمت لوگو، ہم تو پگوڈے کی آخری منزل تک ہو کر ہی لوٹیں گے..

ہم سوچ میں تھے کہ اب کس منہ سے نیچے جائیں..اور یہاں مجھے اپنے ایک نزدیکی عزیز بہت یاد آئے..

یہ 1952ء کی بات ہے جب پورا پنجاب شدید سیلاب کی زد میں آ گیا. تقریباً ہر شے ڈوب گئی یہاں تک کہ لاہور کے جنرل پوسٹ آفس کے قریب بھی پانی یلغار کرتے ہوئے آ گئے اور پار جانے کے لیے کشتیاں استعمال کی گئیں۔ نزدیکی عزیز اپنے گاؤں واپس جانا چاہتے تھے..بڑی مشکل سے شاہدرہ تک پہنچے جہاں پانی سمندر ہو رہے تھے اور ان میں جانوروں اور انسانوں کی لاشیں بہہ رہی تھیں اور کہیں کہیں سانپ بھی بے بسی سے ڈوبتے ابھرتے تھے..قبلہ نزدیکی عزیز جب ان پانیوں میں قدم رکھنے لگے تو آس پاس کھڑے لوگوں نے سمجھایا کہ آپ ایسا نہ کریں، ڈوب جائیں گے..تب انہوں نے سینے پر دوہتڑ مار کر اعلان کیا کہ میں وہ شخص ہوں جو ایک بار قدم اٹھا لے تو اسے واپس نہیں کرتا..یہ کہہ کر پانی میں اترے اور فوراً قلابازیاں کھاتے ہوئے اس کے بہاؤ کی شدت میں شامل ہو گئے..شلوار پھول کر پیراشوٹ ہو گئی، زندگی بھر اتنا پانی نہیں پیا ہو گا جتنا چند غوطوں میں اندر چلا گیا..بہر حال قسمت اچھی تھی ہاتھ پاؤں مارتے کنارے سے آن لگے..اب واپس شہر جانے کے راستے میں وہی لوگ ابھی تک کھڑے تھے جن کے سامنے انہوں نے بڑھتے ہوئے قدم کو پیچھے نہ ہٹانے کا اعلانِ بانگ دہل کیا تھا..کس منہ سے واپس جاتے۔ چنانچہ کنارے پر پڑے ٹھٹھرتے رہے اور جب رات ہوئی تو چھپتے چھپاتے واپس شہر پہنچے..تو اب ہم دونوں بھی کس منہ سے واپس جائیں..

''گیانی جی اب کیا کریں؟''

''نو پرابلم..اِٹس آل ان دے گیم سکپر..'' وہ نہایت اطمینان سے بولے۔ ''نیچے جا کر بیان دے دیں گے کہ ہم پگوڈے کی آخری منزل تک تو نہیں صرف پانچویں منزل تک ہی گئے ہیں اور وہاں سے جتنا بھی نظارہ دکھائی دیتا ہے، دیکھ آئے ہیں..ہمیں یہاں کون دیکھتا ہے۔''

''یس سر..'' میں نے گیانی صاحب کو انہی کے انداز میں سلیوٹ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں سانس درست کرتے..پسینے میں شرابور سیڑھیاں اترتے نیچے پہنچے..کوچ کے اندر کی ٹھنڈک میں تقریباً سبھی لوگ نیم خوابیدہ تھے..لیکن ہمارا استقبال اس طرح کیا گیا جیسے بیس کیمپ میں ٹھہر جانے والے ٹیم ممبر اپنے ان ساتھیوں کا استقبال کرتے ہیں جو جواں مردی اور بہادری کا بے مثال مظاہرہ کرتے ہوئے ایورسٹ یا کے ٹو کو فتح کر کے نیچے آ رہے ہوتے ہیں..

''جی گیانی جی..ہو آئے جناب؟''

''ہاں جی۔'' گیانی نے اپنی تیکھی مونچھوں کو بل دیا۔ ''لیکن یار تیرھویں منزل تک تو نہیں پہنچ پائے..صرف ساتویں منزل تک پہنچ سکے..لیکن وہاں سے بھی کیا کمال کے نظارے تھے..آپ لوگ محروم رہ گئے..''

چونکہ میں بری طرح ہانپ رہا تھا اور گیانی مجھ سے ذرا آگے تھا، اس لیے مجھے یہ مکالمہ ٹھیک طرح سے سنائی نہ دیا..

حسرت ناک نے نہایت حسرت سے مجھے دیکھا اور کہنے لگا ''ہاں جی..آپ بھی ہو آئے؟''

''ہاں یار'' میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ ''بس یوں سمجھ لو کہ بادشاہی مسجد کے مینار پر چڑھنے والی بات ہے..سانس پھول گیا اس لیے ٹاپ پر تو نہیں پہنچے، پانچویں منزل سے ہی نظارہ کر کے نیچے آ گئے..''

''گیانی صاحب تو کہہ رہے تھے کہ آپ ساتویں منزل تک گئے تھے..'' یہ دہقانی کہانی کار تھا، گانٹھ کا پکا..

گیانی صاحب نے صورت حال کو فوری طور پر سنبھال لیا۔ پہلے میری طرف دیکھ کر ایک آنکھ ٹکائی اور پھر نہایت دھیرج سے بولے۔ ''یار گرمی بہت تھی، کچھ پتہ نہیں چلا کہ کونسی منزل تک پہنچے ہیں لیکن منظر نہایت اعلیٰ تھا..آپ لوگ محروم رہ گئے۔''

”دریائے بہار پر پھول اور چاندنی اور تتلی پیکنگ کی“

شام کا دریا ہموار اور پُر سکون ہے..
بہار کے رنگ ابھی ابھی پوری طرح کھلے ہیں..
دفعتاً ایک لہر چاند کو دور بہا لے جاتی ہے..
اور لہر کا پانی ستاروں کو لادے ہوئے آتا ہے
(سوئی خاندان کا شہنشاہ یانگ تی۔605ء)

کسے معلوم تھا کہ حبس اور گرمی کے ستائے ہوئے مسافروں کے نصیب میں یہ شب ہوگی..

کون جانتا تھا کہ ہانگ چُو کے پیاس کے صحرا میں بھٹکنے والے اونٹوں کو یہ منظر بھی دکھائی دے گا کہ جہاں تک نظر جاتی ہے، پانی ہی پانی ہیں اور ان کی لہریں ستاروں سے لدی اُن تک آتی ہیں..

یہ تو سراب لگتا تھا..

ہانگ چُو ہوٹل کی آخری منزل پر واقع ڈائننگ ہال کی چاروں دیواریں سراسر شیشے کی تھیں اور ان میں نیچے پھیلی ہوئی جھیل کے پانی امڈتے ہوئے آ رہے تھے..اور شام کا دریا ہموار اور پُر سکون تھا..

اور جھیل پر وہ شام تھی جو اسے سرمئی کرتی تھی، اسے چینی مصوری کی ایک قدیم تصویر کرتی تھی۔جھیل کو آغوش میں لینے والی پہاڑیاں اب ایسی دھند میں تھیں جس میں پوشیدہ پھونس کا وہ جھونپڑا ہے جس میں بسیرا کرنے کی خواہش ہر قدیم چینی شاعر کا خواب تھا..

یہ ایک سحر گرفت..حواس کو بوکھلا دینے والا منظر تھا..چاروں اَور شیشے کی دیواروں پر ڈائننگ روم کی سینکڑوں روشنیاں اور میزوں پر جلنے والی موم بتیوں کی بھڑک اور لشک تھی اور ان شیشوں کے پار جھیل کا آبی شہر پھیلا ہوا تھا..بے انت اور بے حساب وسعت میں..شیشوں پر بھڑکنے لشکنے والی روشنیاں جھیل کے پانیوں پر دمکتے ستارے لگتے تھے..

اس منظر میں پانیوں اور پہاڑیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا اور حیرت ہوتی تھی کہ ہانگ چُو شہر اور اس کی عمارتیں اور روشنیاں کہاں گئیں..

شاید وہ سب ہوٹل کی پہلی منزلوں پر ہی کہیں رہ گئی تھیں اور اس آخری منزل تک صرف جھیل کے پانی ہی پہنچ پائے تھے..

تتلی اڑتی پھرتی تھی..

”اب کہو..کچھ تسلی ہوئی..کچھ افاقہ ہوا..ایسے منظر پر کبھی نگاہ کی؟“

”نہیں..“ میں نے اقرار کیا..

ہانگ چُو یاترا کے بعد جب اراکینِ وفد ہوٹل واپس پہنچے تو سب کے سب بُرے حالوں میں تھے..تھکن اور گرمی نے ہمارے دل اور بھیجے پگھلا دیئے تھے..پسینے سے نچڑتے ہمارے بدن بیچارگی اور تھکاوٹ کے ماسٹر پیس تھے..ہمارے چہرے اور نین نقش کچھ آگے پیچھے ہو گئے تھے، پگھلنے کی وجہ سے..

حسرت ناک کی ناک ایک مردہ مینڈک ہو رہی تھی۔گیسو دراز کے بال اس کے پسینے سے بھیگے ہوئے ماتھے پر سمندری کائی کی طرح چپکے ہوئے تھے۔لیڈر کی چُندیا گیلا چاند ہو رہی تھی۔دہقانی کا دماغ چل گیا تھا اور وہ سب کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا..لیل پوری پہلے راؤنڈ میں ہی ناک آؤٹ ہو جانے والے ایک باکسر کی طرح ہانپ رہا تھا..سفید ریش اگر دستِ سوال دراز کر دیتا تو لوگ اس کی حالت دیکھ کر اس کی ہتھیلی پو آنوں

سے بھر دیتے..اور میری توند ایک سومو پہلوان کی طرح میرے قابو میں نہ آتی تھی اور میری آنکھیں یوں ابلی پڑتی تھیں جیسے ابھی شیشے کی گولیوں کی طرح ٹپ ٹپ ہوٹل کے فرش پر گریں گی اور میں نابینا ہو جاؤں گا۔صرف گیانی تھا جو قدرے حواس میں لگتا تھا..ان حالتوں میں جب ہم اپنے بستروں پر جا گرے تو ایسے گرے کہ جوگرز اتارنے کی بھی ہوش نہ رہی..بدن کا ہر حصہ الگ الگ ہو چکا تھا..

چنانچہ اس ریزہ ریزہ بدنی کیفیت میں جب ہمیں بیدار اور ہوشیار ہونے کا حکم دیا گیا اور یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ آج شام۔یعنی ابھی ابھی..اسی ہوٹل کی آخری منزل پر ہانگ چُو کے ادیبوں کی جانب سے ہمارے اعزاز میں ضیافت دی جا رہی ہے تو ہماروں سروں پر بجلی گر پڑی۔ہم تباہ و برباد ہو گئے کہ ہم میں نہ ہمت تھی اور نہ چاہت تھی..ہم وہ طوائفیں تھے جن پر مزید گاہک بھگتانے کا یارانہ تھا۔لیکن شیڈول میں یہی درج تھا..اور یہی ہونا تھا..چنانچہ ہم نے بستروں پر بکھرے اپنے بدن کے سپیئر پارٹس بمشکل اکٹھے کیے۔انہیں جوڑ کر اپنے آپ کو مینوفیکچر کیا۔ملبوس کیا اور لفٹ میں سوار ہو کر ہوٹل کی سب سے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔

لفٹ کا دروازہ کھلا..تو سبھی جھجک گئے کہ سامنے جھیل ہانگ چُو کے پانی تھے اور ذرا سی بے احتیاطی سے ہم ان میں گر کر ڈوب سکتے تھے..

شیشے کا یہ گھر جو ایک پوری منزل پر پھیلا ہوا ایک ڈائننگ روم تھا، اہل ہانگ چُو سے اٹا پڑا تھا..اور ان کی خوش کلامیوں کی سرگوشیوں سے لبریز ہو رہا تھا..

اور اہل ہانگ چُو خود بھی لبریز ہو رہے تھے کہ ان کے سامنے خوراک کے علاوہ سامانِ خمار چھلکتے تھے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ویٹر ان کے جاموں کو نہیں بھرتے بلکہ وہ خود ذرا سا ہاتھ بڑھا کر جھیل ہانگ چُو کے شراب پانیوں سے انہیں لبریز کر لیتے ہیں۔ہم میزوں کے درمیان میں سے گزرتے، دوستی اور بھائی چارے کی بیوقوفانہ مسکراہٹیں بکھیرتے جب ہم اپنی میز کی طرف بڑھتے تھے تو مجال ہے کسی ایک ہانگ چوئی نے آنکھ اٹھا کر بھی ہمیں دیکھا ہو..شائد ایسی زندگی سے چھلکتی محفل میں ہم ایک اچھا شگون نہیں تھے..

لیکن ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں تھے..ہم نے حسب مقدور اپنے آپ کو سمارٹ بنا رکھا تھا۔شلوار قمیض کی بجائے کہ ازار بند بے قابو ہو جانے کا چانس ہی باقی نہ رہے، میں نے ایک نیلی جین چڑھا رکھی تھی جو بہر طور ہر چند لمحوں کے بعد میری توند سے کھسک کر خطرناک حد تک نیچے ہو جاتی تھی اور میرے جوگرز کے گرد ڈھیر ہونے کو آتی تھی، اسی لیے میں نے ڈینم کی شرٹ نیلی جین کے اندر نہیں اڑسی تھی تاکہ اگر وہ گر بھی جائے تو کچھ پردہ پوشی ہو جائے..گیسو دراز ایک سفید براق شرٹ کے ساتھ ٹائی بھی باندھ کر آیا تھا جو اس کی اکلوتی ٹائی تھی اور امکان غالب تھا کہ وہ دوبارہ شیو کر کے آیا ہے..لیڈر اور گیانی خوش لباسی کی انتہا کو چھو رہے تھے۔یہاں تک کہ دہقانی بھی ایک سوٹ میں پھنسا ہوا تھا..اور حسرت ناک..ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دے رہا تھا اور مسلسل خود کلامی میں مصروف تھا.."کوئی تُک ہے؟ نہیں کوئی تُک نہیں..یوفی کا مقبرہ دیکھنے کی کیا تُک ہے۔اگر ہم نے جہانگیر کا مقبرہ دیکھ رکھا ہے تو ایک اور مقبرہ دیکھنے کی کیا تُک ہے۔ٹائیگر سپرنگ میں کیا تھا..کچھ بھی نہیں..ایک شیر تھا وہ بھی پتھر کا..اور پگوڈا کیا کرتا تھا..کیا کرنا تھا..کمال ہے ہمیں پہلے کسی نے نہیں بتایا..کیوں نہیں بتایا کہ اسی ہوٹل کی آخری منزل سے یہ منظر دکھائی دیتا ہے..کیوں نہیں بتایا..پتہ نہیں کیوں نہیں بتایا۔کیسی سہانی شام ہے..کہ نہیں ہے..میرا خیال ہے کہ..تو یہ کیا شام ہوئی..یار اس شہر کا کیا نام ہے؟.."اس نے کسی سے پوچھا اور پھر رواں ہو گیا۔"ہاں..شام ہانگ چُو ہے..یار یہ جو چینی ہیں، یہ شراب پی رہے ہیں؟ شراب ہی لگتی ہے..اتنی کیوں پی رہے ہیں..."

ہماری میزبان اور ہانگ چُو کے شاعروں، ادیبوں کی سربراہ ایک نہایت مزیدار اور خوشگوار شخصیت کی مالک ایک خاتون تھیں..اگرچہ وہ ڈیل ڈول سے ویٹ لفٹر لگتی تھیں لیکن وہ ایک نہایت پُرشفقت پھپھی کی مانند ہم سب سے نہایت محبت اور گرم جوشی سے مل رہی تھیں..بقیہ ادیب بھی سٹریل اور سنجیدہ نہ تھے بلکہ نہایت کھلنڈرے اور چلبلے تھے..

"اب کہو..کچھ تسلی ہوئی..کچھ افاقہ ہوا..ایسے منظر پر پہلے کبھی نظر کی؟" تتلی نے پھر پوچھا اور میں نے پھر اقرار کیا کہ..نہیں! اور پھر شیشے کی دیواروں کے پار ہانگ چُو کی

رات میں جھیل کے کراں بہ کراں پھیلے پانیوں کے سحر اور زہر سے ڈسا جانے لگا..

ڈنر کے بعد ہر کسی کا جامِ صحت پیا گیا بلکہ جس کسی کی صحت کمزور تھی اور وہ زیادہ تر چینیوں کی تھی، ان کے لیے بار بار پیا گیا.. یہاں تک کہ پینے والوں کی صحت کے بارے میں خدشہ پیدا ہو گیا..اور جتنی بار پیا گیا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میزبانوں اور مہمانوں کی صحت اتنی کمزور ہے کہ اگر نہ پیا گیا تو فی الفور فوتیدگی کا امکان ہے..ہماری مہربان اور چینی پھپھی ہر بھتیجے کے پاس جا کر اس کی میز پر دھرے گلاس سے اپنا جام ٹکراتی اور اسے اٹھا کر ایک ڈیک لگا کر پی جانے پر مائل کرتی..عجیب پھپھی تھی..

اور وہاں اس آبی طلسم کے ناظر صرف ہم نہ تھے..لیو، خاور اور وانگ لی بھی تھے اور ان کی کایا بھی پلٹ چکی تھی..وہ پہلی بار اپنی آفیشل پوزیشن سے باہر آ کر ہم جیسے ہو گئے تھے..یعنی نارمل قسم کے انسان' ورنہ وہ اکثر مواقع پر ذرا الگ الگ رہتے۔ ہماری سہولتوں کا دھیان رکھتے' ہماری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف رہتے اور جب کبھی کوئی ایسی شام آتی تو وہ ہمیں ایک فاصلے سے لطف اندوز ہوتے دیکھتے رہتے لیکن شریک نہ ہوتے..اور آج یہ تھا کہ لیو قہقہے لگا رہا تھا..خاور کسی چینی دوشیزہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تو مجھے آنکھ مارتا..اور منگولین وانگ لی..جو تقریباً متروک ہو چلی تھی، نہایت چلبلی ہو رہی تھی اور اپنی سادہ شکل کو بھی فراموش کر چکی تھی..اور جو سنہری وانگ لی تھی..کیونکہ وہ بھی تو تھی..جانِ بہاراں..رشکِ چمن..صرف وہ تھی..کہ یہ محفل جو آج سجی ہے، اس محفل میں کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے..پر کون سامنے آئے..سوائے ہانگ چو کی جھیل کے جو سامنے آتی تھی..

آج تو مجھے حسرت ناک پر بھی پیار آ رہا تھا..

شاید اس لیے کہ میں بھی خمار میں تھا..جھیل کے پانیوں نے مجھ پر بھی از خود رفتگی طاری کر دی تھی..وہی از خود رفتگی جس میں لی پو مدہوش اٹھتا تھا اور چاندنی میں نہائی ندی کے کنارے جا پہنچتا ہے اور وہاں پرندے جا چکے ہیں اور آدمی بھی نہیں تھے..

وہی از خود رفتگی جس میں لی پو پانیوں میں چاند کا عکس دیکھ کر اسے پانے کی

خواہش میں کشتی سے کود گیا تھا اور ڈوب گیا..

اگرچہ ڈائننگ ہال میں ہانگ چو کی دوشیزائیں پرندوں کی طرح چہک رہی تھیں..اور آدمی بھی بہت تھے..

اور ایسی زندگی میں کبھی کبھار وارد ہونے والی یکتا کیفیت میں وہ لمحہ چپکے سے در آیا۔ جب مجھے ایک مرتبہ پھر قربتِ مرگ کا احساس ہوا..کچھ زیادہ برس نہیں رہ گئے تھے..اگر رہ گئے تھے..سانس کا نقارہ دن رات بج رہا تھا..اور مرگ کی قربت کی خبر دیتا تھا..بنجارے نے ایک روز لاد چلنا تھا اور سب سامان پڑا رہ جانا تھا..یہ ہانگ چو کی جھیل بھی...سب سامان..میں لہسن کے پتوں پر گری وہ شبنم تھا جو سوکھ رہی تھی..

کتنی جلدی سوکھ جاتی ہے، لہسن کے پتوں پر شبنم
جو شبنم آج سوکھ جاتی ہے، کل پھر برسے گی..
مگر جو قبر میں چلا گیا..
کبھی لوٹ کر نہ آئے گا..

کبھی لوٹ کر نہ آنے کا خیال ہی اس منظر کو حسن دیتا تھا اور ایک اندوہ سے جی بھرتا تھا..

قبرستان کس کی زمین ہے..
یہ بھوتوں کا پُرہجوم گھر ہے..
دانا اور بے وقوف شانہ بہ شانہ،
موت کا بادشاہ سب کو طلب کر لیتا ہے
نوشتۂ تقدیر کسی کا انتظار نہیں کرتا..

کچھ زیادہ برس نہیں رہ گئے تھے..اگر رہ گئے تھے تو..جب موت کے بادشاہ نے مجھے بھی طلب کر لینا تھا۔ یہ قنوطیت نہیں حقیقت ہے، لیکن اس حقیقت کا احساس تبھی ہوتا ہے جب ایک شب جھیل ہانگ چو یوں سامنے ہوتی ہے..

''ایکسکیوزمی..'' یہ قدیمی وانگ لی تھی جو مجھے موت کے بادشاہ کے دربار میں بولی تھی..وانگ لی میرے برابر کی کرسی پر بیٹھی چہرہ فروغِ مے سے فروزاں کیے ہوئے بیٹھی تھی..میں نوشتہ تقدیر اور موت کے بادشاہ کی حضوری میں جو تھا، اس لیے مجھے چند لمحے واپس آنے میں لگے۔ ''ہاں وانگ لی..''

''اگر آپ اجازت دیں تو..اور مائنڈ نہ کریں تو یہ وانگ لی..'' اس نے اپنے برابر میں براجمان سنہری شے کی جانب اشارہ کیا۔ ''آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔''

میں اپنے آپ میں اور موت کے بادشاہ کی حضوری میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اس وانگ لی کے سنہری سراپے سے بھی غافل ہو گیا تھا جو آدھے بازوؤں کے ایک نیلے فراک میں تھی..سیاہ بالوں کو ایک چٹیا کی صورت میں گوندھے ہوئے..کس کر باندھے ہوئے اپنے ماہتاب چہرے پر وہی مسکراہٹ سجائے جو آنکھوں کو چندھیا کر انسان کو لیمپ پوسٹ سے ٹکرا دیتی ہے..میں نے قدیمی وانگ لی سے نظر ہٹا کر جب اسے دیکھا تو اس کے گول سندھوری چہرے پر مسکراہٹ سمٹ رہی تھی..جیسے کسی ڈر میں ہو۔

''ہاں ڈیئر وانگ لی۔ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ وانگ لی بھی کچھ کہے۔'' میں ہنسنے لگا..اور قربتِ مرگ سے باہر آ گیا..

''یہ کہتی ہے..'' وانگ لی اوّل کی مسکراہٹ اس کی ترچھی آنکھوں کو معدوم کرنے لگی۔ ''..کہ..یو آر اے ویری ہینڈسم مین..''

''وا...وہاٹ؟'' میں ہکلا سا گیا..

''ہاں..یہ کہتی ہے کہ میں انگریزی نہیں جانتی لیکن اس سے کہو..ترجمہ کرو۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا..وانگ لی اوّل یقیناً اوّل درجے کے خمار میں تھی..یا دونوں ہی ٹُن تھیں اور یہ ہر دو چینی دوشیزائیں ایک بوڑھے شخص کے ساتھ اٹکھیلیاں

کر رہی تھیں..میں چپ ہو گیا..لیکن ہر دو وانگ لیاں میری جانب تکتی جا رہی تھیں اور شاید جواب کی منتظر تھیں..

''تتلی..'' میں نے دہائی دی..

تتلی فوراً حاضر ہو گئی..

''اس وانگ لی نے..اُس وانگ لی کے حوالے سے جو چندے آفتاب وغیرہ ہے، ایک عجیب و غریب سٹیٹ منٹ دی ہے..مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکیاں اس بوڑھے کی عاقبت خراب کرنے پر تلی ہوئی ہیں..''

''عاقبت تو تمہاری پہلے سے خراب ہو چکی ہے..مزید گنجائش نہیں ہے..اور یہ اتنی لڑکیاں بھی نہیں ہیں، باقاعدہ عورتیں ہیں جو تمہیں لڑکیاں دکھائی دے رہی ہیں..لیکن میں سن رہی تھی..سنہری وانگ لی نے یہی کہا تھا..''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟''

''یہ ممکن ہے..تم اپنے آس پاس نظر کرو..ایک پاکستانی مرد..بے شک وہ حسرت ناک ہی کیوں نہ ہو..اور تمہاری عمر کا ہو..ایک عام چینی کے مقابلے میں بہرحال اپنے ناک نقشے اور شباہت کے باعث ہینڈسم ہوتا ہے..''

''تو اب میں کیا کروں تتلی؟''

''اپنے تجربے کو بروئے کار لا کر کچھ کرو..میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتی۔'' اور تتلی پُھر سے اڑ گئی..

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ میں کیا کروں..میرے محدود تجربے میں سے کوئی ایک بھی ایسا تجربہ نہ تھا جسے میں بروئے کار لا سکتا تھا..سنہری وانگ لی شاید چینی شراب کے زیرِ اثر تھی جو اس نے ایک انہونی بات کہہ دی..تو اب میں کیا کہوں؟

اسلام آباد سے بیجنگ کی پرواز پر ایک ایئر ہوسٹس نے اس روز کا اخبار میرے آگے پھیلا کر کہا تھا۔ ''سر اس میں آپ کا انٹرویو اور تصویریں ہیں۔'' اور یہ کیا حسین اتفاق تھا کہ برسوں بعد میرا کوئی انٹرویو شائع ہوا تھا اور عین اس روز شائع ہوا تھا جب میرا جہاز

سوئے چین رواں تھا..میں نے وہ اخبار سنبھال لیا.کسی حد تک اپنی پھولتی ہوئی انا کی خاطر اور دراصل اپنے بچوں کی تصویروں کے لیے..میں نے فوراً وہ اخبار اپنے بیگ میں سے برآمد کیا اور سنہری وانگ لی کے سامنے اس کے اوراق نمایاں کر دیئے۔''میرا خیال ہے کہ میرا بیٹا سمیر مجھ سے کہیں زیادہ ہینڈسم ہے..یہ دیکھیں یہ اس کی تصویر ہے۔''

اپنی وانگ لی نے فوراً ترجمہ کیا اور اپنی سنہری بہن کو خبر کر دی۔

''ہاں..یہ لڑکا بھی ہینڈسم ہے۔''سنہری بہن نے بذریعہ وانگ لی اول اپنی گولڈن سائل کے لشکارے ڈالتے ہوئے کہا۔''لیکن..میں آپ کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔''

اس لمحے حسرت ناک نے..جو ہر دو وانگ لیوں کو میری قربت میں تادیر گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر جل کر راکھ ہو چکا تھا....ایک زہر آلود تیر میری جانب پھینکا۔''اوئے..اب بیٹے کی تصویر دکھا کر لڑکی کو پھانس رہے ہو؟''اور پھر اپنی محبوب خود کلامی میں مصروف ہو گیا..

سنہری وانگ لی نے نہایت رغبت سے وہ پاکستانی اخبار دیکھا..''ہاں یہ بھی ہینڈسم ہے لیکن میں تو تمہارے بارے میں بات کر رہی ہوں۔''

اب میں کیا بات کرتا..مجھے درجن بھر برسوں میں کسی بھی ایسی سنہری خاتون نے تو کیا..میکبتھ کی کسی چڑیل نے بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا...اور یہ سنہری خاتون بھی محض سنہری نہیں تھی بلکہ میرے دورۂ چین کی سب سے حسین اور سحر انگیز خاتون تھی..تو میں کیا بات کرتا..

تب وارث شاہ میری مدد کو آیا..

ہیر رانجھے کے قصے میں جب وارث ہیر کے حسن کو بیان کرتا ہے تو سیانوں کا کہنا ہے کہ دنیا بھر کی شاعری میں عورت کے حسن اور بدن کا بیان جہاں کہیں بھی آیا ہے' وارث کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے..ہومر اور شیکسپیئر تو کیا امراء القیس جیسے شاعر بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ پاتے..ہیر کے حسن کو بیان کرتے ہوئے وہ دنیا بھر کے استعارے نگینوں کی مانند

جڑتا چلا جاتا ہے..کبھی وہ اس کی بھنوؤں کو لاہور کی کمان کہتا ہے..کبھی اس کی ٹھوڑی کو ولایتی سیب سے تشبیہ دیتا ہے..کہیں ہیر کو چین اور کشمیر کی تصویر کہتا ہے..اس کی رانوں کو بلخ کے سیبوں کی قربت میں لے جاتا ہے..اس کی چال کو قندھار سے اترنے والی فوج سے جا ملاتا ہے..اور اسی بیان میں وہ مصرعہ آتا ہے جس نے اس شام ہانگ چو میں مجھے بے زبان ہونے سے بچا لیا..

''وانگ لی..''یہ منگولین وانگ لی اس لمحے ایک ایسی سہیلی تھی جو اپنی دوست کے لَو لیٹرز پہنچانے کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی۔''اس..سنہری وانگ لی کا شکریہ ادا کرو اور اسے کہو کہ ابھی ابھی میری مادری زبان پنجابی کے ایک بڑے شاعر وارث شاہ نے میرے کان میں کچھ کہا ہے..اور وہ کچھ میں اسے کہنا چاہتا ہوں۔''

''ایک لحہ..''منگولین وانگ لی نے مجھے روکا۔''میں اتنا طویل فقرہ ترجمہ نہیں کر سکتی.تم آہستہ آہستہ بات کرو۔''

میں نے آہستہ آہستہ اپنا بیان دوہرایا..

اور وانگ لی نے آہستہ آہستہ اس کا ترجمہ چینی زبان میں کیا جسے سنہری وانگ لی نہایت سنجیدہ شکل بنائے سنتی رہی۔

''وارث شاہ ہیر کے حسن کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے..

تلی پیکنے دی تے نقش روم والے۔''

''ایک لحہ..''تھوڑی سی عاجز آتی وانگ لی نے مہلت مانگی..

''یعنی ہیر کے نین نقش یونانی تھے اور وہ اتنی خوبصورت تھی کہ پیکنگ کی ایک تلی یعنی گڑیا لگتی تھی..''

''ایک لحہ..''اس نے پھر مجھے روک دیا..

''بیجنگ..شنگھائی اور شی آن میں مجھے کہیں بھی پیکنگ کی اس تلی کی تصویر نظر نہ آئی تو میں نے سمجھا وارث شاہ نے جھوٹ بولا تھا..''

''اوہو..یہ بہت طویل ہے۔ایک لحہ۔''

''لیکن اب ہانگ چُو آیا ہوں تو وارث شاہ پر یقین آ گیا.. کہ تم واقعی پیکنگ کی وہ پتلی ہو۔''

وانگ لی اول نے جانے کن چینی لفظوں میں میرے اس خیال کا ترجمہ کیا لیکن سنہری وانگ لی تک جو کچھ بھی پہنچا، وہ اس کا رنگ متغیر کرنے کے لیے کافی تھا.. ایک سرخی سی تیری.. ایک بے یقین سی جھلک.. اور پھر اس نے براہ راست مجھ سے کہا ''پو.. پو'' یعنی ''نہیں۔نہیں''

اور میں نے اپنے خزاں رسیدہ دانتوں کی خوفناک نمائش کرتے ہوئے فوراً کہا۔
''توئے.. شرت..'' یعنی ''ہاں۔ہاں۔''

اس مکالمے کے بعد سنہری وانگ لی یکدم اجنبی ہوگئی اور وفد کے دوسرے اراکین اور مقامی ادیبوں کے ساتھ گفتگو کرنے لگی..

مجھے وارث شاہ پر غصہ آنے لگا جس کی وجہ سے میں نے یہ بونگی ماردی تھی اور ضرورت سے زیادہ رومینٹک ہوگیا تھا..

لیکن لاتعلقی عارضی ثابت ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر ملتفت ہوئی یعنی مترجم وانگ لی کے راستے اور کہنے لگی۔''میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم ہمیشہ پاکستانی سگریٹ پیتے ہو۔ حالانکہ چینی سگریٹ بھی نہایت عمدہ ہوتے ہیں.. میں وفد کے اراکین کے لیے چینی سگریٹ لے کر آئی ہوں.. کیا تم پینا پسند کرو گے؟''

''ہاں..'' میں پھر ہانگ چو کی خمار آلود شب کے سحر میں گرفتار ہوگیا۔''مگر شرط یہ ہے کہ یہ چینی سگریٹ تم اپنے ہاتھ سے سلگاؤ گی..''

وہ اس درخواست پر ہنس دی.. نشست سے اٹھی.. ایک چینی سگریٹ مجھے پیش کیا اور جب میں نے اسے لبوں سے لگایا تو اس نے لائٹر سے اسے سلگا دیا.. اس لمحے ایک تصویر کھنچ گئی.. اس کے بعد اس نے وفد کے ان ارکان کو جو سگریٹ پھونکتے تھے، یہی سہولت مہیا کی..

سنہری وانگ لی نے یہاں اپنے شادی شدہ ہونے اور ایک بیٹے کی ماں ہونے

کا قطعی تذکرہ نہ کیا۔ البتہ اُس نے میری ایک الجھن کو سلجھا دیا.. اگرچہ وہ بوٹے سے قد کی تھی لیکن اس کا بدن نہایت کسا ہوا بلکہ کسرتی دکھائی دیتا تھا.. جب چلتی تھی تو جیسے ہوا میں چلتی تھی۔ ایک بیلے رینا کی مانند.. تو اس نے بتایا کہ ایک زمانے میں وہ بین الاقوامی سطح کی جمناسٹ تھی اور اس نے دنیا کے کئی بڑے شہروں میں پرفارم کیا تھا.. اور ان میں شاید اسلام آباد بھی شامل تھا..

وہ میرا سگریٹ سلگا کر پھر مجھ سے غافل ہوگئی..

اور جب ایک عرصے کے بعد اسے میرا خیال آیا تو ذرا تحکمانہ لہجہ اختیار کرتی ہوئی مجھ سے کہنے لگی۔''اب تم میرے ساتھ ایک تصویر اترواؤ گے؟''

''ایک نہیں، اس کیمرے میں جتنی بھی تصویریں ہیں، سب کی سب..'' میں اب ایک فلرٹنگ ڈرٹی اولڈ مین ہو رہا تھا..

''نہیں صرف ایک..''

اس تصویر میں ایک پُرمسرت اور پُرخمار ہانگ چُوئی ادیب بھی ہے.. پس منظر میں جھیل رات میں ہے اور وسیع پھیلاؤ میں ہے۔ شیشے کی دیواروں میں بھڑکتی موم بتیاں جھلملاتی ہیں اور میں ہوں.. اور سنہری وانگ لی ہے.. میری نیلی شرٹ اور اس کا نیوی بلیو فراک ایک دوسرے سے آشنا ہوتے ہیں اور اس کے سنہری چہرے پر وہی چمکیلی دھوپ نما مسکراہٹ ہے جو پیکنگ کی ایک پتلی کے لبوں پر ہوتی ہے..

وارث شاہ نے.. ملکہ ہانس کے ایک حجرے میں بیٹھے کیسے جان لیا تھا کہ پتلی پیکنے دی.. ہانگ چُو میں رہتی ہے..

یا وہ نہیں جانتا تھا.. اور میں نے جان لیا تھا..

''ہیں خواب میں ہنوز...''

''تتلی،'' میں نے کمرے میں پہنچتے ہی اسے پھر طلب کیا۔''یہ کیا ہے؟''

''یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں..سو جاؤ۔''

میں سو گیا..

دستک ہو رہی تھی..

''تتلی،'' میں نے اونگھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے..سونے بھی نہیں دیتے۔'' وہ بھی اونگھ رہی تھی..

''کیا یہ خواب ہے؟''

''ہاں..کوئی نہ کوئی خواب میں ہے..اس لیے کہ ابھی تک یہ فیصلہ تو نہیں ہوا کہ ہم میں کون ہے جو ابھی تک خواب میں ہے..تم یا میں..''

''کیا یہ دستک بھی خواب کی ہے؟''

''ہاں..یہ حقیقت نہیں..اسے صرف تم سن رہے ہو..خواب میں کوئی بھی تمہارے کمرے کے دروازے پر..اس شب کی تاخیر میں دستک دے سکتا ہے..اگر کوئی دستک دیتا ہے تو اٹھ کر دیکھو تو سہی کہ کون ہے..''

''جو بھی ہے..خواب میں ہے..ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں۔''

''لیکن تم دیکھو تو سہی کہ کون ہے..جو بھی ہے وہ بھی خواب میں ہے۔''

باہر سنہری وانگ لی آدھی رات کے سورج کی طرح زرد کرنیں بکھیر رہی تھی..

اور چونکہ وہ خواب میں تھی، اس لیے اس کا لباس بدل چکا تھا..وہ ایک مونگیا رنگ کے ریشمی اور نہایت چینی انداز کے گاؤن میں تھی جو اس کا بدن بھی تھا اور لباس بھی..اس کے بوٹے سے قد میں سے کونپلیں پھوٹتی تھیں اور زور کرتی تھیں..وہی خاص خوشبو جو میرے کمرے میں اس کے پہناوؤں کے مختصر قیام سے ٹھہری ہوئی تھی، اب اس کے چینی گاؤن کے نصف بازوؤں کے اندر سے مہکتی آتی تھی اور اس کے سندھور گندھی انگلیوں میں تصویروں کا ایک البم تھا..

''میں نے سوچا تمہیں ان دنوں کی کچھ تصویریں دکھاؤں جب میں جمناسٹ تھی اور چین میں بہت سے لوگ تھے جو مجھے جانتے تھے..''

ایک خواب میں آنے والے کو آپ کیسے انکار کر سکتے ہیں۔''پلیز کم اِن''

چونکہ وہ خواب میں تھی، اس لیے اب میں اس کی زبان سمجھ سکتا تھا اور مجھے اپنے اور اس کے درمیان کسی مترجم کی ہڈی کی حاجت نہ تھی..

یہ ان مختلف مقابلوں کی تصویریں تھیں جن میں اس نے ایک اعلیٰ پائے کی جمناسٹ ہونے کی حیثیت سے شرکت کی تھی..اکثر جمناسٹ لڑکیوں کے بدن تو ترشے ہوئے اور متناسب ہوتے ہیں لیکن ان کے چہرے چوسے ہوئے اور پچکے ہوئے لگتے ہیں۔نادیا کمانچی میں بھی حسن نہ تھا، بچپن کی معصومیت تھی جس نے ایک دنیا کو اپنا اسیر کر لیا تھا..لیکن یہ جو تصویریں تھیں، ان میں نہ صرف یہ کہ سنہری وانگ لی ایک اگرچہ مختصر مگر لچکیلی ٹہنی تھی، کچے بانس کی شاخ تھی بلکہ اس کا روشن مہاندرہ بھی ڈلکیں مارتا تھا اور اس کی مسکراہٹ ایسی تھی کہ اس کی پرفارمنس کو نمبر دینے والے منصف بھی چندھیا جاتے ہوں گے..

کہیں وہ چھلّوں میں انگلیاں پھنسائے ان کے درمیان میں ہوا میں ایک مجسمے کی طرح معلق تھی..کہیں وہ بار کے شہتیروں پر ہتھیلیاں جمائے ٹانگیں سیدھی الف کیے ایک یونانی بت کی طرح تنی ساکت تھی..

متعدد تصویروں میں فلور ایکسر سائز کے دوران ایک بیلے رینا کی طرح اپنے

چہرے کے گرد بازوؤں کا ہالہ بنائے.. کبھی فرش پر ٹانگیں پھیلائے..اور کبھی دوڑتی.کبھی چھلانگ لگاتی ہوا میں معلق..ایک تصویر کی طرح تھی..

''یہ بیس برس پہلے کی تصویریں ہیں جب میں سولہ برس کی تھی.تب میرا جسم بہت خوبصورت ہوا کرتا تھا..اب تو میں بہت موٹی ہوگئی ہوں.تمہارے فریج میں پینے کے لیے کچھ نہیں ہے؟ مجھے پیاس لگی ہے۔''

''چینیوں کو تو ہمیشہ چائے کی طلب رہتی ہے..اور تم کچھ پینے کے لیے مانگ رہی ہو۔''

''مجھ میں گرمی بہت ہے.تم نے میرے ہاتھوں میں چائے کا مگ کبھی نہیں دیکھا ہوگا..کیا تم نے کبھی یہ نوٹ کیا ہے۔''

''میں نے یہ نوٹ کیا ہے کہ جب ہم سب لوگ پسینے سے نچڑ رہے تھے..یوفی کے مقبرے پر..شیر چشمے پر..تو صرف تم تھیں جس کی جبیں پر پسینے کا ایک قطرہ بھی نہ تھا تو گرمی کہاں ہے؟''

''وہ میرے اندر ہے۔''

اس لمحے فون کی گھنٹی بجی..بارہ بج چکے تھے..

دوسری جانب وفد کا ایک ایسا رکن تھا جسے نیند نہیں آرہی تھی اور شاید وہ وقت گزاری کے لیے مجھ سے گپ لگانا چاہتا تھا۔''سو تو نہیں گئے تھے؟''

''نہ صرف یہ کہ میں سو چکا ہوں بلکہ ایک خواب میں ہوں۔''میں نے فون بند کر دیا۔

اب یہ خوف جڑیں پکڑنے لگا کہ وہ شب بیدار رکن ابھی میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے گا..لیکن یہ ایک بے بنیاد خوف تھا کہ میں اس کی دستک کیوں سنوں گا جب کہ میں خواب میں ہوں..

اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے خاوند کے بارے میں بتایا جو کسی حکومتی ادارے میں ایک اہم منصب پر فائز تھا..اور اپنے بیٹے کا ذکر کیا جو ایک بورڈنگ ہاؤس میں تھا..

''تم نے مجھے اپنے بیٹے کی تصویر کیوں دکھائی تھی؟''

''اس لیے کہ تم نے ایک عجیب وغریب بیان دیا تھا اور میں یقین نہ کر سکا تھا اور نروس ہو گیا تھا۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ..میں کسی حد تک ایک بزرگ ہو چکا ہوں۔''

''چین میں ہم بزرگوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔''وہ ہنسنے لگی..اور اس کی ہنسی اور مسکراہٹ بالکل الگ تھی..وہ نہیں تھی جسے وہ ہماری میزبان کی حیثیت سے لبوں پر سجاتی تھی۔اس میں ایک بے اختیار کھلنڈرا پن اور اپنائیت تھی۔''میں خود بھی کسی حد تک بزرگ ہوں.سینتیس برس کی ہونے کو ہوں۔''

انسان کی حیاتی میں ایسے لمحے کم کم ہوتے ہیں لیکن ہوتے ہیں جب وہ جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے..کس مقام پر ہے لیکن اس کے باوجود بے یقینی اس کے اندر پھیل کر سوال کرتی ہے کہ تم کہاں ہو..اور یہ بے یقینی یہ سوال صرف اس لیے پوچھتی ہے کہ ناپائیداری کا خوف اسے بے بس کرتا ہے..وہ اس لمحے کو وہیں ہمیشہ کے لیے ساکت کر دینا چاہتا ہے..

تو میں نے..میری بے یقینی نے بھی یہی سوال کیا..میں کہاں ہوں؟ کے ٹو کے راستے میں پائیو کی رات میں ہوں..اور ایک ہسپانوی کوہ نورد خاتون پٹرول کے خالی کنستر کی تھاپ پر ناچ رہی ہے..

کہاں ہوں؟ دنیا کے طویل ترین برفانی راستے پر..سنو لیک پر ہوں جہاں تتلیاں میرے گالوں کو آہستگی سے کھلتی بند ہوتی پلکوں کی طرح چھوتی ہیں..شیر دریا سندھ کے ایک ٹاپو پر میرا خیمہ ہے اور الاؤ بھڑک رہا ہے..ایک عشقِ خاص ہے جس کے بدن کے روئیں دھوپ سنہری کرتی ہے یا جھیل کرومبر کے کناروں پر ایک مکر چاندنی میں ہوں اور اس کے پانیوں میں اترتے ہوئے میرا بدن چھلتا ہے اور ایک بوٹے کا ارمان رکھتا ہے..

تو میں اب کہاں ہوں..یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کہاں ہوں..اس لمحے کو ساکت کرنے کے لیے میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں..

میں ہانگ چو میں ہوں..رات کے بارہ بج رہے ہیں اور میں ایک خواب میں

ہوں..کھڑکی کے پورے چوکھٹے میں جھیل ہانگ ژُو فریم ہو چکی ہے لیکن اس کی لہریں زور کرتی اس کے شیشے سے ٹکراتی ہیں اور ان میں سے دن کی دھوپ کے گرم بخارات اٹھتے ہیں اور شیشے کو دھندلاتے ہیں اور ان پر ایک جمناسٹ کا بدن لچکیلا اور نوخیز عکس ہوتا ہے..اور اس بدن میں ابھی تک ہانگ چو کی دھوپ کی شدت ٹھہری ہوئی ہے اور زور کرتی ہے۔اس حدّت کے سامنے ایک شکستہ اور قدیم دیوار تا دیر نہیں ٹھہر سکتی..اسے بالآخر مسمار ہو کر جھیل کے پانیوں کو اپنے اوپر سے بہہ جانے دینا ہے..اپنے آپ کو نم آلود کر کے ہتھیار ڈال دینے ہیں..

ایک جمناسٹ کو اپنے بدن پر مکمل اختیار ہوتا ہے لیکن ایک قدیم برگد کو نہیں..

قدیم برگد کی شاخوں سے لٹکنے والی ریشہ دار داڑھیوں سے جھولتی جمناسٹ یہ نہیں جانتی تھی یا جانتی تھی کہ برگد میں بھی نئی کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں بلکہ یہ بھی جانتی تھی کہ زوال کو کمال سے کیسے زور آور کیا جا سکتا ہے۔

میرا دماغ ایک عجیب سی فینٹسی کی گرفت میں تھا..

حقیقت میں تو یہ ممکن نہیں، صرف خواب کے دھوکے میں ایسا ہوا کہ جھیل ہانگ چُو کے پانیوں نے اپنے زور سے کھڑکی کے شیشے کو کرچیوں میں منتشر کر دیا اور میرے کمرے میں بہنے لگے۔ٹیبل لیمپس کے بلب ان کی نمی سے فیوز ہو گئے۔صوفے، قالین، میرے کپڑے..بستر ہر شے بھیگ گئی اور میرا بدن بھی جو دن کی دھوپ میں جل چکا تھا، ان پانیوں میں بھیگا اور اسے قرار آ گیا..خواہشیں مندمل ہو گئیں، جھرّیاں دُھل گئیں اور قرار آ گیا..

''اب تم سو جاؤ کیونکہ خواب ختم ہو چکا ہے۔'' تتلی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

''لیکن ایسے خوابوں کا تذکرہ نہیں کیا کرتے۔''

کون کہتا ہے کہ یہ میری خواہش سے ہوا ہے
یہ جدائی، یہ تم سے اس قدر دور زندگی گزارنا..

میرے لباس سے ابھی اس عطر کی خوشبو آتی ہے جو تم نے لگایا ہوا تھا..
کیا تمہیں پتہ تھا کہ لوگ اپنی محبت کو چھپاتے ہیں
ایسے پھول کی طرح جو اتنا قیمتی لگتا ہو کہ اسے توڑا نہ جائے

(وُوتی)

''تتلی! اگر یہ خواب تھا تو اس کمرے میں وہی مہک کیوں ٹھہری ہوئی ہے؟''

''سو جاؤ..''

مقام....لونگ جن

"ماؤزے تنگ کی چائے...لونگ جن چائے کے باغوں میں"

ڈھلوانوں پر گھنی گتھی ہوئی سر سبز جھاڑیاں، تیز دھوپ اور حبس میں مرجھانے کملا جانے کی بجائے نکھرتی اور اپنے گہرے سبز رنگ لشکاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

ہماری کوچ سایہ دار درختوں میں پنہاں ایک خیابان پر دھیرے دھیرے بلندی کی جانب رواں تھی..

ہم ہانگ چُو سے نکل آئے تھے لیکن ابھی تک جھیل کی ہمسائیگی میں تھے اور اس کے آس پاس اور پس منظر میں جو پہاڑیاں دور سے ہمیں دھندلائی ہوئی سی دکھائی دی تھیں، اب ہم ان کے اندر اور اوپر جا رہے تھے..

بوڑھے برگد کی ہر ٹہنی ہر ڈال میں بے خوابی کی تھکن بسیرا کرتی تھی اور ایک بوسیدہ خمار ٹھہرا ہوا تھا..

کوچ کے اندر بیٹھے ہوئے یہ محسوس ہوتا تھا کہ باہر ایک خنک پہاڑی مقام کی خوشنما بستی گزرتی ہے جہاں ریستوران اور سیر گاہیں دل نواز ہیں.. ہریاول نچڑتی ہے اور سایہ دار شجر ٹھنڈک سے لبریز ہیں...اگرچہ ایسا نہ تھا.. باہر وہی حبس اور وہی گرمی کے موسم تھے..

ہمارا لیڈر کوچ کی کھڑکی کے شیشے کے ساتھ کیمرے کا لینز چپکائے تیزی سے گزرتے مناظر کی تصویر کشی میں مصروف تھا..اور ان تصویروں نے بعد میں اسے مایوس کرنا

تھا..دہقانی کہانی کار کفِ افسوس مل رہا تھا کہ پچھلی شب اس نے پھر اپنے گھر فون کیا تھا اور پھر ملازمہ نے اس کے ساتھ اتنی دیر گپ لگائی تھی کہ اس کی بیوی کے فون تک پہنچتے پہنچتے اس کا کارڈ ختم ہو گیا تھا..

لیل پوری نے دورۂ چین کے بارے میں واقعی ایک عمدہ نظم کہی تھی جو وہ لہک لہک کر سب کو سنا رہا تھا اور کوئی نہیں سن رہا تھا..پھر اس نے کوشش کی کہ اس کا رواں انگریزی ترجمہ کر کے وانگ لی اور لیو کو سنایا جائے..ترجمہ اتنا رواں تھا کہ روانی میں ان کے سر سے گزر گیا..

حسرت ناک مجھ سے اگلی نشست پر براجمان تھا اور اپنی ناک شیشے سے لگائے باہر دیکھ رہا تھا..اگرچہ اس کی ناک کو شیشے پر چپکانے کے بعد شیشے کا رقبہ بے حد مختصر ہو چکا تھا اور وہاں سے کچھ زیادہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا، پھر بھی وہ دیکھ رہا تھا اور اسی چپکی ہوئی حالت میں خود کلامی میں مشغول تھا. کہہ رہے ہیں کہ ہم لی ہاؤ کے علاقے میں جائیں گے جہاں مشہور زمانہ لونگ جن چائے کے باغ ہیں..چلو اچھا ہے چائے کے باغ بھی دیکھ لیں گے..میں نے اپنے ایک افسانے میں چائے کے باغوں کا تذکرہ کیا تھا لیکن صرف اپنے تصور سے کام لیا تھا، دیکھے کبھی نہیں تھے..اچھا تو ٹھیک ہے یہ چینی ادیب پاکستان آئیں گے تو ہم انہیں کونسے باغ دکھائیں گے..سبز باغ یا کالا باغ تو نہیں دکھائیں گے کیونکہ دوست ہیں.. ہاں ہم انہیں مالٹے اور کنوں کے باغ دکھائیں گے۔اگر سردیوں میں آئیں گے تو نہیں تو آم کے باغ دکھا دیں گے لیکن یار کیسے دکھائیں گے..ملتان میں تو گرمی بہت ہوتی ہے لیکن یار ہانگ چُو میں بھی تو گرمی ہوتی ہے..تو پھر ہانگ چُو میں آم کیوں نہیں ہوتے.. آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام..

حسرت ناک کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ کسی اور کو مخاطب کر کے بور نہیں کرتا تھا بلکہ خود کلامی کرتے ہوئے مسلسل اپنے آپ کو ہی بور کرتا رہتا تھا..

سنہری وانگ لی..کوچ کی پچھلی نشست پر بیٹھی ایک سرکاری فائل کے مطالعے میں منہمک تھی..نہایت بیوروکریٹک انداز میں..اور آج سویرے ناشتے کی میز پر میں نے

نہایت گرم جوشی سے اسے ''گڈ مارننگ'' کہا تھا جس کے جواب میں اس نے کندھے سکیڑ کر قدیمی وانگ لی کی جانب دیکھا تھا جس نے میری گڈ مارننگ کا ترجمہ کر کے اس تک پہنچایا. تو اس نے ایک آتشیں مسکراہٹ سے مجھے راکھ کیا اور پھر یکسر بیگانی ہو گئی بلکہ حسرت ناک کے ساتھ چُہلیں کرنے لگی..

''تتلی.. یہ تو لفٹ ہی نہیں کرا رہی.'' میں نے اپنی ہمدم دیرینہ سے شکایت کی..

''خواب تو صرف تم نے دیکھا تھا، اس نے تو نہیں..''

''صحیح.. مگر ایک الجھن ہے.. جب یہ آج صبح اپنی پلیٹ اٹھائے جانے مینڈکوں یا سانپوں کا ناشتہ کرنے کے لیے سیلف سروس کاؤنٹر کی جانب جا رہی تھی تو اس کے پیرہن سے وہی مہک کیوں آ رہی تھی جو میرے کمرے میں ابھی تک ٹھہری ہوئی ہے..''

''صرف اس لیے کہ تمہارا کمرہ کچھ دیر کے لیے اس کا کمرہ رہا تھا.. بھول گئے؟''

''یہ بھی صحیح.. ایک اور الجھن ہے.. بوڑھے برگد کی شاخوں اور ٹہنیوں میں اتنی تھکن کیوں ہے؟''

''عمر کا تقاضا ہے...''

''صحیح..''

کوچ ایک ریستوران نما نہایت پُرفضا قسم کے گھر کی پارکنگ میں ذرا گھومی اور رک گئی..

''آپ کی توجہ..'' خاور نے تالی بجا کر سب کو متوجہ کیا. ''یہ لی ہاؤ کا علاقہ ہے جہاں مشہور زمانہ لونگ جن چائے کاشت کی جاتی ہے.. اب ہم ایک ایسے گھرانے کے افراد سے ملاقات کریں گے جو پچھلی کئی نسلوں سے لونگ جن چائے کاشت کرتا آیا ہے.. اس کے سوا کچھ نہیں کرتا..''

''کچھ اور بھی تو کرتا ہوگا ورنہ کئی نسلیں کیسے ہو سکتی ہیں.'' حسرت ناک بڑبڑایا.

گھر کے باہر فائبر گلاس کے سبز شیڈ کے نیچے ایک چینی نوجوان صرف کچھا پہنے ایک بڑی ساری کاٹھ کی ہنڈیا میں چائے کی پتیوں کو ہاتھوں سے مسل مسل رہا تھا کہ یوں اس

میں وہ چَس پیدا ہوتی تھی، وہ ذائقہ جنم لیتا تھا جس کی وجہ سے یہ چائے.. دنیا کی گراں ترین چائے ہو جاتی تھی.. کچھا بردار نوجوان کے قریب بانس کے ٹوکرے دھرے تھے جن میں چائے کی مرجھائی ہوتی پتیاں خشک ہو رہی تھیں.. میں نے اس نوجوان سے دوستانہ گفتگو کا آغاز کرنے کی کوشش کی لیکن وہ قطعی طور پر ملتفت نہ ہوا اور اپنی کاٹھ کی ہنڈیا پر سر جھکائے ایک عادی چرسی کی طرح چائے کی پتیوں کو مسلنے میں مشغول رہا.. غالب گمان یہی ہے کہ دن میں بے شمار ہم جیسے سیاح اسے ڈسٹرب کرنے کے لیے وارد ہوتے رہتے ہوں گے اور اگر وہ ہر ایک سے فرینڈلی ہوتا رہے تو اس کی چائے کا چَس اور ذائقہ دھرے کا دھرا رہ جائے.. بہرحال میں نے اس کے ہمراہ ایک یادگاری تصویر اتروائی جس میں میں اس سے کچھ دریافت کرنے کی اداکاری کر رہا ہوں اور چینی برادر اپنی چائے کو بھنگ کی طرح گھوٹ رہا ہے اور میری اداکارانہ صلاحیتوں سے مکمل طور پر غافل ہے..

''گھر کے اندر جانے سے پیشتر آپ لوگ چائے کے باغ دیکھ لیجیے..''

یہ لی ہاؤ قطعی طور پر کوئی پُرفضا مقام نہ تھا. اگرچہ پہاڑیوں کے باعث لگتا تھا.. اور یہاں بھی وہی بے چین کرنے والا حبس اور پسینہ آور گرمی تھی جو ہم اپنے تئیں نیچے ہانگ چو میں چھوڑ آئے تھے.. اس لیے بیشتر ارکان نے مختصر ڈھلوان پر پھیلی پژمردہ جھاڑیوں کو ایک نظر دیکھا اور ''ٹھیک ہے'' کہہ کر گھر کے اندر چلے گئے..

ہم میں سے چند ایک جو ہمیشہ ایڈونچر کے لیے کمربستہ رہتے تھے اور ہمیشہ بعد میں اپنی کمر سہلاتے تھے اور ان میں بہرطور گیانی شامل تھا.. ادھر چلے گئے.

اس کاشت کار گھرانے کی رہائش گاہ سے پرے ایک کچے راستے کے پار وہ ڈھلوان شروع ہوتی تھی جس پر چائے کے باغ تھے.. اگر ہمیں یہ نہ بتایا جاتا کہ یہ مشہور زمانہ اور نہایت مہنگی لونگ جن چائے کی جھاڑیاں ہیں تو ہم قطعی طور پر انہیں گھاس نہ ڈالتے.. کہ یہ اتنی معمولی اور فضول سی جھاڑیاں دکھائی دیتی تھیں.. اپنی وادئ مانسہرہ کے قصبے چھتر پلین کے قصبے کے باہر جو چائے کے باغ ہیں، وہ ان سے کہیں بڑھ کر خوشنما اور ہرے بھرے تھے... جیسے ہم گالز وردی کے ''سیب کا درخت'' میں گم ہو کر جب حقیقت میں سیب کا درخت

دیکھتے ہیں تو سارا رومان کافور ہو جاتا ہے۔ اسی طور چائے کی جھاڑیوں کو دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا.. بلکہ دیکھنے سے فرق پڑ جاتا ہے۔

کاشت کار گھرانے کی خاتون سربراہ ہمارے ہمراہ تھی اور چائے کی فصل کے بارے میں مکمل تفصیل مہیا کر رہی تھی.. اگرچہ ابھی چنائی کا موسم نہ تھا لیکن اس نے صرف ہماری خاطر ایک چھجے دار ہیٹ پہنا اور گلے میں بانس کی ایک ٹوکری لٹکا کر چائے کی پتیوں کو جھاڑیوں سے نوچنے کا مظاہرہ کیا.. ہر کوئی چائے کی پتیاں نہیں چن سکتا.. اس کے لیے کومل انگلیاں شرط ہیں جو ڈنٹھل کے بغیر صرف پتیوں کو جھاڑی سے الگ کر سکیں..

"کیا یہ ممکن ہے" اور یہ درخواست قدیمی وانگ لی کے توسط سے اس خاتون تک پہنچی۔

"کہ آپ یہ ہیٹ اور ٹوکری کچھ لمحوں کے لیے مجھے عنایت کر دیں تاکہ میں بھی چائے کی پتیوں کو چن کر دیکھوں کہ یہ تجربہ کیسا ہے.. کیا یہ ممکن ہے؟"

سربراہ خاتون میری اس درخواست پر خوش ہو گئیں یا شاید انہوں نے خوش ہو جانے کی اداکاری کی..

میں نے ہیٹ اپنے سر پر ٹھیک کر قائم کیا، گلے میں ٹوکری ڈالی اور نہایت انہماک سے چائے کی پتیاں چُننے لگا۔ جیسے میں جنم جنم سے بس یہی کام کرتا آیا ہوں.. وہ خاتون مجھے ہدایات دیتی رہیں کہ صرف پتی توڑو.. ڈنٹھل نہیں اور چٹکی کی گرفت اتنی نہ ہو کہ پتی مسلی جائے وغیرہ وغیرہ..

صرف پانچ منٹ کے اندر اندر دھوپ کی شدت سے میرا بھیجہ پگھلنے لگا اور انگلیاں چٹکیاں بھرتی بھرتی درد کرنے لگیں... یہ طے تھا کہ میں کبھی بھی ٹی پکنگ سے اپنی روزی نہیں کما سکتا تھا..

یادگاری کے طور پر میں نے سربراہ خاتون اور سنہری وانگ لی سے درخواست کی کہ وہ ان چائے کے باغوں میں پلیز میرے ساتھ ایک تصویر بنوالیں.. اس تصویر میں ہریاول کا ایک وسیع گھیراؤ ہے جس میں ہم تینوں گھٹنوں تک چائے کی جھاڑیوں میں ڈوبے کھڑے ہیں.. میں نہایت ٹورسٹک انداز میں.. ہیٹ اور ٹوکری میں اس سے کہیں زیادہ بے وقوف لگتا جتنا کہ میں

ہوں اور ہر دو خواتین کے کندھوں پر عُذرِ تصویر رکھتا اپنے ہاتھ رکھتا بے تکلفی سے مسکرا رہا ہوں۔

اس عُذرِ تصویر کے دوران سنہری وانگ لی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے یہ اندازہ لگانے کی سعی کی، کیا میں اس کندھے کے لمس سے واقف ہوں، میرے ہاتھ رکھنے سے وہاں کسی ارتعاش نے جنم لیا ہے.. لیکن ایسا نہیں تھا، وہ کندھا بالکل لاتعلق تھا..

لی ہاؤ میں چائے کاشت کرنے والے.. پھر اس چائے کو مسلنے، گھوٹنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے عمل کے ماہر صرف چند گھرانے ہیں جو اس فن کی باریکیوں سے آگاہ ہیں.. اور مشترکہ زرعی نظام کے دور میں بھی انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا تھا.. اس لیے بھی کہ لونگ جن، ماؤزے تنگ اور چو این لائی کی پسندیدہ چائے تھی.. چنانچہ یہ گھرانے خاصے متمول ہیں..

جب ہم چائے کے باغوں سے فارغ ہو کر کاشت کار گھرانے کے گھر میں آئے تو ہمیں لونگ جن چائے کی قدیم تاریخ اور افادیت کے بارے میں ایک لیکچر دیا گیا.. کیسے ہزاروں برس پیشتر یہاں ہانگ چُو جھیل پر جھانکتی ڈھلوانوں پر اس کی کاشت کا آغاز ہوا... اسے اگانے اور تیار کرنے کا عمل اتنا پُر مشقت اور پیچیدہ ہے کہ چین میں لاکھوں لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے آج تک یہ چائے نہیں چکھی کیونکہ یہ بے حد مہنگی ہے.. پاکستانی روپے میں ایک کلو چائے کی قیمت دس ہزار سے بھی تجاوز کر جاتی ہے.. اور یہ ایسی چائے ہے کہ تخلیقی جوہر اور قائدانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے اور اسے چین کے ممتاز دانشور اور لیڈر ہی نوش کرتے ہیں..

چائے کی مصدقہ تاریخ میں درج ہے کہ اسے پانچ ہزار برس پیشتر چین میں دریافت کیا گیا تھا.. اگرچہ اس دریافت کے بارے میں ان گنت لوک کہانیاں اور روایات ملتی ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کی پہلی چسکی لگانے والا چین کا شہنشاہ شن نونگ تھا... یہ شن نونگ نہ صرف آدابِ حکمرانی سے بخوبی واقف تھا بلکہ سائنس اور فنونِ لطیفہ کا سرپرست بھی تھا.. کسی حد تک خبطی بھی تھا اور اس کی ایک نہ سمجھ میں آنے والی عادت یہ بھی تھی کہ پانی ہمیشہ اُبال کر پیتا تھا.. چنانچہ شن نونگ ایک روز اُبلا ہوا پانی پینے کو تھا کہ ایک نزدیکی جھاڑی کومیلیا کے چند پتے اس میں آ گرے اور ان کی وجہ سے پانی کا رنگ سنہری ہو گیا.. شن نونگ نے جب اس سنہری پانی کی چسکی لی تو اس کے ذائقے کو پسند کیا اور یہیں سے اس بدعت کا

آغاز ہو گیا جسے چائے نوشی کے نام سے جانا جاتا ہے.. شن نونگ کے بعد ان کے جانشین کے طور پر.. اگرچہ یہ جانشین پانچ ہزار برس بعد پیدا ہوئے، مولانا ابوالکلام آزاد کا نام آتا ہے جو ''غبارِ خاطر'' میں چائے چائے کرتے نظر آتے ہیں اور اس میں دودھ شامل کرنے کو بدذوقی گردانتے ہیں.. کاشت کار گھرانے نے ہمارے اعزاز میں لونگ جن چائے کی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا..

اور چونکہ ابھی ابھی بدذوقی کا تذکرہ ہوا ہے تو ہم بھی اپنی بدذوقی پر شرمندہ ہوتے ہوئے اقرار کرتے ہیں کہ جب ہم نے لوگ جن چائے کا ایک گھونٹ بھرا تو مکمل تسلی ہو گئی اور دوسرا گھونٹ بھرنے کی حاجت نہ رہی.. البتہ اس میں دیگر چینی چائے جات کی نسبت ایک پُرسکون سی کیفیت کا یا تو احساس ہوا یا پھر ہم نے اس کی مہنگائی اور دانشوری کو تقویت دینے کی اطلاعات کو اپنے آپ پر طاری کر کے اس احساس کو خود ہی جنم دے لیا.. اسے چونکہ دانشوروں کی چائے کہا گیا تھا، اس لیے ہم نہیں چاہتے تھے کہ چائے کے ایک گھونٹ سے ہمارا بھرم کھل جائے.. مگر ہم میں صرف حسرت ناک تھا جو منافق نہ ہوا اور ہر گھونٹ پر بڑبڑاتا رہا.. لو جی اس لونگ جن چائے سے تو ہمارے پاک ٹی ہاؤس کی چائے بہتر ہوتی ہے.. بے شک اُس سے بری چائے پاکستان بھر میں دستیاب نہیں ہوتی، پھر بھی لونگ جن سے تو بہتر ہوتی ہے.. ماؤزے تنگ اگر یہ چائے پسند کرتا تھا تو یقیناً بیزار ہونے کے لیے پیتا ہو گا... بندہ بیزار ہو تبھی اتنا بڑا انقلاب لا سکتا ہے۔ مطمئن اور خوش ہو تو اسے کیا تکلیف ہے.. ہاں اسی چائے کی ایک چسکی لگا کر اس نے امریکہ کو پیپر ٹائیگر کا خطاب دیا ہو گا..

چونکہ حسرت ناک کی خود کلامی اردو زبان میں تھی اور بڑبڑاہٹ میں تھی، اس لیے حاضر سروس چینیوں میں سے کسی ایک کے بھی پلے نہ پڑا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ورنہ وہ لونگ جن کی بے حرمتی پر اسے یقیناً زدوکوب کرتے..

اسی شام ہانگ چُو کے ادیبوں نے ایک ظہرانے کے بعد ہمیں اس بیش قیمت چائے کے نہایت نفاست سے پیک شدہ.. آرٹ کے نمونے ڈبوں میں پیک شدہ لونگ جن چائے کو تحفے کے طور پر پیش کیا..

وطن واپسی پر میں نے اپنی بیگم کو ہدایت کی کہ اس چائے کو انتہائی احتیاط سے تیار کرے.. کیونکہ اس کی ایک ایک پتی نہایت بیش قیمت ہے.. لیکن صرف اپنے لیے تیار کرے کہ میرا ابھی موڈ نہیں چائے پینے کا.. چنانچہ بیگم نے نہایت پھونک پھونک کر یہ چائے بنائی.. پہلا گھونٹ بھرا اور ناک چڑھا کر بولی۔ ''ہا ہائے یہ تو نری جوشاندہ ہے.. یہ کیا اٹھا لائے ہو؟''

لونگ جن چائے کا ایک ڈبہ تو ابھی تک کچن کیبنٹ میں صرف اس لیے محفوظ پڑا ہے کہ اس پر پھنکارتا ہوا اژدھا نہایت خوبصورت ہے اور دوسرا ڈبہ اس نے کنیزاں بی بی کو بخش دیا تھا جو ہمارے گھر میں برتن دھونے آتی ہے اور بخشتے ہوئے کہا تھا۔ ''کنیز کبھی کھانسی یا زکام ہو تو یہ چینی جوشاندہ پی لیا کرو۔'' اب یہ کور ذوقی کی انتہا نہیں ہے کہ جو لونگ جن چائے ماؤزے تنگ کو مرغوب تھی، اسے اب کنیزاں بی بی جوشاندے کے طور پر استعمال کرتی ہے..

ہانگ چُو واپس آئے تو جھیل کنارے لوگ تھے، پانیوں میں کشتیاں رواں تھیں..

''یہ پانی تمہارے واقف ہیں، تم ان سے بات کر سکتے ہو۔'' تتلی نمودار ہو گئی..

''نہیں تتلی.. میرا اور ان کا تعارف نہیں ہے۔''

''یہ پچھلی شب تمہارے کمرے میں تھے.. کھڑکی کے شیشے ریزہ ریزہ کر کے.. تم بھیگ گئے تھے۔''

''وہ تو ایک خواب نہیں تھا تتلی؟''

''خواب تھا تو پیرہن کی مہک کیوں ٹھہری ہوئی ہے.. ہر شے ابھی تک گیلی کیوں ہے.. برگد کی شاخوں میں تھکاوٹ کیوں ہے..''

''جو میں پہلے کہتا تھا، وہ تم اب کہہ رہی ہو.. تو یہ خواب نہیں تھا؟''

''خواب ہی تھا۔'' تتلی پھڑ پھڑاتی مسکرائی۔ ''میں تمہیں چھیڑ رہی تھی ورنہ اتنے بوڑھے برگد کی شاخوں سے ایک جمناسٹ کیسے جھول سکتی ہے.. جمناسٹ اندھی تو نہیں۔''

میرا جی چاہا کہ میں تتلی کا ٹینٹوا دبا دوں.. لیکن تتلی اتنی مختصر سی شے ہوتی ہے کہ اس کا ٹینٹوا تلاش کرنا ممکن نہ تھا' ورنہ ضرور دبا دیتا..

مقام.... ہانگ چو

"سنہری وانگ لی اور شاپنگ ان ہانگ چو"

ہانگ چو رات کے سمے ایک صحرائی شہر تھا۔

صحرائی شہر جو دھوپ کی تپش کو اپنی کچی دیواروں، تنگ گلیوں اور اندھیرے کمروں پر سہتا رہتا ہے اور جب رات ہوتی ہے تو شمعیں جلنے لگتی ہیں، حجاب اٹھ جاتے ہیں اور اس کے مکین صحرا کی جانب سے آنے والی خنک ہوا میں اپنے مرجھائے ہوئے بدن کھلانے کے لیے کوچوں اور گلیوں میں آ جاتے ہیں۔

ہانگ چو کی شاہراہیں اور بازار خلقت سے بھرے پڑے تھے اور اتنی روشنی تھی جیسے ہر شخص کے لیے الگ الگ سپاٹ لائٹ مہیا کر دی گئی ہے تاکہ وہ گم نہ ہو جائے۔ سٹور اور دکانیں اور ریستوران روشن تھے اور آپ باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ان کے اندر فروخت ہونے والی ہر شے کو جانچ سکتے تھے اور اس پر لگا ہوا پرائس ٹیگ پڑھ سکتے تھے، وہ اتنے روشن تھے..

ہمارے لیے یہ ایک نیا تجربہ.. ایک نیا ہانگ چو تھا..

حبس اور گرمی کا نام و نشان مٹ چکا تھا.. ہر چوک کے دائیں جانب نظر کرتے تو وہاں شاہراہ کے آخر میں جھیل جھلملاتی ملتی اور خوش کن ہواؤں کے سندیسے بھیجتی۔

لڑکیاں اپنے پلیٹ فارم شوز میں ٹھپ ٹھپ کرتی، نیکر نما سکرٹس میں جوانی کے بے فکرے موسموں میں رنگی اور ڈوبی ہوئی. نوجوان امریکی برانڈ نیلی جینوں میں کسے ہوئے

ہانگ چو کی شب کے لطف میں مبتلا اور شوخ. لیکن ان کی شوخی کہیں بھی ہلڑ بازی میں بدلتی نہ تھی. لیکن یہاں بھی چین کے ہر شہر کی مانند بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی.. ایک خاندان ایک بچہ.. اور یہ ایک بچہ کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا. . سچی بات ہے بچوں کے بغیر بھیڑ تو ہو سکتی ہے رونق نہیں..

ہم ہانگ چو ئی ادیبوں اور دانشوروں کی اس محفل سے اٹھ کر شہر کی رات میں آئے تھے جہاں ہمیں لونگ جن چائے کے تحائف پیش کیے گئے تھے..

اکثر سٹورز کے باہر سیل کے پھریرے لہرا رہے تھے.. اور ہم اپنے بال بچوں کے لیے جوگرز، نیکریں، ٹی شرٹیں اور بیگ وغیرہ خریدنے کے موڈ میں تھے..

جب میں نے ایک شو سٹور میں ایک نہایت دیدہ زیب پلیٹ فارم شو کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس پر سنہری وانگ لی کا ہاتھ جانے کہاں سے آ گیا۔ "اسے مت خریدو.. یہ بہت مہنگا ہے.. اپنے یوآن سنبھال کر رکھو.. میں جانتی ہوں کہ ہانگ چو میں بہترین شاپنگ کہاں ہے.. میں تمہیں لے چلوں گی.."

لیکن یہ سنہری وانگ لی کہاں سے آ گئی..

اگر خواب میں تھی تو وہ مجھ سے کیسے وعدہ کر سکتی تھی کہ میں تمہیں لے جاؤں گی..

چین میں آ کر بلکہ زیادہ درست ہوگا کہ ہانگ چو میں آ کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ نہ پتہ چلتا تھا کہ میں دراصل تتلی ہوں اور تارڑ ہو چکا ہوں.. نہ یہ گتھی سلجھتی تھی کہ یہ جو تتلی اڑتی پھرتی ہے، دراصل تارڑ کا خواب ہے اور نہ یہ فیصلہ ہوتا تھا کہ سنہری وانگ لی کب حقیقت ہوتی ہے اور کب خواب ہو جاتی ہے..

صرف تتلی جانتی تھی کہ فریب ہے، خواب ہے یا حقیقت ہے.. اور وہ کمبخت مجھے بتاتی نہیں تھی اور جانتی تھی کہ میں اس کا ٹیٹوا نہیں دبا سکتا..

سنہری وانگ لی اور میں سکول جا رہے تھے..

ہم دونوں نے اپنے اپنے بیگ اپنی گود میں رکھے ہوئے تھے اور ان کے گرد اپنی

بانہیں حمائل کر رکھی تھیں..اور چونکہ ہم سکول کے بچے تھے، اس لیے ہم دونوں نے نیلی نیکریں پہن رکھی تھیں..میرے پاؤں میں جوگرز تھے اور وانگ لی پلیٹ فارم شوز میں تھی..

وانگ لی مجھ سے کم صحت مند نہ تھی..مختصر نشست میں ہم دونوں ٹھنسے بیٹھے تھے اور اگر نظریں نیچی کر کے دیکھتے تھے تو ہمیں چار رانیں نیکروں میں سے برآمد ہوتی نظر آتی تھیں اور ان چاروں کا سائز تقریباً ایک جیسا تھا، صرف رنگ میں فرق تھا..دو گندمی تھیں اور ان پر سیاہ بال تھے..اور دو دودھیا تھیں اور دودھ پر بال نہیں ہوتے۔

ہم سکول جا رہے تھے اور ایک رکشا میں جا رہے تھے..

یہ ہمارے ہاں والا اعصاب شکن ڈراؤنی آواز والا پھٹے ہوئے سائلنسر والا رکشا نہ تھا بلکہ چرخ چوں آہستہ رو چینی سائیکل رکشا تھا..مجھے اپنے سامنے ایک چینی کی اور وانگ لی کو اپنے ایک ہم نسل کی جو پشت نظر آ رہی تھی، اس پر اگرچہ ایک ڈھیلی سی چیک شرٹ تھی لیکن پیڈلوں پر زور لگاتے ہوئے اس پشت کی رگیں ابھرتی نظر آ جاتی تھیں..

میں ایک بار زمانہ قدیم میں کراچی میں ایک سائیکل رکشا پر سوار ہوا تھا اور چند قدم کے فاصلے پر جا کر اتر گیا تھا کہ میں اپنے بدن میں رکشا ڈرائیور کے بدن کا کھچاؤ اور مشقت محسوس کرتا تھا اور مجرم محسوس کرتا تھا کہ ایک انسان مجھے ایک جانور کی طرح کھینچ رہا ہے..پھر بہت عرصہ بعد بہاولپور میں ایک تقریب کے بعد میں نے اسی قسم کے ایک اور سائیکل رکشا پر سیر کی..اور تب بھی نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد کوئی بہانہ بنا کر اتر گیا تھا..میں تائب ہو گیا تھا کہ آئندہ کبھی اس غیر انسانی سواری میں نہیں بیٹھوں گا..

لیکن کیا ہے کہ چین کے شہر ہانگ چو میں میں نے اپنی من مرضی سے اس غیر انسانی سواری کا انتخاب کیا تھا..میں وہ پتھر دل سیاح تھا جو انسانی اقدار کو فراموش کر کے ''سٹوری آف چائنا'' کو انجائے کرنا چاہتا تھا..میں نے چین کی سٹوری بک میں افیون کے رسیا پونی ٹیل بوڑھے، تنگ سلک گاؤن پہنے رباب چھیڑتی لڑکیاں، چاول کے کھیتوں میں بانسی ہیٹ پہنے لاغر دہقان، وحشی وار لارڈ..اور..اور اس قسم کے رکشے دیکھے تھے..

بیجنگ کے پیس ہوٹل کے قریب فٹ پاتھ پر ایک ایسے ہی قدیم رکشا کا ماڈل تھا

جسے ایک چار بالوں کی سرسراتی داڑھی والا بزرگ چینی کھینچ رہا تھا اور میں نے بڑے چاؤ سے اس ساکت رکشا میں بیٹھ کر مسکراتے ہوئے ایک تصویر کھنچوائی تھی..

یہ رکشا بھی ہو بہو اسی عہد کا لگتا تھا..صرف ڈرائیور کے پاؤں سڑک پر دوڑنے کی بجائے پیڈلوں پر زور لگاتے تھے..

پچھلی نشست پر جہاں ہم دونوں ٹھنسے بیٹھے تھے، اس احتیاط کے ساتھ کہ ہماری رانیں چھو نہ جائیں..پلاسٹک کی ایک بدرنگ چھت بھی تھی جس کی جھالر پر چینی زبان میں کچھ لکھا تھا..شائد ''دیکھو مگر پیار سے..'' یا ''ہانگ چو میرا شہر'' لکھا تھا..

ہم ناشتے کے فوراً بعد ہی نکل آئے تھے..

ہوٹل میں ہانگ چو کی لفٹ جب گراؤنڈ فلور پر ایک تتلی کی سی آہستگی اور نرمی سے آن رکی اور میں اس میں سے ایک چُڑمُڑ نیلی شرٹ اور نیلی نیکر اور اپنے جوگرز میں..اپنے بے سروپا سراپے کو سنبھالتا، عمرِ رفتہ کو بار بار آواز دیتا طلب کرتا باہر آیا اور استقبالیے پر پہنچا تو اپنے سامنے منتظر وانگ لی کو لمحہ بھر کے لیے پہچان نہ سکا..کیونکہ وہ ایک نصف بازوؤں کی بدن سے لپٹی ہوئی نیچے گلے کی دھاری دار ٹی شرٹ اور مختصر نیکر میں تھی..اس کی مدھر سندھور کلائی پر ایک گھڑی تھی اور اس کے بال حسب معمول کھنچے ہوئے اس کے ماتھے کو واضح کرتے ایک پونی ٹیل کی صورت میں تھے..اس نے مدھر سندھور کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ ''ہمیں لنچ سے پہلے پہلے واپس آنا ہے..میں چھٹیوں پر تو نہیں ہوں..سرکار نے میری ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے۔'' اس کا لہجہ قطعی طور پر سرکاری ہی تھا..

''ڈیوٹی میں یہ بھی تو شامل ہو گا کہ تم دوست ملک کے برگزیدہ اور برگد نما ایک دانشور کو شاپنگ میں مدد دو اور ذرا جھیل کنارے لے جاؤ۔''

چونکہ اب وہ حقیقت میں تھی..خواب میں ہوتی تو ہم دونوں کی زبان ایک ہوتی، اس لیے اب جو کچھ بھی کہا جا رہا تھا، اشاروں کنایوں میں کہا جا رہا تھا..میری جانب سے اردو، انگریزی اور پنجابی میں اور اس کی جانب سے صرف چینی میں..یہ میرا خیال تھا کہ صرف چینی میں..بے شک وہ بھی کورین، ویت نامی یا جاپانی میں رواں ہوتی، مجھے تو چینی ہی لگتی..

ہوٹل سے باہر آئے تو میں نے حیرت سے دیکھا کیونکہ اس کے شانوں کو تقریباً اپنے برابر میں دیکھا اور یہ پلیٹ فارم شوز کی چھ انچ موٹائی کا کمال تھا ورنہ وہ تو کہیں نیچے ہی رہ جاتی.. خواب میں تو وہ بہت نیچے رہ جاتی تھی..

باہر حسبِ روایت ابھی سے دھوپ تیز تھی..

میں چند قدم چلنے کے بعد ہی ہانپنے لگا.. پسینے سے تر ہو کر پچھتانے لگا کہ اپنے سے تقریباً پون صدی کم عمر خاتون کے ساتھ ہانگ چُو کی سیر کرنے کی کیا تک ہے.. اس نے بھی میری حالت زار کو بھانپ لیا. جیسا کہ خواب میں بھی وہ میری پژمردگی کو بھانپ لیتی تھی اور کہنے لگی۔ ''ہم ٹیکسی لے لیتے ہیں۔''

اس لمحے جھیل کی جانب سے سلوموشن میں نمودار ہوتا ہوا ایک رکشا دکھائی دیا..

''کیا ہم اس سائیکل رکشا میں سوار ہو سکتے ہیں؟''

''یہ بہت سست ہو گا... بہت آہستہ..''

''یہ مجھ سے مطابقت رکھتا ہے.. سُست اور آہستہ..''

''میں نے تمہیں اس شب بھی کہا تھا کہ عمر سے فرق نہیں پڑتا..'' وہ پہلی بار ذرا فرینڈلی ہوئی اور اس کی مسکراہٹ نے مجھے ایک مرتبہ راکھ کر دیا.. اس راکھ میں کوئی نہ کوئی ایسی چنگاری بچ جاتی تھی جو ان موقعوں پر بھڑک کر مجھے پھر سے راکھ کر دیتی تھی..

''تمہیں شاید حیرت ہو کہ میں آج پہلی بار ایسے رکشا میں بیٹھی ہوں.. اور یہ ہانگ چُو میں بہت ہی کم ہیں.. میں ہمیشہ ٹیکسی میں سفر کرتی ہوں..'' وہ رکشا میں بیٹھتے ہوئے بولی اور اس کے بیٹھتے ہی نشست تقریباً بھر گئی اور میں بیٹھا تو بہت پھنس پھنسا کر بیٹھا..

چنانچہ ہم دونوں سکول کے بچے تھے..

نیکریں پہنے.. اپنے بستے سنبھالے.. ایک رکشے پر سوار..

''تم نے ڈیلی گیشن کے کسی ممبر کو بتایا تو نہیں کہ میں تمہیں شاپنگ کے لیے لے جا رہی ہوں..''

''نہیں.. تم اپنی ڈیوٹی کے تحت مجھے لے جا رہی ہو.. صرف گیانی ہے جس کی تیکھی

مونچھ کچھ جان جاتی ہے.. اسے البتہ کچھ شبہ سا ہے۔''

''شبہے کی کیا بات ہے.. تم نے پچھلی شب مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں شاپنگ میں تمہاری مدد کروں یا شاید میں نے ہی کہا تھا کہ میں تمہیں ہانگ چُو کے بہترین شاپنگ ایریا میں لے چلوں گی اور پھر جھیل کے راستے ہم ہوٹل واپس آ جائیں گے تو اس میں شبہے کی کیا بات ہے؟''

''تمہارا سراپا سراسر شبہ ہے'' .. میں نے اس کی جانب دیکھا اور وہ برابر میں پھنسی ہوئی قدرے ٹھگنی لگ رہی تھی.. ویسے یہ فقرہ ایسا تھا کہ اشارے کنائے میں بھی اس تک نہ پہنچ سکا..

سائیکل رکشا تیز دھوپ میں سلگتا بالآخر جھیل کے کنارے اس سڑک پر آ گیا جہاں گرمی کے باعث بہت کم لوگ تھے.. پانیوں پر گرم بخارات کی دھند اٹھتی تھی جو منظر کو دھندلاتی تھی.. پیاس نے نڈھال کیا تو ہم ساحل کے ساتھ ایک کھوکھے کے قریب آن رکے اور برف سے لبریز پیپر کپس میں ایک کھٹا سا مشروب حلق سے اتارا..

''کیا تم تیر سکتے ہو؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے اور وہ بہت گندھے ہوئے اور سفید تھے، بٹر فلائی سٹروک کے انداز میں ہوا میں تیری..

''دراصل نہیں.. ہاں اگر کوئی مجھے گہرے پانیوں میں دھکیل دے تو میں غوطے کھاتا ہوا چند میٹر کا فاصلہ ڈبکیاں کھاتے طے کر کے کنارے پر پہنچ سکتا ہوں.. بلکہ پہنچ سکتا تھا.. اب تو شاید میں پانی میں ایک بھاری پتھر کی طرح ڈوب جاؤں گا۔''

''تو ئے.. تو ئے..'' اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے تیرنا بہت پسند ہے.. اور جھیل ہانگ چُو کے کچھ حصے ایسے ہیں.. ادھر آبادی کے آس پاس نہیں.. ادھر پہاڑیوں کے دامن میں کچھ حصے ایسے ہیں، جہاں کوئی نہیں ہوتا.. اور خاص طور پر رات کے پچھلے پہر کوئی بھی نہیں ہوتا.. اور میں وہاں سوئمنگ کے لیے جاتی ہوں۔''

''اکیلی؟''

''یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے..'' وہ روشن ہو گئی۔ ''اگر تم تیرا کی جانتے اور کل

دوپہر تم نے ہانگ چُو سے چلے نہ جانا ہوتا تو میں تمہیں وہاں لے جاتی۔۔"

"ڈوب جانے کے لیے؟"

"نہیں۔۔میں ہم دونوں کے لیے کافی ہوتی۔۔"

جھیل ہانگ چُو اگرچہ دھوپ بھری تھی۔۔گرم بخارات کی لپیٹ میں سلگتی تھی لیکن میں اسے دیکھتے ہوئے یہ جان سکتا تھا کہ یہیں کہیں کبھی کسی چاندنی رات میں لی پو نے پانیوں میں عکسِ ماہتاب دیکھ کر اسے پانے کی خواہش میں کشتی سے چھلانگ لگا دی تھی۔۔

وانگ لی بھری دوپہر میں عکسِ ماہتاب تھی۔۔

مگر میں لی پو نہ تھا۔۔

برف بار کھٹا مشروب پینے کے بعد سائیکل رکشا پھر سے چرخ چوں کرتا رینگنے لگا۔۔

مجھ پر اثر ہونے لگا۔جھیل کے گرمی میں پھکنتے پانیوں کا۔۔وانگ لی کے ہمراہ ایک مختصر نشست میں سارڈین مچھلیوں کی مانند پیک ہونے کا۔۔عکسِ ماہتاب کا۔۔اور میں اپنی ٹیلی ویژنی شہرت اور ادبی مقبولیت کی ڈینگیں مارنے لگا۔۔اسے متاثر کرنے کی خاطر۔لیکن وہ خاطر خواہ طور پر متاثر نہ ہوئی کہ یہ ڈینگیں اس کی زبان میں نہ تھیں، میں صرف اپنا رانجھا راضی کر رہا تھا۔۔

البتہ جب وہ مجھے سننے کے لیے اپنا چہرہ میری جانب کرتی تھی تب احتیاط۔۔۔کرتی تھی کہ کہیں ہماری ناکیں چھو نہ جائیں۔۔کہ ہم ٹھنسے ہوئے ایسے تھے۔۔بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ میں احتیاط کرتا تھا۔۔میری ناک بھی حسرت ناک سے کم حجم کی نہ تھی، صرف تیکھی زیادہ تھی اور وانگ لی کی ناک اگرچہ چینی پیمانوں کے مطابق اونچی اور دیدہ زیب تھی لیکن پھر بھی میرے نزدیک پھینی یا چپٹی تھی۔۔۔لیکن رانیں احتیاط کے باوجود چھوتی چلی جاتی تھیں۔۔

"میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔۔تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔"اس نے نہایت ہی بے رخی سے کہا۔۔

"تمہیں خاور نے بتایا ہوگا۔"

"نہیں۔۔جب تم لوگ آتے ہو تو ہمیں ایک ایک رکن کا پتہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے

ملک میں کون ہے۔۔اس کی حیثیت کیا ہے۔۔اور کون صرف سفارشی ہے۔۔ہمارے پاس مکمل فائل ہوتی ہے۔"

"چلو یہ بتاؤ کہ ہمارے ڈیلی گیشن میں تمہیں سب سے زیادہ کونسا شخص پسند ہے۔۔ذاتی طور پر۔۔"

"تمہارا لیڈر۔۔"

یہ وہ واحد لمحہ تھا جب میں نے وانگ لی کو قطعی طور پر ناپسند کیا۔"کیوں؟"

"وہ بہت سویٹ شخص ہے۔۔سمارٹ ہے۔۔اور مجھ سے چینی میں گفتگو کرتا ہے۔"

"چلو اس پر مٹی ڈالو۔۔اس کے علاوہ اور کون؟"

"مجھے سبھی پسند ہیں۔۔گیسو دراز بھی جو نہایت دل پھینک شخص ہے اور باتیں کرتے ہوئے اپنے بال سنوارتا ہے اور توند پر کھسکتی ٹی شرٹ کو درست کرتا ہے۔۔اور وہ دہقانی کہانی کار جو لگتا ہے کہ دراصل چینی ہے اور پاکستان چلا گیا ہے۔۔سفید ریش شاعر کی مسلسل گفتگو۔۔سبھی پسند ہیں۔"

"یہاں تک کہ حسرت ناک بھی۔۔"

"ہاں کیوں نہیں۔۔ہمارے ہاں اس کی ناک سے کم از کم دس چینی ناکیں بن سکتی ہیں۔۔اس لیے وہ بھی۔۔یہ میری سرکاری ڈیوٹی ہے کہ میں معزز اراکین کو پسند کروں اور ان کا خیال رکھوں۔"

"اور ان میں مَیں بھی شامل ہوں؟"

"ہاں۔۔میں تمہارا خاص خیال تو نہیں رکھ رہی۔۔محض ڈیوٹی دے رہی ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔"میں نے جل کر کہا۔۔

ہم ٹائیگر سپرنگ پارک کو جانے والی سڑک سے ذرا ادھر بائیں جانب مڑ گئے۔۔

بلکہ ہمارا سائیکل رکشا مڑ گیا اور جھیل ہمارے پیچھے رہ گئی۔۔

ہانگ چو کے شاپنگ ایریا کا دل یہیں پر واقع تھا۔۔

جب میری شاپنگ کسی حد تک اختتام کو پہنچ گئی تو مجھے یاد آیا کہ ابھی تک بیٹوں کی

فرمائش ہی پوری ہورہی تھیں، بیٹی کی باری نہیں آئی تھی۔ میرے بٹوے میں جہاں ہمہ وقت بیٹوں کی قمیضوں کے سائز، کمر کے ناپ، جینوں کی لمبائی وغیرہ کی تفصیلات موجود رہتی تھیں، وہاں بیٹی کے پاؤں کا ناپ بھی ایک فل سکیپ کاغذ پر نقش تھا تاکہ میں اس کے سائز کے مطابق شوز اور جاگرز وغیرہ حاصل کرسکوں..ویسے بھی وانگ لی نے مجھے ایک پلیٹ فارم شو کی جانب مائل ہوتے ہوئے دیکھ کر آج کی شاپنگ ڈیٹ کے لیے مدعو کیا تھا..

اب یہاں ایک عجیب سالطیفہ ہوگیا..ہم جب کسی بھی شوسٹور میں جاتے..وانگ لی کوئی شو پسند کر کے اشارہ کرتی اور میں عینی کے پاؤں کا ناپ سیلزگرل کے سامنے پھیلا کر کہتا کہ یہ سائز..تو سیلزگرل سکتے میں آجاتی۔ ''نونو..ناٹ دس بگ..نو''

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ پورے ہانگ چو میں عینی کے پاؤں کے سائز کا کوئی شو نہ ہو..وہ ایک عام سی پنجابی لڑکی ہے اور اس کے پاؤں اس کے قد سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بڑے نہیں ہیں لیکن یہی ہوا کہ پورے ہانگ چو میں اس کے سائز کا جوتا نہ ملا..میں نے سن رکھا تھا کہ یہاں قدیم زمانوں میں مختصر ترین پاؤں عورت کے حسن کا پیمانہ ہوا کرتے تھے اور والدین پانچ چھ برس کی عمر میں لڑکی کے پاؤں میں لوہے کے جوتے یا شکنجے پہنا دیتے تھے اور یوں پاؤں کی بڑھوتی رک جاتی تھی..ان کے جوان ہوجانے پر جب لوہے کے یہ جوتے کاٹ کر الگ کیے جاتے تو خاتون کے پاؤں جوں کے توں ننھے منے چھ برس کی عمر کے برآمد ہوتے..اب بھلے وہ ساری حیاتی لنگڑاتی رہے، ہر قدم پر اوندھی گرتی رہے لیکن بہر طور حسیناؤں میں شمار ہوتی چلی جاتی تھی۔

میں پہلی بار وانگ لی کے بالائی سراپے سے اتر کر اس کے پاؤں تک آیا..بقیہ بدن کے تناسب سے اس کے پاؤں واقعی نہایت کومل اور چھوٹے سے تھے..

بہرحال ہم بہت سے شوسٹورز میں گئے لیکن ہر جگہ چینی آنکھیں عینی کے پاؤں کا ناپ دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں اور نونو..ناٹ دِس سائز..ویری بگ!

چنانچہ ثابت یہ ہوا کہ پنجابی اور چینی مٹیاریں ایک ہی شوسٹور سے جوتے نہیں خرید سکتیں..

رکشاوالا ابھی تھک چکا تھا..

وہ ہر سٹور پر دکان کے باہر کھڑا ہو کر ہمارا انتظار کرتا اور پھر ایک بے دام غلام کی مانند ہمارا بوجھ کھینچنے لگتا..

پھلوں کی ایک دکان سے وانگ لی کے مشورے کے مطابق میں نے کچھ ایسے پھل خریدے جن کی شکل اور ذائقے سے میں واقف نہ تھا..

ہوٹل قریب آیا تو بائیں جانب ایک مغربی طرز کا ریستوران دکھائی دیا جس کے اندر..ٹھنڈک کے اندر کہ ہانگ چُو اب باقاعدہ تپ رہا تھا..اندر بہت سے لوگ اپنی پیاس بجھا رہے تھے اور کھانا کھا رہے تھے..

''اگر تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو ہم یہاں کچھ دیر بیٹھ جائیں..تازہ دم ہو جائیں۔''

''نہیں..'' اس کی پونی ٹیل انکاری ہوگئی۔ ''مجھے لنچ سے پہلے ہوٹل پہنچنا ہے، مناسب لباس پہننا ہے..اور ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے..وقت بالکل نہیں۔''

ہوٹل ہانگ چُو کے کمپاؤنڈ میں فرانسیسی ملبوسات کا ایک شوروم تھا جس کے برابر میں جاکر رکشا رک گیا۔

اور اس لمحے ایک تصویر اتری..اور یہ رکشا ڈرائیور نے دانت نکالتے ہوئے بخوشی اتاری..اس تصویر میں اپنا بیگ سنبھالے نیلی نیکر میں مَیں صاف دکھائی دے رہا ہوں لیکن وانگ لی کے چہرے کے درمیان میں رکشا کی چھت کو سہارا دینے والا راڈ آگیا ہے اور یوں وہ دو حصوں میں بٹ گئی ہے..دونوں کے چہروں پر ایک ایسا تاثر ہے جیسے ہم ہمیشہ سے اس رکشے میں بیٹھے ہیں..وہاں آباد ہوچکے ہیں اور مستقبل قریب میں اس سے اتر کر زمین پر آنے کا کوئی ارادہ نہیں..بچے سکول نہیں جانا چاہتے..

اس نے میرے خفیف سے اصرار کے باوجود رکشا کا کرایہ اپنے پرس سے ادا کردیا۔ ''چلیں؟ لنچ کے بعد وفد کے اراکین کو ہانگ چُو کے سلک بازار میں شاپنگ کے لیے جانا ہے۔''

''اور تم؟''

''میں نہیں جاؤں گی..اپنے کمرے میں آرام کروں گی..''

''پرسوں شب..ہوٹل کی آخری منزل پر..تم نے ایک کومنٹ دیا تھا..وہ کیا تھا؟ مہمان نوازی کی ریت تھا..گمان تھا..خمار تھا..کیا تھا؟''

اس نے کچھ کہا نہیں، اپنی مسکراہٹ سے مجھے پھر راکھ کر دیا۔

ہوٹل کی لابی میں داخل ہوتے ہی وہ اجنبی اور غیر ہوگئی..اپنے کمرے کی چابی حاصل کر کے چلی گئی..

پتلی پیکنے دی تے نقش روم والے..

''بازارِ ریشم میں..کون کہتا ہے کہ یہ میری خواہش سے ہوا ہے''

''ارے تارڑ..یہ جو ہم نے کہیں ریشم کے نمکین کیڑے کھائے تھے..تو یہ کیڑے حلال ہوتے ہیں..'' جنرل کو جانے کیا خیال آ گیا..

اور میں نے اس سے یہی سوال کر دیا کہ آپ کو یہ کیا خیال آ گیا۔

''میاں ریشم بازار جا رہے ہیں تو یونہی وسوسہ سا دل میں اُٹھا کہ وہ جو کیڑے چکھے تھے..میں نے تو ایک دو ہی کھائے تھے تم نے تو پورا تھال کھا لیا تھا..تو کیا وہ حلال تھے؟''

''جنرل جی میں تو اس قسم کے شرعی مسائل میں بالکل کورا ہوں..لیکن بُھول چوک۔ نادانی اور مجبوری میں جو کچھ ہو جائے اُس کی معافی ہے.. یا ہونی چاہئے..ویسے بھی اب ہم ریشم کے کیڑے کھانے نہیں جا رہے' ان کے لعاب سے تیار کردہ کپڑا خریدنے جا رہے ہیں۔''

''لیکن یار کھائے کون سے شہر میں تھے؟''

''کیا فرق پڑتا ہے کہ کون سے شہر میں کھائے تھے'' میں بیزار ہو گیا'' جو ہوا سو ہوا''

''ہاں کہتے تو تم درست ہو'' اُنہوں نے اپنے خضاب زدہ بالوں پر تادیر ہاتھ پھیرا..اور اُن کے کالے سیاہ بالوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اُنہوں نے عام خضاب نہیں بلکہ خضابِ الٰہی لگا رکھا ہے'' لیکن یار جوں جوں پاکستان واپسی کے دن قریب آ رہے ہیں

تُوں تُوں گناہ اور ثواب کے خدشے سر اُٹھا رہے ہیں۔ بہر حال میں نے تو دو تین کیڑے ہی کھائے تھے..''

چین میں آمد کے فوراً بعد سرگوشیاں شروع ہو گئی تھیں کہ بھئی یہ دو گھوڑا بوسکی کہاں سے ملے گی. چینی سلک کے دوپٹے بھی درکار ہیں کم از کم دو تھان درکار ہیں.. اور شنگھائی تو یقیناً شنگھائی میں ملے گی لیکن سلک ٹائیاں اور سکارف..... ہر ایک کی جیب میں سلک شاپنگ کی ایک لمبی فہرست تھی.. ہمارا خیال تھا کہ کسی نہ کسی شہر میں ہمیں کسی سلک فیکٹری میں لے جایا جائے گا جہاں ہم کوڑیوں کے مول ریشم کے تھان کے تھان خرید لیں گے.. لیکن ایسا نہ ہوا.. ہمارا دورۂ چین آخری مرحلوں میں آ گیا لیکن ہمیں صرف ریشم کے کیڑے کھانے کو ملے ریشم نہ ملا.. چنانچہ وفد کے اراکین میں ایک ہراس سا پھیل گیا کہ کہیں چین سے واپسی ہو جائے اور ریشم کے بغیر ہو جائے تو وطن عزیز میں ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔ لوگ یقین ہی نہیں کریں گے کہ ہم چین گئے تھے.. تب ہمیں اطلاع کی گئی کہ پورے چین میں ہانگ چُو ریشم کا مرکز ہے اور ریشم بازار میں وہ سب کچھ دستیاب ہوگا جو ہماری شاپنگ کی فہرستوں میں درج ہے۔

البتہ ایک پابندی تھی.. ہم صرف دو گھنٹے اس ریشمی بازار میں گزار سکتے تھے' اُس کے بعد ہمیں ہر حالت میں ہوٹل واپس پہنچنا تھا.. کیونکہ.. پورے چھ بجے ڈنر سرو کیا جانا تھا.. کہ یہی شیڈول تھا..

ریشم بازار چین کے ہر اُس بازار سے مختلف تھا جو ہم نے دیکھا تھا.. یہ آسانی سے اگر ہجوم کو کم کر دیا جائے تو انارکلی بازار ہو سکتا تھا. سینکڑوں چھوٹی بڑی دکانیں. کھوکھے اور سٹور جہاں ریشم ہی ریشم تھا.. بلکہ تھی.. یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ ریشم کو مذکر باندھا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں اِسے مؤنث سے باندھ دیا جاتا ہے. لڑکوں کی بجائے لڑکیوں کے نام ریشم ہوتے ہیں..

اور ان میں سرفہرست ہمارے گاؤں کی آبائی نائن ریشم ہے جو اب بھی بہ قید حیات ہے.. جب تک میری والدہ کا دم تھا وہ ہر دو چار ماہ بعد اپنے سر پر ایک گٹھڑی اُٹھائے اپنی چوہدرانی کو ملنے ہمارے گلبرگ کے گھر کے گیٹ پر دستک دے رہی ہوتی.. میری والدہ اُسے

دیکھ کر کِھل اُٹھتیں.. ریشم کی اتنی آؤ بھگت کرتیں کہ ہم حسد میں مبتلا ہو جاتے.. وہ دونوں پہروں ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہر شے سے آس پاس سے غافل گاؤں اور برادری کے تازہ ترین سکینڈل۔ شادیاں۔ اموات۔ بچوں کی پیدائش ڈسکس کرتی رہتیں.. ریشم چند روز ایک شاہی مہمان کی مانند ہمارے ہاں ٹھہرتی اور پھر چڑیا گھر عجائب گھر دیکھنے کے بعد چوہدرانی کی جانب سے دیئے ہوئے جوڑے گٹھڑی میں اور روپے تہہ کے پلو میں باندھ کر رخصت ہو جاتی.. ریشم کے دورے میں ذرا سی بھی تاخیر ہو جاتی تو میری والدہ مجھ سے کہتیں:

''مستنصر! اُس بھیڑی ریشم کو خط تو لکھو.. مر تو نہیں گئی..''

ریشم ہمارے خاندان کی ہر شادی میں پردھان ہوتی تھی اور ہر ایک پر حکم چلاتی تھی کیونکہ اُسے چوہدرانی کی آشیرواد حاصل ہوتی تھی..

پچھلے برس میں ایک طویل مدت بعد والد صاحب کی وفات کے بعد آبائی زمین کے چند ایکڑوں کا انتقال کروانے گاؤں گیا.. اپنے دادا کے گھر میں قدم رکھا تو ایک مسکین سا بوڑھا گلے میں حجامت کا ٹوٹا ہوا تھیلا لٹکائے آیا اور میرے سر پر پیار دے کر کہنے لگا ''چوہدری جی میں آپ کے بزرگوں کا سیپی ہوں' خدمت گزار ہوں مجھے پہچانتے ہو یا نہیں؟ میں ریشم کا گھر والا ہوں..''

اور میں اپنی والدہ کے لیے آبدیدہ ہو گیا..

چنانچہ میرے ذہن میں ریشم چین نہیں تھا.. ریشم نائن تھی..

یا پھر لاہور کے گوروارجن نگر کا تنگ بازار تھا..

میں رنگ محل مشن ہائی سکول جانے کے لیے گھر سے نکلتا تو موچی دروازے کے راستے جانے کی بجائے شارٹ کٹ مارتا اور گوروارجن نگر کے چوباروں میں قید بازار میں داخل ہو جاتا.. اس بازار میں برف کے گولے بیچنے والا وہ بابا بھی تھا جس کے گولے اُن زمانوں میں بڑے اِن تھے.. بابے کے علاوہ ہر جانب ریشم ہی ریشم تھا.. ہر گلی میں لکڑیوں کی آگ پر بڑے بڑے آہنی تسلے دھرے ہوتے جن میں ریشم کے کوئے اُبل رہے ہوتے.. اور ہر تسلے میں ایک جدا رنگ ہوتا اور ہر کوئے میں سے ریشم کی ایک مہین تار نکلتی ہی جاتی اور

میں سکول جانا بھول کر انہیں حیرت سے دیکھتا رہتا کہ مونگ پھلی جتنے کوئے میں سے سینکڑوں گز تار کیسے برآمد ہو جاتا ہے..

چنانچہ میرے لیے..ریشم یا تو ریشم نائن تھی..اور یا گوروار جن نگر میں تیز آگ پر اُبلتے رنگ رنگ کے ریشم کے کوئے..

آج تو یوں لگتا تھا کہ تتلی کے پر بھی ریشم کے ہو چکے ہیں وہ بازار ریشم میں یوں نرماہٹ سے اُڑتی پھرتی تھی..

بازار میں سجی ریشم کی مصنوعات کا امتزاج اور تنوع حیرت انگیز تھا..

دس برس پیشتر گلگت میں جب ایک دکاندار میرے سامنے چینی سلک کارپٹس بچھاتا گیا تو اُن درجنوں قالینوں میں سے کسی ایک پر چناؤ اور فیصلے کی گھڑی رُکتی نہ تھی..اُن میں سے ہر ایک ڈیزائن' کاریگری اور رنگوں کی حسِ جمال کی ترتیب میں یکتا اور یگانہ تھا..اور میں نے میمونہ سے کہا تھا..اتنا جمالیاتی تنوع اور رنگوں کی سوجھ بوجھ اور اُن کا مدھم ٹھہراؤ صرف اُسی قوم کے مزاج میں گندھا ہو سکتا ہے جس کی تہذیب کا آغاز اُن زمانوں میں ہوا جب دنیا کے بیشتر خطے نیم وحشی اور غیر تہذیب یافتہ تھے..یہ ڈیزائن یہ کاریگری سینکڑوں نہیں ہزاروں برسوں کا نچوڑ ہے..اسی لیے علم کے لیے چین جانے کا حکم ہوا تھا..

ہم نے سلک بازار میں سے اگرچہ بہت سکارف..ٹائیاں..دسترخوان اور رومال خریدے لیکن ہماری تسلی نہیں ہو رہی تھی..وہ شفون اور سلک کے دوپٹے کہاں ہیں..ہماری خواتین کے بھدے اجسام کے لیے وہ سلک کے سوٹ کہاں ہیں..

بالآخر جب ہم وقت کی کمی کے باعث اس بازار ریشم میں بھگدڑ مچاتے اس کے اختتام تک پہنچے تو وہاں ہمیں جنس مطلوبہ وافر مقدار میں میسر ہو گئی..لیکن یہاں بھی چناؤ کا مسئلہ درپیش تھا..اتنی ورائٹی تھی..چنانچہ اگر میں ایک لپٹے ہوئے ریشم کے تھان کو کھلواتا اور اُس کے ڈیزائن اور رنگوں کے امتزاج کو پسند کرتا تو حسرت ناک بھی فوراً دکاندار کو کہتا کہ برادر مجھے بھی اسی میں سے ایک سوٹ عنایت کر دو..اور اگر حسرت ناک کسی کپڑے پر ناک رکھتا تو میں دوہائی دیتا کہ بھائی صاحب مجھے بھی یہی درکار ہے..جانے نہ پائے..اس

شاپنگ کے دوران اصولی طور پر یہ معاہدہ طے پا گیا کہ وطن واپسی پر ہم اپنی بیویوں' بیٹیوں' بہوؤں اور اگرچہ یہ ناممکنات میں سے ہے' اپنی محبوباؤں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہرگز نہیں کروائیں گے کیونکہ وہ سب کی سب ایک ہی ڈیزائن اور رنگ کے سوٹ زیب تن کیے ہوں گی..ایک عورت کے لیے اس سے بڑھ کر خودکشی کا جواز کیا ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری عورت نے بھی اُسی رنگ اور ڈیزائن کا سوٹ پہن رکھا ہو..

ایک قدیم وضع کی..ہاتھوں میں ریشم کی طرح ہی پھسلتی ہوئی ریشم کی شال کے سنہری پھولوں اور زرد پتوں پر تتلی بیٹھ گئی اور بہت دیر تک بیٹھی رہی..پھڑپھڑاتی رہی..

''تتلی یہاں سے کوچ کرو..مجھے اس شال کا ڈیزائن دیکھنے دو..''

''میں کیوں کوچ کروں..میں اس کے ڈیزائن میں شامل ہوں..''

''تنگ نہ کرو..کوچ کرو''

''صرف ایک شرط پر..''

''کس شرط پر..جلدی سے بتاؤ دو گھنٹے پورے ہونے کو ہیں اور کوچ منتظر ہے''

''تم یہ شال ایک زرد شہزادی کے لیے خرید لو..''

''چینی زرد نسل ہے..اس کے دریا زرد دریا کہلاتے ہیں..اس کی شہزادیاں زرد ہیں تو میں کس ایک شہزادی کے لیے یہ شال خرید لوں تتلی..''

''اُس زرد شہزادی کے لیے جو شہرِ ممنوعہ میں تمہاری منتظر تھی..''

''وہاں..فاربڈن سٹی میں..محل تھے اور باغ تھے اور دالان تھے اور نہریں تھیں..
وہاں اور کوئی تو نہ تھا..''

''وہاں وہ تھی..اگرچہ تم دیکھتے نہ تھے..لیکن اُس کی زردی دُھوپ میں گھلی ہوئی تھی..وہ زرد کرنوں سے بنی ہوئی ایک شال کی مانند تم پر سایہ کرتی تھی اور تم دیکھتے نہ تھے..''

''تتلی..''میں اُس زرد پتے کے قریب ہوا جس پر وہ پر پھڑپھڑا رہی تھی' تم بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو..خمار میں ہو؟..مجھے تمہارے پروں میں سے چین کی اُس واہیات شراب کی متلی اور بو آ رہی ہے..''

تتلی نے شرمندگی میں پر سمیٹے ''آئی ایم سوری.. میں واقعی لنچ کے دوران تمہاری میز کے برابر میں ایک نوجوان چینی جوڑے کی میز پر دھری شراب کی بوتل کے منہ پر غلطی سے بیٹھ گئی تھی اور بیٹھی ہی رہی تھی.. مجھ پر اثر ہو گیا ہے.. آئی ایم سوری'' اور وہ اپنی خمار آلود شرمندگی میں گم شال کے سنہری پھولوں اور زرد پتوں سے اُڑ گئی اور پھر نظر نہ آئی... اُدھر دہقانی یو آن لٹانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا.. وہ بے دریغ شاپنگ کیے جا رہا تھا..

''اے نادان دہقان کیوں اپنی حق حلال کی کمائی یوں پانی کی طرح بہا رہا ہے؟''

''تم فکر نہ کرو تارڑ میرا بیٹا مجھے ہر ماہ امریکہ سے ساٹھ ہزار روپے روانہ کرتا ہے''

''بیٹے کو اگر علم ہو جائے کہ والد صاحب میرے ڈالروں سے یوں اللے تللے اُڑاتے ہیں تو وہ تمہارا خرچہ پانی بند کر دے''

''کیا کروں یار'' اُس نے بے بسی سے کہا ''تم نہیں جانتے کہ میری کتنی بہوئیں کتنی بہنیں اور کتنی پھپھیاں' تائیاں اور ماسیاں ہیں جو سب کی سب اپنے ریشمی سوٹوں کا انتظار کر رہی ہیں.. یہاں تک کہ اُس باتونی ملازمہ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ خریدنا ہے جو ہمیشہ میرا کارڈ ضائع کروا دیتی ہے''

دہقان میرے لیے بھی ازحد مددگار ثابت ہوا۔ اُس نے ایک نہایت ہی مہنگے مگر شاہانہ سلک بیڈشیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا ''کچھ نہ خریدو. صرف یہ اپنی بیٹی کے جہیز کے لیے خرید لو.. اُس کے سسرال اسے دیکھ کر اندھے ہو جائیں گے اور جو کچھ تم نہیں دے پاؤ گے وہ نہیں دیکھ پائیں گے''

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ بیڈشیٹ شہرِ ممنوعہ کے کسی شاہی خواب گاہ میں بچھانے کے لائق تھا.. اُسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں..

ہم سب شیڈول کی پابندی کے مارے ہوئے اپنا ریشم یا اپنی ریشم گھسیٹتے ہوئے کوچ میں آ بیٹھے..

سب موجود تھے لیکن سفید ریش مفقود تھا.. اور وہ بہت دیر تک مفقود رہا.. اور پھر بالآخر آیا تو ہانپتا' داڑھی نچوڑ کر جھکا ہوا ایک کشمیری ہاتو کی مانند اپنی کمر پر ایک وزنی گانٹھ اُٹھاتے ہوئے بالآخر آیا..

''تم لوگ تو فیشنی چیزیں تلاش کر رہے تھے.. فینسی کپڑے خرید رہے تھے لیکن مجھے تو سلک کے دوپٹوں کی تلاش تھی.. اس تلاش کے دوران میں ایک ایسے چینی سوداگر کے گودام میں جا پہنچا جو تھوک کا کاروبار کرتا ہے اور مسلمان بھی ہے.. اُس نے مجھے قہوہ پلایا۔ کلمہ سنایا اور پھر تھوک کے بھاؤ دو سو دوپٹوں کی یہ گانٹھ عنایت کر دی.. پاکستان کی نسبت آدھی سے بھی کم قیمت پر..''

اب جو لوگ سفید ریش کی گمشدگی پر اُسے برا بھلا کہہ رہے تھے کہ پتہ نہیں کہاں دفع ہو گیا ہے' وہی اُس کے ساتھ فرینڈلی ہونے لگے اور اُس کی بلائیں لینے لگے ''یار تم دو سو دوپٹوں کا کیا کرو گے.. یار اپنی بھرجائی کے لیے بیس دوپٹے مجھے دے دو.. یار دس دوپٹے ہی دے دو اللہ تمہیں اجر دے گا..''

اور سفید ریش نے ہمیشہ کی طرح فیاضی سے کام لیا اور وفد کے اراکین کی بھابیوں' بیویوں اور پھپھیوں وغیرہ کے لیے دس دس بیس بیس دوپٹے مہیا کر دیئے۔

ریشم بازار سے واپسی پر کوچ میں بیٹھے ہوئے جب ہر کوئی اپنی اپنی شاپنگ کی ڈینگیں مار رہا تھا میں نے سوچا کہ ماسی ریشم نائن کو وطن واپسی پر گاؤں جا کر یہ ضرور بتاؤں گا کہ ماسی جہاں سے تمہارا نام آیا تھا' میں وہیں سے ہو کر آیا ہوں۔

بیجنگ جانے والی پرواز کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی.. پہلے چینی میں ہوتی تھی اور پھر انگریزی میں ہوتی تھی اور ایسی انگریزی میں ہوتی تھی جو چینی ہی ہوتی تھی..

سنہری وانگ لی ایک چابی کی گڑیا کی طرح.. ایک تتلی کی طرح ہماری روانگی کے انتظامات کرتی پھرتی تھی..

سفید ریش ایئرپورٹ کی سووینئر شاپ میں چینی وال ہینگنگ کے سودے کر رہا تھا.. جو نہ ہوئے! دہقان فکرمند تھا.. اُس نے پورے گاؤں کے لیے شاپنگ کر لی تھی اور فکرمند تھا کہ اتنے زائد سامان کا کرایہ نہ پڑ جائے...

لیل پوری ایک ہانگ چُوئی بانس کی تیلیوں سے بنے مزاحیہ سے ہیٹ میں گھوم رہا تھا. صرف گیسو دراز تھا جو لاپرواہ اور بے فکر تھا کیونکہ اُس نے ریشم بازار میں بھی اپنے

یوآنوں کو ہوا نہیں لگوائی تھی۔

قوم کی راہنمائی ایک پیچیدہ اور تھکا دینے والا عمل ہے اس لیے لیڈر کچھ تھکا تھکا سا لگتا تھا۔ ہم صرف تین روز پیشتر ہانگ چو کے کالاشاہ کاکو ٹائپ ریلوے سٹیشن پر اُترے تھے.. اور ان تین دنوں میں ہی ہانگ چُوئی سے ہو گئے تھے...اور اسے چھوڑ جانے کے خیال سے دُکھی ہو رہے تھے..

ہمارا سامان متحرک بیلٹ پر رینگتا اندر جا چکا تھا.. ہمارے ہاتھوں میں بورڈنگ کارڈ اور ٹکٹ تھے اور بیجنگ روانہ ہونے والی پرواز کا اعلان ہو رہا تھا..

سنہری وانگ لی ایئرپورٹ میں داخلے کے دروازے کے ساتھ کھڑی تھی.. اور ہر ایک سے خوشدلی اور دوستی کے ساتھ ہاتھ ملاتی مسکراتی الوداع کہہ رہی تھی..

ہال میں جگہ جگہ قد آدم آئینے تھے..میں نے اُن کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک نگاہ اپنے آپ پر ڈالی.. یہ عمر ایک تماشہ تھی اور میں محوِ آئینہ داری.. اور پھر ایک نگاہ وانگ لی پر ڈالی کہ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں اور وہ سورج مکھی کے پھول کی طرح روشن مسکراہٹ لیے سب سے ہاتھ ملاتی خدا حافظ کہہ رہی تھی..

جب میری باری آئی تو میں نے بھی نہایت سرکاری طور پر ہاتھ بڑھایا اور اُس نے بھی اُسی انداز میں میرا ہاتھ تھاما' مسکراہٹ سے راکھ کیا اور چینی میں کچھ کہا..

میرے پاس تو اُس کا ایڈریس بھی نہیں تھا.. اگر ہوتا تو بھی میں کون سی زبان میں اُسے خط لکھتا اور کیا لکھتا..

شاید یہ ایسا ہی تھا یا میرا واہمہ تھا کہ اُس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے مجھے محسوس ہوا کہ اُس نے میرے ہاتھ کو باقیوں کی نسبت صرف ایک پل کے لیے زیادہ تھامے رکھا.. لیکن شاید ایسا نہ تھا..

اُس شب کے خواب کا تو تتلی کے سوا کسی کو علم نہ تھا..

اور آج کی رکشا رائڈ کے بارے بس بھی کسی کو کچھ خبر نہ تھی..صرف گیانی کے گیان میں کچھ تھا.. ہمارے درمیان عمروں کے تفاوت کے باوجود ایک رفاقت رہی تھی.. اگر خواب کو منفی کر دیا جائے تو بھی ایک بے نام تعلق رہا تھا جو برگد کی شاخوں میں سے ایک کونپل کی طرح پھوٹا تھا..

بے شک وہ ایک عارضی سرائے تھی جس میں ایک قیام خواب میں ہوا..

بھلے وہ عمر خیام کی ایک ایسی ندی نہ تھی جس کے کناروں پر میں تا دیر بیٹھا رہا لیکن اُس کی روانی کی گنگناہٹ سے آشنا تو ہوا..

میں ہانگ چو سے واپس جا رہا تھا..

پوچوای آج سے بارہ سو برس پیشتر جب ہانگ چو کی گورنری سے سبکدوش ہو کر واپس جا رہا تھا تو اُس نے ''ہانگ چو کے عوام کو خدا حافظ'' نظم لکھی..

- واپس جانے والی سڑک کے کنارے وڈیرے اور افسر قطار باندھے کھڑے ہیں۔
شراب کی صراحیاں الوداعی میز پر دھری ہیں..
کیا وجہ ہے کہ تمہارے آنسو یوں ٹپ ٹپ بہہ رہے ہیں..
میں نے تو بس اتنا ہی کیا کہ جھیل پر بند بنا دیا..

مغربی جھیل پر بنا ہوا یہ بند آج بھی ''پوچوای کا بند'' کے نام سے مشہور ہے..

لیکن اُن لمحوں میں جب..شراب کی صراحیاں الوداعی میز پر دھری تھیں..وفد کے اراکین قطار باندھے..ایئرپورٹ کے اندر جانے کے لیے بورڈنگ کارڈ اور ٹکٹ سنبھالے ..سنہری وانگ لی سے ہاتھ ملاتے تھے اور میں اُسے دیکھ رہا تھا..اُس کے چہرے پر کسی کے لیے بھی کوئی آشنائی کوئی اُلفت نہ تھی..

- کون کہتا ہے کہ یہ میری خواہش سے ہوا ہے..
یہ جدائی' یہ تم سے اس قدر دُور زندگی گزارنا؟
میرے لباس سے ابھی اُس عطر کی خوشبو آتی ہے جو تم نے لگایا تھا..
کیا تمہیں پتہ تھا کہ لوگ اپنی محبت کو چھپاتے ہیں
ایسے پھول کی طرح جو اتنا قیمتی لگتا ہو کہ اُسے توڑا نہ جائے..

مقام.....بیجنگ

''مسجد نیوجیہ..سرخ ستون اور بلاؤں کو روکنے کے لیے عفریتوں اور..اژدھوں کے مجسّمے''

بیک ٹو بیجنگ..
بیجنگ واپس...
شی آن کی شاموں سے واپس..
شنگھائی کی شان سے واپس..
ہانگ چُو کی جھیل اور پتلی پیکنے دی..سے واپس..
کیا تمہیں پتہ تھا کہ لوگ اپنی محبت کو چھپاتے ہیں..
بیک ٹو بیجنگ..
اور بیک ٹو پیس ہوٹل!

پیس ہوٹل کے سنہری ستونوں والے جگمگاتے شاندار ہال میں واپس جہاں کھجور کے درخت جوں کے توں تھے۔ ہماری دس روزہ غیر حاضری کے دوران یہ نہ بڑھے تھے نہ گھٹے تھے..نہ بہار میں تھے نہ خزاں آثار تھے بس جوں کے توں تھے..ایک شاخ کا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا..یہ وہ کاروان سرائے تھی جس میں مسافر آتے جاتے رہتے تھے اس لیے خدام

ہمیں کیونکر پہچانتے کہ یہ وہی مسافر ہیں جو تیرہ روز پیشتر اس کی چھت تلے آئے تھے اور پھر رخصت ہو گئے تھے..آئے تھے تو ان میں چین کا ایک ذرّہ بھی نہیں تھا اور اب لوٹے ہیں تو نظاروں کا ایک صحرا بدن میں بھر کے لوٹے ہیں..اس صحرا میں شی آن کی شاموں کی بادِ نسیم ہولے سے چلتی تھی..شنگھائی کے گلاب کھلتے تھے..اور ہانگ چو کی جھیل کے پانیوں کے سراب ٹھاٹھیں مارتے تھے..

ہم پیس ہوٹل میں واپس آئے تو گویا ایک آبائی گھر میں واپس آئے اور ہم جانتے تھے کہ یہ زینے کہاں جاتے ہیں....اس کے چمکیلے فرش پر چلتے ہوئے کیسے اپنے آپ کو پھسلنے سے بچانا ہے..ڈائننگ روم میں جو نمائشی جھرنے اور آبشاریں ہیں اُن کے گرد کون سی میز پر ناشتے کے لیے بیٹھیں تو اُن کے بھیگتے بدن کے پار نظارہ فرحت آمیز ہے اور اس کے بلند سنہری ستونوں اور کھجور کے آرائشی درختوں کے عکس جس شفاف سنگ مرمر کے فرش پر تصویر ہوتے ہیں اُس کے کون سے رُخ پر وہ آرام دہ صوفہ ہے جہاں بیٹھ کر باہر کے بیجنگ اور اُس کی چہل پہل رونقوں پر نظر ڈالی جا سکتی ہے..

ہم تجربہ کار اور خرانٹ ہو چکے تھے..

سفر کے آغاز میں ہم ایک دوسرے کے ناموں اور کاموں سے واقف تھے..واجبی شناسائی تھی..لیکن اب ہم ایک دوسرے کی خصلتوں اور کمینگیوں اور بے راہرویوں سے آگاہ ہو چکے تھے..اگرچہ شناسائی اب بھی واجبی تھی..

لیڈر میری نیکر..میری بدتمیزی اور بدمزاجی سے سمجھوتہ کر چکا تھا اور اُس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا..

عمر رسیدہ اور چین میں جنرل کے عہدے پر فائز ہو جانے والا شاعر میرا دوست ہو چکا تھا' اگرچہ وہ اب بھی اہم ملاقاتوں کے دوران سو جاتا تھا اور اتنے زور کے خرّاٹے لیتا تھا کہ ملاقاتیں ادھوری رہ جاتی تھیں..

گیانی کی باؤلنگ ختم ہونے میں نہ آتی تھی اور وہ بار بار یارکر پھینک کر مجھے بولڈ کر کے یہ ٹوہ لگانا چاہتا تھا کہ سنہری وانگ لی اور تم..کیا صرف شاپنگ کے لیے غائب ہوئے

تھے.. گیسو دراز نے میرا دل موہ لیا تھا کہ اُس نے اپنی دھیمی اور انکساری میں ڈوبی ہوئی بظاہر معصوم گفتگو سے دورۂ چین میں سب سے زیادہ دل موہ لیے تھے..

لیل پوری اپنے تکونے ہانگ چوئی ہیٹ سے جدا نہ ہوتا تھا.. مجھے اخلاقیات اور لباس کا درس دیتا رہتا تھا.. اس کے باوجود نفیس لیل پوری تھا..

سفید ریش کی حماقت انگیز حد تک فیاضی اور مددگاری.. وسعت علمی اور وسعت قلبی نے میرے دل میں جگہ بنالی تھی.. لیکن کسی بھی دل میں جگہ بنا کر وہاں سے فوراً رخصت ہو جانے کی خصلت بھی اُس میں موجود تھی.. وہ جیسے فوراً نچھاور ہو جاتا تھا ویسے فوراً آپ کو فراموش کر دیتا تھا..

حسرت ناک بھی اپنی خود کلامی کے باوجود اتنا حسرت ناک نہیں رہا تھا کیونکہ اُس کی کچھ حسرتیں پوری ہو چکی تھیں اور اس آسودگی نے اُس کے مزاج اور ناک پر خاطر خواہ اثر ڈالا تھا.. وہ سیانا ہو گیا تھا..

البتہ دہقان میں کوئی واضح تبدیلی رُونما نہیں ہوئی تھی.. وہ بھولا بن کر سب کو بیوقوف بناتا چلا آیا تھا..

اور اس دوران میرے ساتھیوں نے مجھے کیسا پایا؟.. میں نہیں جانتا.. لیکن یہ جانتا ہوں کہ وہ مایوس ہوئے.. میں اُن کے اخلاقی اور ادبی معیار پر پورا نہیں اُترا.. اُن کی نظر میں میری جو ادبی حیثیت تھی اُس میں بہت سی دراڑیں پڑیں.. میں ادیب نہ تھا یونہی آوارہ گردی کرتے اُن کے قبیلے میں آ شامل ہوا تھا..

ساتویں منزل...

پہلے میرا کمرہ ساتویں منزل پر تھا...

مگر چین میں قیام کے دوران میرے درجات بلند کر دیے گئے تھے اور اب میں بارہویں منزل پر مقیم تھا..

اگرچہ کھڑکی سے نیچے جھانکنے پر یہاں سے بھی وہی شنیٹی ٹاؤن اور اُس کی ٹین کی چھتوں والا ایک گھر.. ایک صحن.. صحن میں نوڈل اُبالتی عورت اور صبح سویرے صحن میں سے گلی

میں آتا وہ شخص تھا جو ایک سائیکل دھکیلتا ہوا باہر آتا تھا..

کچھ بھی نہ بدلا تھا..

چونکہ چین گردی کے دوران ہم بیشتر اوقات کفار کے نرغے میں رہے تھے اور اُن کے کھانے اور پینے سے متاثر ہو کر وہی کھانے اور پینے لگے تھے یعنی قدرے بھٹک گئے تھے' بے راہرو ہو گئے تھے اور ایمان کمزور پڑ رہا تھا اس لیے ہم نے مناسب جانا کہ اس سے پہلے کہ ہم بالکل ہی چینی اور کافر ہو جائیں' صراط المستقیم سے بھٹک جائیں.. کیوں نہ اپنی جڑوں کو لوٹ جائیں' کسی مسجد کی زیارت کو جائیں اور اپنے ایمان کو تقویت کے ٹیکے لگائیں..

چنانچہ ہم نے بیجنگ کی جامع مسجد نیوجیہ کی زیارت کی ٹھانی..

یہ مسجد ظاہر ہے بیجنگ میں ہی واقع تھی.. کہاں واقع تھی اس کا ہمیں علم نہ تھا۔ صرف یہ علم تھا کہ اگر ہم کوچ میں سوار ہو جائیں تو آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد وہاں پہنچ جائیں گے..

اور ہم پہنچ گئے..

کوچ سے اُترے ہیں تو بیجنگ کے مسلمان محلے میں اُترے ہیں.. گویا اپنے ہی گھر میں اُترے ہیں کیونکہ یہاں جو ماحول تھا اُس میں سانس لیتے ہیں تو آسانی سے لیتے ہیں..

ایک اجنبی سرزمین پر انجانی زبان اور اجنبی شکلوں کے نرغے میں آپ ہر لحظہ ایک بے بس سہمے ہوئے خرگوش ہوتے ہیں.. یہ کیفیت یہاں پہنچ کر معدوم ہو گئی.. پردیس کے ڈر جو ہمہ وقت آپ کے کندھوں پر بوجھ ہوتے ہیں اور آپ سر جھکا کر چلتے ہیں تو وہ ڈر بھی دفعتاً زائل ہو گئے.. اور ہم اپنی اوریجنل حالت میں آ گئے.. بے شک اس آبادی میں.. اس کی گلیوں اور محلوں میں جو مکین تھے جو راہگیر تھے اُن کی شکلیں ہم سے الگ تھیں لیکن وہ پرائے نہیں لگتے تھے.. یہ شاید عقیدے کی یک جہتی کا نفسیاتی اثر تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بیجنگ کے اس حصے میں ایک خاص ٹھہراؤ تھا.. باہر بھگدڑ مچی ہوئی تھی اور یہاں اطمینان تھا.. اسے آپ برادرانِ اسلام کی سستی اور کاہلی بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس محلے میں کسی کو کہیں بھی نہیں پہنچنا تھا.. اگرچہ یہ ایک ورکنگ ڈے تھا لیکن یہاں سب کو فراغت ہی فراغت تھی..

بے شک اس فراغتی روّیے کے باعث ان محلوں کے مکان قدرے بوسیدہ تھے‘ گلیوں میں
وہ ستھرا پن اور نفاست نہیں تھی جو بیجنگ کا خاصا ہے لیکن یہ علاقے بے رُوح نہیں تھے۔
عمارتوں اور دکانوں کی سیڑھیوں پر بوڑھے حضرات بنیانیں اور نیکریں پہنے ہاتھ پہ ہاتھ
دھرے بیٹھے ہیں اور منہ اٹھائے بلاوجہ سڑک پر سے گزرتی خلقِ خدا کو تک رہے ہیں... بالکل
بیکار بیٹھے..

دکانیں ہیں تو اُن کے دروازوں اور شوکیسوں پر کلمہ شریف کے سٹکر چسپاں ہیں
اور ریستوران ہیں تو اوپن ایئر اور کھوکھوں کے سٹائل میں ہیں۔ اور ہر دوسری دکان یا سٹال
کسی نہ کسی کھانے پینے کی شے سے لبریز ہے اور حسب روایت کھلے عام ہے اور صفائی کی
جانب دھیان کم ہے.. اس محلے کے بقیہ ماحول سے قطع نظر خوراک کی فراوانی ہی یہ ظاہر
کرنے کے لیے کافی تھی کہ یہ مسلمان برادران کی بستی ہے.. بیسن میں تلے ہوئے مرغی کے
قتلے‘ پکوڑے‘ سموسہ نما اشیاء‘ روسٹ مرغیاں‘ پوڑیاں‘ تلی ہوئی چانپیں.. یہ سب خوراکیں
حلال تو تھیں ہی لیکن ان کی مہک اور ذائقہ بھی ایسا تھا کہ ہم ندیدے بچوں کی طرح ہر دکان
سے کچھ نہ کچھ خرید لیتے اور چٹخارے لیتے ہوئے کھاتے چلتے..

لیل پوری بڑی فراخ دلی سے ہر ایک کو بیسن تلے ہوئے مرغی کے قتلے پیش کر رہا
تھا کیونکہ اُس نے اتنی خریداری کر لی تھی کہ اُن سب قتلوں کو کھا جانا اکیلے کے بس میں نہ تھا..

شاید یہ بھی نفسیاتی مسئلہ ہوگا کہ ہمارا بدن چین میں شاید پہلی بار.. شی آن کے
بعد.. خوراک کی خوشبو اور ذائقے سے لطف اندوز ہوتا اُسے مکمل طور پر قبول کر رہا تھا..

ہم بے دھڑک ہو کر ہر خاتون اور ہر مرد سے ’’السلام علیکم‘‘ کہہ کر ہاتھ ملاتے
اُنہیں اپنے پاکستانی ہونے کا بتا رہے تھے اور وہ بھی جواب میں کبھی گرم جوش ہو جاتے اور
وعلیکم السلام کہتے اور کبھی حیران سے ہو جاتے.. بعد میں احساس ہوا کہ اس محلے میں دیگر عقائد
کے اور آزاد طبیعت لوگ بھی تو قیام پذیر تھے جو ہماری گرم جوشی پر حیران ہوتے تھے..

ایک وڈیو گیم سنٹر کے باہر سیڑھیوں پر ایک نہایت فربہ اور فاتر العقل نوجوان منہ
کھولے ہمیں دیکھ رہا تھا.. میں نے اُس کی تصویر اُتارنے کی کوشش کی تو وہ شرما گیا اور سر جھکا

کر بیٹھ گیا.. میرے لاکھ پکارنے پچکارنے پر بھی کیمرے کی جانب نہ دیکھا.. اس پر چند
آسودہ بوڑھوں نے جو قریب ہی استراحت فرما رہے تھے اُس پر آوازے کسے کہ اوئے
کیمرے کی طرف دیکھ ہیرو.. مسلمان مسلمان.. لیکن وہ سر جھکائے شرماتا رہا۔

کاش ہمارے گلے میں شیڈول کا طوق نہ ہوتا تو ہم ایک پورا دن یہاں
گزارتے.. ان بوڑھوں کے ساتھ سیڑھیوں پر براجمان ہو کر گپ لگاتے... گلیوں میں
گھومتے.. گھروں میں جھانکتے.. اور ان گھروں کے مکین ہمیں دیکھ کر دروازوں میں
آ کھڑے ہوتے اور ہمیں اندر آنے کی دعوت دے رہے تھے تو ہم ان کے گھروں کے اندر
جاتے.. یہیں فٹ پاتھ پر کھانا کھاتے اور پھر مسجد کی زیارت کو جاتے..

یہاں جو اسلامی بہنیں نظر آتی تھیں وہ بھی شعائر اسلامیہ کے چینی طرز کی پابند
تھیں.. یعنی نیکریں بھی اگر پہنتی تھیں تو قدرے شرعی کہ گھٹنوں تک تو آ جائیں البتہ بلاؤز اور
ٹی شرٹس پہننے میں احتیاط نہیں برتتی تھیں.. اور نہ ہی کوئی خاتون حجاب یا برقعے میں نظر آئی....
یقیناً یہاں مزید تبلیغ کی گنجائش تھی..

ہم نے جتنے بھی لوگوں سے سلام دُعا کی اُنہوں نے ہاتھ اُٹھا کر ہمیں سیدھے
چلے جانے کی تلقین کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ برادر اگر ادھر آئے ہیں‘ مسجد نیوجیہ کے
لیے ہیں..

دائیں ہاتھ پر ایک گلی جس کے پہلو میں ایک قدیم دیوار اور دیوار کے آخر میں
ایک چھوٹا سا دروازہ جس کے اندر مسجد نیوجیہ..

مسجد نیوجیہ کسی قدیم چینی شہنشاہ کے محل کی شان و شوکت لیے ہوئے تھی‘ صرف
اس فرق کے ساتھ کہ یہاں کوئی شہنشاہ نہیں رہتا تھا۔ وہ جو شہنشاہ بناتا ہے پھر اُنہیں خاک
میں ملا دیتا ہے‘ وہ وہاں رہتا ہے.. یہ اُسی کا گھر ہے.. یہ مسجد شہرِ ممنوعہ کے محلات سے کہیں
بڑھ کر نفیس اور پُروقار تھی.. دنیا بھر کی مساجد کے مقابلے میں یہ ایک جداگانہ جمال کی حامل
تھی۔ اور یہ جمال چینی ثقافت کی قدامت اور حسن کا مظہر تھا.. کہ اس کا طرز تعمیر ایسا تھا کہ

جب تک آپ کو یہ خبر نہ کی جائے کہ یہ مسجد ہے.. کم از کم ہم پاکستانیوں کو.. جو مسجد کو ایک مخصوص طرزِ تعمیر سے منسلک کر کے کسی بھی اختراع کو غیر اسلامی گردانتے ہیں.. آپ کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ یہ ایک مسجد ہے.. مؤذن کا پگوڈا نما مینار۔ وضوخانے اور دالان۔ ڈھلوان چھتیں کسی بھی گنبد کے بغیر.. یہ سب کچھ بیجنگ کے بدھ مندر یا کنفیوشس کی کسی عبادت گاہ یا ہانگ چُو کے عظیم پگوڈے سے مختلف دکھائی نہیں دیتا.. اور یہ ہے بھی نہیں.. یہ عمارت صورت شکل اور ظاہر سے ایک چینی محل یا بدھ مندر بھی ہو سکتی تھی لیکن اس کا اندر.. اس کا باطن ایک مسجد تھا.. ہم ہمیشہ ظاہر پر جاتے ہیں اور تفرقہ پھیلاتے ہیں اور ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں۔ باطن پر کبھی دھیان نہیں کرتے.. مجھے یقین ہے کہ یہ مسجد اگر پاکستان میں ہوتی تو اسے قطعی غیر اسلامی قرار دے دیا جاتا.. ہمیں ظاہر سے غرض ہے اور باطن کی خبر نہیں..

مسجد کے خدام ہمیں اس قدیم اور شاندار خانۂ خدا کے مختلف حصے دکھا رہے تھے..

میں نے نوٹ کیا کہ نہ صرف مسجد کی مرکزی عمارت کی ڈھلوان چینی چھتوں کے کنگروں پر.. بلکہ صحن کے دوسری جانب مؤذن کے لیے جو ایک دو منزلہ بارہ دری نما ٹاور ہے' اُس کی چھت کے چاروں کونوں پر بھی.. اژدھوں' شیروں' بلاؤں اور عجیب عجیب شکلوں کی عفریتوں کے چھوٹے چھوٹے بُت نصب ہیں جو بیجنگ کے آسمان کے پس منظر میں زندہ لگتے تھے اور ہر ایک کونے سے ایک قدیم چینی گھنٹی لٹک رہی تھی..

میں نے یہی اژدھے' شیر' بلائیں اور عفریتیں چین کی بے شمار قدیم عمارتوں اور خاص طور پر بدھ مندر اور شی آن کے پگوڈوں کی چھتوں پر بھی آویزاں دیکھی تھیں..

میں نے مسجد کے چینی رہبر سے رجوع کیا ''یہ عفریتوں اور اژدھوں کے مجسّمے اگرچہ نہایت دیدہ زیب لگتے ہیں لیکن.. ایک مسجد کی چھت پر انہیں آرائش کے لیے نصب کرنا جائز ہے؟''

''کیوں نہیں؟'' چینی رہبر متحیر ہوا..

''لیکن کیوں؟''

''یہ تو ہماری قدیم روایت ہے کہ ہر عمارت کو بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ

مجسّمے چوکیداری کے لیے نصب کیے جاتے ہیں..''

''لیکن مسجد کی عمارت پر.. میرا مطلب ہے کہ.. یہ بُت ہیں جانداروں کے.. اور.. کیا ایک مسجد کو ان مجسّموں کی چوکیداری کی ضرورت ہے؟''

''مسجد کو تو لازمی طور پر ان کی ضرورت ہے کیونکہ یہ پاکیزہ جگہ ہے اور یہاں ہرگز بلاؤں کا نزول نہیں ہونا چاہیے..'' اُس نے گہرے تیقّن سے کہا..

ہم دونوں.. ہمارا مسلمان چینی رہبر اور میں... چونکہ ثقافت۔ روایت اور تاریخ کا سراسر الگ اور مختلف پس منظر رکھتے تھے.. اُس میں گندھے ہوئے تھے اس لیے ہم کبھی بھی ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے تھے.. ہم اپنی بنیاد پر مضبوطی سے قائم تھے اور وہ اپنی جگہ دائم تھے.. اور ہم دونوں لاکھ چاہنے کے باوجود ان بنیادوں سے نیچے آ کر ایک دوسرے کا نکتہ نظر سمجھنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے..

''درست..'' میں نے مسکرا کر سر ہلایا..

''دیکھیں..'' رہبر بھی مسکرایا ''یہ مسجد.. ہمارا عقیدہ ہے اور بلاؤں کو دُور رکھنے کے لیے یہ مجسّمے.. ہماری ثقافت ہیں...''

مجھے یاد ہے کہ پاکستان شمال کے ایک دُور افتادہ گاؤں ترشنگ میں.. نانگا پربت کی ازلی برفوں کے دامن میں.. ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان میں نے ایک عمارت کو بہت دُور سے دیکھا تھا اور وہ ایک بدھ مندر لگتی تھی.. پگوڈا نما تھی اور تبّتی طرزِ تعمیر کی عکاسی کرتی تھی اور جب میں اور میرا بیٹا سمیر اس کے قریب پہنچے تو وہ ایک مختصر اور پُرسکون مسجد تھی جہاں ہم دونوں نے نفل ادا کیے.. وہ مسجد ایسی تھی کیونکہ اُن علاقوں میں لداخ اور تبّت کی ثقافت کا اثر ہے..

ہم ہمیشہ اپنے موسموں اور اپنی ثقافتی اقدار کے حوالے سے اپنے عقیدے کی عبادت گاہ تخلیق کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور اس آفاق میں موسم اور بھی ہیں.. ثقافتیں ہم سے جدا بھی ہیں.. میں تصور کر سکتا ہوں کہ ایک چینی اگر پاکستان آتا ہے تو وہ ہمیں بھی شک کی نظر سے دیکھے گا جس نظر سے میں اُنہیں دیکھ رہا

تھا..وہ بادشاہی مسجد کے گنبدوں پر نظر ڈال کر حیرت سے مجھے دیکھے گا اور کہے گا ''برادران
گنبدوں کے اوپر ہندوؤں کے سنہری کلس کیوں لگا رکھے ہیں۔اصفہان کی مساجد کے
گنبدوں پر تو یہ نہیں ہوتے..اور تمہاری مسجد کے برابر میں رنجیت سنگھ کی مڑی کی جو عمارت
ہے وہ بھی تمہاری مسجد ایسی ہے..اُس کے اور مسجد کے گنبدوں اور سنہری کلسوں میں کوئی فرق
نہیں تو کیا یہ جائز ہے؟''

اب مجھ میں تو اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوگی کہ میں اقرار کرلوں کہ یہ میرا عقیدہ
ہے..اور یہ میری ثقافت ہے..

دراصل عقیدے کا کوئی مینار نہیں ہوتا..

کوئی گنبد..کوئی چھت نہیں ہوتی..

ورنہ دمشق کے قدیم ترین کلیسا کے نصف حصے کو مسجد قرار دے کر وہاں نماز نہ
پڑھی جاسکتی..

بھلے گنبد پر کلس سنہری ہوں یا چھت کی ڈھلوان پر اژدھوں اور شیروں کے مجسّمے
پہرہ دے رہے ہوں..یہ صرف باطن ہوتا ہے جو اہم ہوتا ہے..

مسجد نیوجیہ کا باطن..اُس کا اندرون..ایک طلسم کدہ تھا..حیرت کے خواب تھے..
لکڑی کے ستون منقش، سنہری گل بوٹوں سے مزیّن..محرابیں دمکتی ہوئی اور اُن پر جو نقش تھے
وہ چینی کاریگر ہی تخلیق کرسکتے تھے..اور پھر وہ سنہری خطاطی جو اُس کے در و دیوار پر ایک
مقدس امانت کی طرح لپٹتی..اُنہیں آغوش میں لے کر ابدیت کے جھولے جھلاتی چلی جاتی
تھی..اور اُسے دیکھ کر آپ بھی جھولتے تھے وجد میں جھومتے تھے اُس میں ایسا تحرک اور نکھار
تھا..خطاطی میں بھی وہی سرخی اور جدت جمال تھی جو چین کی رگوں میں دوڑتی ہے..رنگوں
کے امتزاج میں بھی سرخ رنگ غالب تھا..یعنی شاہ حسین نے جو کہا تھا تو مسجد نیوجیہ کے
بارے میں کہا تھا کہ..

اساں اندر باہر لال ہے..ساہنوں مرشد نال پیار ہے

مسجد نیوجیہ..کے گیت کسی نے نہیں گائے..

نہ اسے کوئی اقبالؒ ملا جو مسجد قرطبہ ایسی نظم اس کے لیے تخلیق کرجاتا..نہ اسے
مسجد اُمیہ ایسی تاریخی فضیلت حاصل ہوئی..نہ یہ سلمان عالی شان کے دبدبے اور سلطنت کی
وسعت کے سہارے نیلی مسجد کے ہم پلّہ ہوسکی..نہ یہ بادشاہی مسجد کے رقبے کی گرد کو پہنچ
سکی..اور نہ اسے اصفہان نصف جہان میں ظاہر ہونے کا موقع ملا..لیکن..کسی ایک مسجد کو
بے شک وہ جہلم کے نواح میں ایک کمرے پر مشتمل کچی اینٹوں اور گارے سے بنی ہو یا
فیصل مسجد ہو جو صرف مرعوب کرتی ہے عبادت کے لیے بے خود نہیں کرتی..کسی دوسری مسجد پر
فوقیت حاصل نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود مسجد نیوجیہ یوں ممتاز ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کے
دھارے سے الگ ایک ایسی سرزمین پر ہے جس کے اردگرد بدھ کی بادشاہی ہے، کنفیوشس
کا راج ہے..اور پھر بھی اس کا تشخص جدا ہے..مثال الگ ہے اور سلطنت اپنی ہے..

مسجد کے وضو خانے میں دھات کے پائپوں کا ایک جال بچھا تھا اور ان سے
منسلک درجنوں آہنی کیتلیاں تھیں جن میں موسم سرما کے دوران گرم پانی اُبلتا تھا..ہم نے وضو
کیا اور اس سرخ سنہری طلسم گاہ میں نوافل ادا کیے..

محراب کے سامنے جو دیوار تھی اُس پر سنہری حروف کی جو خطاطی تھی اُس کی
مثال دنیائے اسلام میں کم ہی ملے گی..آپ ان حروف کو اگر تادیر دیکھیں تو وہ آپ کے
دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہوجانے کی صلاحیت رکھتے ہیں..بے شک حرفِ دُعا یاد نہ رہیں
لیکن حرف یاد رہتے ہیں۔بے شک حرمین شریفین اور مسجد نبویؐ میں دنیا بھر کے ماہر خطاط
اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں لیکن مسجد نیوجیہ کی خطاطی بھی ایسی ہے کہ اس کی کوئی مثال
نہیں..اسلام کی آفاقی رُوح کی نمائندگی اگر مقصود ہو تو اُن مقامات مقدسہ میں بھی اس
خطاطی کا مقام بنتا ہے..اگر کوئی غور کرے تو..

ہم جب نفل ادا کر رہے تھے تو تنہا نہ تھے..

چینی بابے اور نوجوان بھی سر جھکائے ہاتھ باندھے بلند آواز میں نوافل ادا
کر رہے تھے..اُن میں جو بابے تھے سر پر سفید ٹوپیاں اوڑھے..سفید تکونی چند بالوں والی

داڑھیاں لہراتے ہوئے سجدے میں جاتے تھے.. اور نوجوان ٹی شرٹوں اور جینوں میں عبادت میں مگن تھے..

مسجد نیوجیہ سے ملحقہ مختصر باغ میں.. بے ترتیب لامبی گھاس میں بوسیدہ اور زنگ آلود کچھ تسلے.. کچھ دیگیں تھیں.. اُن میں شگاف ہو چکے تھے.. جانے وہ کن زمانوں کی تھیں اور تب اُن کا کیا مصرف تھا.. اُن کے گرد جو گھاس بے ترتیب تھی اُنہیں ڈھکنے کو تھی..

یہیں پر.. اسی مختصر اور گھاس پھونس سے اٹے باغ میں دو قبریں تھیں.. ان کے پس منظر میں جو دیوار ہے وہ سرسبز بیلوں سے ڈھکی ہوئی مکمل طور پر پوشیدہ تھی.. اور ان قبروں کے کتبے عربی زبان میں تھے.. میں صرف ایک کتبے کی پیشانی پر درج ''کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْت'' پڑھ سکا.. یہ اُن بزرگوں کے مرقد تھے جو یوآن خاندان کے زمانے میں عرب کی سرزمین سے دعوت اسلام لے کر چین پہنچے تھے..

مسجد نیوجیہ 996 ہجری میں تعمیر ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ ایک عرب سکالر نصروتان نے اس کی بنیاد رکھی تھی اور اسے اُن زمانوں میں صرف ''لبائسی'' یعنی.. مسجد.. کے نام سے پکارا جاتا تھا.. یوآن۔ منگ اور فنگ خاندانوں کے عہد میں اس مسجد کی توسیع ہوتی رہی..

جیسے مسجد قرطبہ کا موجودہ وجود اس کی مسلسل دیکھ بھال اور آرائش اُن عیسائی فراخ دلوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے اسے اپنا ایک اہم ثقافتی ورثہ جانا اور اس کی مرمت اور بہتری کے لیے کوشاں رہے.. اسی طور مسجد نیوجیہ بھی ایک عرصے تک قائم رہ کر ہم تک پہنچی ہے تو اس میں چینی سیکولرازم جسے ہم فوری طور پر لامذہبی سے منسلک کر دیتے ہیں.. کا کمال ہے.. اُس کا عطیہ ہے.. میں شاید یہ عرض کر چکا ہوں کہ دنیا میں شاید اہل چین ہی بس ایسے ہیں جنہوں نے آج تک مذہب کی بنیاد پر کوئی جنگ نہیں لڑی.. یہ جنگیں بے شک شہنشاہیت اور کمیونزم کے حوالے سے ہوتی رہیں لیکن کہیں بھی بُدھ ازم۔ تاؤازم یا کنفیوشس ازم ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوتے اور ایک دوسرے کو شہید کے درجے پر فائز کرتے نظر نہیں آتے.. چنانچہ انہوں نے ''کفار'' کی عبادت گاہوں کو کبھی مسمار نہیں کیا اور

نہ انہیں کبھی جلاوطن کیا ہے.. کیا ہم یہ تصور میں لا سکتے ہیں کہ ایک ہزار برس بعد بھی ہمارے درمیان ہندو مندر، جین مندر اور گوردوارے موجود رہیں.. ایک ہزار برس تو کچھ زیادہ ہیں ہمارے لیے تو پچاس برس ہی کافی ہیں اپنے عقیدے سے الگ ہر عبادت گاہ کو ڈھانے اور ثواب کمانے کے لیے.. پچاس برس ہی کافی ہیں..

اس لیے مسجد نیوجیہ کا وجود چینی نظریات کی وسعت قلبی کا ایک ثبوت ہے..

عیدین کے موقع پر بیجنگ کے مسلمان یہاں ہجوم کرتے ہیں.. جشن کرتے ہیں.. بکروں کی قربانی اسی مسجد کے صحن میں دیتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں.. اور حیرت انگیز طور پر اُنہیں یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ مسجد کی چھتوں کے کنگروں پر اژدھوں اور شیروں کے مجسمے آویزاں ہیں..

مسجد کے برابر میں ایک لائبریری ہے.. اور ہم زیارت کے بعد اس کے اندر گئے..

اس لائبریری میں چند بیش قیمت نوادرات بھی نمائش پر ہیں... چینی طرز کی خطاطی کے نایاب نسخے۔ شہنشاہ کانگسی کا ایک فرمان۔ منگ خاندان کے مرتبان اور ظروف۔ فنگ خاندان کے عہد کے پیتل کے کٹورے جن پر خطاطی کندہ ہے۔ اور ایک ایسا قرآن پاک جو تین سو برس پیشتر چین میں لکھا گیا تھا..

مسجد نیوجیہ سے متاثر ہونے میں میرے پیدائشی عقیدے کا عمل دخل کم ہے.. اگر آپ صرف عقیدے کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر ''دیکھیں'' تو آپ کو وہی کچھ نظر آئے گا جو اُس عقیدے کی آمریت آپ پر مسلط کرتی ہے.. لیکن میں تو روم اور وینس کے کلیساؤں.. ننکانہ صاحب کے گوردواروں اور نیپال کے بدھ اور ہندو مندروں سے بھی متاثر ہوا تھا.. اُن میں بھی یہی کیفیت تھی صرف یہ کہ یہاں مسجد نیوجیہ میں یہ کیفیت دوچند ہوتی تھی جو یہ کہتی تھی کہ بس ایں جا است.. اور یہاں پر بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے.. بے شک ہر ایک کا جاناں الگ.. لیکن تصور صرف ایک!

اور کس کے جاناں کو کس جاناں پر فوقیت حاصل ہے یہ کون جانے.. میں کی جاناں.. لیکن تصور ایک..

مسجد کی سوونیئر شاپ سے تسبیحیں اور طغرے خرید کر جب ہم باہر بازار میں آئے تو لیل پوری نے پھر کلو بھر چکن بھرے پکوڑے خرید لیے..

''یار و حلال اور مزیدار خوراک جتنی کھانی ہے کھا لو کیونکہ خاور نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ دوپہر کے کھانے میں ہم بطخیں کھا رہے ہیں''

''بطخیں؟''

''ہاں.. خاور کہتا ہے کہ بیجنگ کی وجہ شہرت اگر قدیم آثار کے باعث ہے تو دیوارِ چین اور شہرِ ممنوعہ کے باعث ہے اور اگر خوراک کی وجہ سے ہے تو ''پیکنگ ڈک'' کی وجہ سے ہے''

سفید ریش شاعر فوراً باغی ہو گیا ''میں اپنے ساتھ یہ اسلامی پکوڑے لے جاؤں گا لیکن بطخیں تو ہرگز نہیں کھاؤں گا''

دہقانی بھی فکر مند ہو گیا ''ویسے تو ہمارے شیخوپورے کے قریب جو گاؤں ہیں وہاں کے جوہڑوں میں بے شمار بطخیں کلکاریاں مارتی پھرتی ہیں لیکن ہم نے تو کبھی نہیں سوچا کہ اُنہیں حلال کر کے شیخوپورہ ڈک کے نام سے معزز غیر ملکی مہمانوں کو کھلا دیا جائے''

''پیکنگ ڈک..'' لیڈر نہایت سپیریئر لہجے میں مخاطب ہوا ''کسی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے.. اور یہ بطخ نہیں ڈک ہوتی ہے.. کھاؤ گے تو یاد کرو گے''

''آپ نے کھائی ہیں؟''

''نہیں...''

''پیکنگ ڈک..... اور ہم بطخیں کھا کر بطخائے گئے''

اُس ریستوران کا نام ''بیجنگ ڈک ریستوران'' نہیں تھا' کچھ اور تھا.. اور وہ کچھ اور مجھے یاد نہیں رہا.. لیکن جہاں سے بیجنگ کی بہترین ڈک دستیاب ہوتی ہے' اُسے ''بیجنگ ڈک ریستوران'' کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں..

اس ریستوران کا ماحول نہایت فرانسیسی نوعیت کی مہک لیے ہوئے تھا.. ایک ایسی مہنگی مہک جو آپ کو فوراً خبردار کر دیتی ہے کہ بھائی صاحب اس ریستوران میں کھانا کھاؤ گے تو بس یہی کھانا کھاؤ گے' بعد میں فاقوں مرو گے۔ اب بھی وقت ہے نکل جاؤ اور کہیں جا کر دال روٹی کھا لو.. لیکن ایک سرکاری وفد کی قید اور شیڈول کے پھندے کے باوجود اس حیثیت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست سرکار کے ذمے ہوتا ہے.. اگر ایسا نہ ہوتا اور ہمیں اپنے پلّے سے یوآن کھولنے پڑتے تو ہم ایک رات چین میں قیام کر کے ایک میوزیم دیکھ کر اور ایک کھانا کھا کر خلاص ہو جاتے.. چنانچہ ہم اس مہنگی فرانسیسی مہک اور آرائش والے رومانوی اور نہایت تہذیب یافتہ سرگوشیوں والے ماحول میں داخل ہو کر بالکل ہراساں نہ ہوئے کہ یہاں بھی یوآن سرکار کے پلّے سے کھلنے تھے..

میں یہاں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ لیو اور خاور ایک لمحے کے لیے ہماری وی آئی پی حیثیت بھول جائیں اور ہم اس ریستوران کے پُرہجوم مگر زندگی سے دھڑکتے ہال میں بیٹھ کر.. کم از کم ایک بار تو عوام الناس میں بیٹھ کر کھانا کھائیں.. چلیے حیثیت میں تھوڑی

سی کمی کر کے ہال کے اُوپر جو گیلریاں تھیں جہاں ڈائننگ ٹیبلز آراستہ تھیں اور بیلیں لٹکتی تھیں‘ پودوں اور پھولوں کی بہار تھی وہیں بٹھا دیں..لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت...ہمیں دوسری منزل پر لے جایا گیا اور حسبِ معمول ایک خصوصی ڈائننگ رُوم میں دھکیل دیا گیا جس کی پرائیویسی میں ڈائن کرنا صرف متمول ترین افراد ہی افورڈ کر سکتے تھے..

اور ہم اس مسلسل پرائیویسی اور وی آئی پی سٹیٹس سے تنگ آ چکے تھے..

چینی ہماری عزت کرنا چاہتے تھے اور ہم عزت کروانا نہیں چاہتے تھے..

اس ڈائننگ رُوم کا ڈیکور بھی فرانسیسی تھا.. دیواروں پر مغربی مصوروں کی تصویروں کے پرنٹ اور سکیچ۔ بجھی بجھی روشنیاں۔ بہترین کراکری اور دمکتی کٹلری۔ مہکتے گلدستے...میز ایک صدارتی ضیافت کی اُمید سے تھی..

کمرے کی ڈیکور میں گلابی رنگ نمایاں تھا...اور ہم نے نہایت باریک بینی سے نوٹ کیا کہ ہماری آؤ بھگت کے لیے تعینات خواتین بھی سفید ملبوسات پر گلابی رنگ کے اوورآل زیب تن کیے ہوئے ہیں اور یہ یقیناً ہماری چینی ڈائننگ تاریخ میں حسین ترین ویٹریس تھیں۔ اُن کا میک اپ اور بالوں کی آرائش دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس ریستوران میں کھانے کے علاوہ اُنہیں دیکھنے کے کیا چارجز ہوں گے..

ہماری آمد پر اس مختصر ڈائننگ رُوم کی کھڑکیاں سختی سے بند کر دی گئی تھیں اور اُن کے آگے گلابی پردے کھینچ دیے گئے تھے تاکہ ہماری پرائیویسی میں خلل نہ پڑے..یہ تمام تر بندوبست اُس صورت میں تو نہایت مناسب تھے جب آپ کسی سوہنی یا ہیر کے ہمراہ ڈیٹ پر یہاں آئیں اور طعام کریں لیکن حسرت ناک‘ سفید ریش‘ دہقانی‘ لیل پوری وغیرہ اگر آپ کے پہلو میں ہوں‘ آپ کی ڈیٹ ہوں تو اُس صورت میں یہ بندوبست نہایت بیہودہ لگتے تھے..

ہمیں حسبِ چاہت مشروبات سے نوازا گیا اور پھر ہم میز پر سجی سلادیں چکھتے بطخوں کا انتظار کرنے لگے..

شاید چینی مسافت کے اختتام کے قریب پہنچنے کی کرامت تھی کہ سبھی لوگ خوشگوار

اور چلبلے موڈ میں تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اس سفر کے دوران ظہور پذیر ہونے والے وقوعہ جات کے بارے میں چہلیں کر رہے تھے..

لیڈر کی چینی زبان پر مکمل گرفت کے حوالے دیے گئے تو بھی لیڈر تحمل سے مسکراتا رہا..

دہقان کو جب یاد دلایا گیا کہ کیسے وہ شی آن میں ہوٹل کے لاکر کو مائیکرو ویو اَوَن سمجھ رہا تھا اور ہر روز ایک ہزار روپے کا کارڈ اپنی ملازمہ سے گپ لگانے میں صرف کر دیتا تھا تو اُس نے بالکل مائنڈ نہ کیا بلکہ قدرے لطف اندوز ہوا۔

شنگھائی فلائٹ کے دوران جب عمر رسیدہ شاعر نے گرج کر کہا تھا کہ آئی ایم اے جرنلسٹ اور اُسے جنرل کے عہدے پر متمکن کر دیا گیا تو وہ بھی تادیر مسکراتا رہا..

اُس کے بعد جب دہقان نے سفید ریش کو ایک اعصاب پر سوار ہو جانے والی مددگار پھپھی کا خطاب دیا تھا‘ وہ بات چلی اور اُس کا رُک سیک گم ہو جانے پر مسرت کا جو اظہار ہوا تھا اُس کا تذکرہ آیا تو سفید ریش سر ہلاتا خوش ہوتا رہا...دراصل سفید ریش ہم سب میں سے کھلے دل کا دیالو شخص تھا..وہ اپنے پلّے سے فیصل آباد میں تیار کردہ درجنوں ٹی شرٹس سکارف اور تحفے لایا تھا اور ہر راہ چلنے والے دوسرے چینی کی خدمت میں پیش کر کے کہتا تھا‘ دوست ملک پاکستان کی جانب سے آپ کے لیے..اور اُس دوسرے چینی کو ششدر کر دیتا تھا۔ سفر کے آغاز میں اُس نے ہم سب کو بھی ان ٹی شرٹس سے نوازا۔ شی آن کی مسجد میں چندے کا ڈبہ دیکھ کر اُس نے اپنے بٹوے کے سب کے سب ڈالر اُس میں اُلٹ دیے تھے..اُس کی نسبت ہم سب کے سب نہایت کنجوس مکھی چوس قسم کے حضرات تھے اور شاید اُس کی دریا دلی سے حسد کرتے تھے..

محفل میں گیسو دراز کی اُس احتیاط کا بھی ذکر ہوا جس کے نتیجے میں وہ اپنے ڈالروں کو چین کی ہوا لگوائے بغیر پاکستان واپس لے جا رہا تھا..اور گیسو دراز مسکراتا ہوا نہایت متانت سے سر ہلاتا تھا اور اپنے یکطرفہ چینی معاشقوں کو یاد کرتا تھا..

میرے چڑچڑے پن اور بدمزاجی کو بھی جی بھر کے مطعون کیا گیا۔ میرے نازیبا لباس اور قبیح عادات کو زیرِ بحث لایا گیا۔ سنہری وانگ لی کے ساتھ میری فلرٹیشن کے حوالے

دیے گئے اور میں بھی دل پر پتھر رکھ کر مسکراتا رہا اور قبول کرتا رہا..

ہماری میز پر آہستہ آہستہ کھانوں کا ہجوم ہونے لگا.. یہاں ایسا نہیں تھا کہ آپ کو صرف ایک بطخ پر ٹرخا دیا جائے..وہ تو خصوصی ڈش تھی..لیکن اُس کے سوا بھی اس ریستوران میں بہت کچھ رکھا تھا جو میز کی زینت کیا جا رہا تھا..

اس دوران انسانی چہروں کے بارے میں جو ایک جانور نظریہ ہے وہ رنگ دکھانے لگا..نظریہ یہ ہے کہ اگر آپ کسی بھی انسان کو تادیر غور سے تکتے رہیں تو آپ کو اُس کے چہرے میں کسی نہ کسی جانور کی شباہت کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں گی.. بے شک آپ تجربہ کر لیجیے.. اللہ تعالیٰ نے تقریباً ہر انسان کو بناتے ہوئے کسی نہ کسی جانور کی شبیہ سے بچ کر بنایا ہے جو غور سے دیکھنے پر جھلک دکھا جاتی ہے..

میں چونکہ بہت دیر سے اور بہت غور سے سب کو دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے کیا دکھائی دیا..

لیڈرا ایک شریف النفس شتر مرغ سا دکھائی دیا جو عینک پہنے نہایت مسکین ہو رہا تھا..

گیسو دراز ایک ہینڈسم لومڑ تھا جو بھولی بھالی لومڑیوں پر ڈورے ڈالنے کا ماہر تھا..

دہقان کا چہرہ ایک دانا اُلو کی مشابہت لیے ہوئے تھا جو مہاتما بدھ کی مسکراہٹ لیے شانت بیٹھا رہتا تھا..

لیل پوری ایک ایسا فربہ لُدھڑ تھا جو سمندر کنارے لیٹا تمام دن میں صرف ایک بار کروٹ بدلتا ہے..

جنرل ایک ناراض سا بن مانس تھا جیسے اُس کی بن مانسنی سے اختلاط کرنے سے زبردستی روک دیا گیا ہو..

سفید ریش ایک عمر رسیدہ عقاب تھا جو گدھ ہونے سے بال بال بچ گیا تھا..

البتہ گیانی ایک تیکھی مونچھ اور تیکھی نظر رکھنے والا شاطر پرندہ تھا جو ہمہ وقت شکار پر نظر رکھتا تھا..

اور حسرت ناک ان سب میں یوں یکتا تھا کہ اُس کی شباہت کسی جانور پر نہ جاتی تھی..بس اُسی پر جاتی تھی..

اور میں خود.. میں نے متعدد بار اس نظریۂ جانوراں کے تحت اپنے آپ پر جبر کر کے تادیر اور نہایت غور سے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تھا..اور جو کچھ نظر آتا تھا نہایت ہی ناقابلِ دید نظر آتا تھا..میرے مسوڑھوں سے عاری لمبے نوکیلے دانت اور اُبلتی ہوئی سرخ آنکھیں ایک ایسے خون آشام ڈریکولا کی طرح تھیں جو ایک بوسیدہ اور بدنما گدھ کی شکل کا تھا اور پھر بھی اپنے آپ کو ہینڈسم سمجھتا تھا..

بالآخر بطخیں آ گئیں..

بیجنگ ڈکس آ گئیں..

اُن کی شناخت میں آسانی کے لیے اُن کے سر اور چونچیں جوں کی توں تھیں اور دھڑ روسٹ شدہ تھا..

یہی مشہور زمانہ بیجنگ ڈک تھی..

ہمارے ہاں تو گوشت کھانے کا ایک ہی طریقہ ہے..کہ اسے کھا جاؤ..لیکن دیگر غیر مہذب اقوام میں اسے قدرے اہتمام اور سلیقے سے کھایا جاتا ہے.. چنانچہ ہم نے گلابی ملبوس والی ایک ویٹرس کو اسی بہانے کچھ دیر کے لیے روک لیا کہ وہ ذرا عملی مظاہرہ کر دے کہ اس گراں گوشت کو مقامی آداب کے مطابق کیسے شکم کے سپرد کیا جاتا ہے.. یہ مظاہرہ نہایت غور سے مشاہدہ کرنے کے باوجود ذرا پیچیدہ سا لگا..یعنی پہلے تو آپ ایک ڈش میں سجی ایک ایک پُوڑی نما شے کو اُٹھا کر اُسے اپنی بائیں ہتھیلی پر پھیلاتے ہیں..پھر اُس پر بطخ کے گوشت کا ایک قتلہ جماتے ہیں..پھر اُس قتلے کو سبز پیاز کے ڈنٹھلوں سے سنوارتے ہیں..اس کے بعد پتہ نہیں کیا کیا اُس پر رکھ کر بالآخر ایک خاص سیاہی مائل ساس اُنڈیلتے ہیں..اس تکنیکی پراسس سے گزرنے کے بعد اُس پوڑی کو ایک خاص طریقے سے یوں لپیٹا جاتا ہے کہ اس میں پیک شدہ اشیاء کا ایک سموسہ سا بن جاتا ہے اور پھر آپ اسے نوش کر جاتے ہیں.. یہ سموسہ ایک چکن رول کی مانند گول ہوتا ہے اور ایک پیچیدہ سینڈوچ کی طرح اُس پر دانت جما کر یوں کھایا جاتا ہے کہ سیاہ ساس آپ کی باچھوں کے راستے میز پوش پر نہ ٹپکنے لگے..

ویسے اس کا ذائقہ اتنا منفرد تھا کہ اس کی تیاری میں جو محنت کی جاتی ہے وہ

اکارت نہیں جاتی. سبز پیاز اور سیاہ ساس اور گوشت کی خستگی مزہ دے جاتی ہے..

مجھے ذاتی طور پر بیجنگ ڈک کا ذائقہ روسٹ مرغابی کے نزدیک لگا جسے چینی طور طریقوں سے قدرے اہتمام سے کھایا جاتا ہے..

مجھے اس کا ذائقہ یوں بھی آیا کہ میں نے ویٹریس کی نظر بچا کر اتنا طویل اہتمام کیے بغیر تقریباً آدھی بطخ براہِ راست دیسی سٹائل میں کھالی تھی..

اور آفرین ہے دہقان اور سفید ریش کے ایمان کی سلامتی پر کہ صرف اُن دونوں نے یہاں بھی اجتناب کیا اور خاور سے بار بار پوچھنے پر کہ یہ بطخ حلال ہے اور اُس کے بار بار یقین دہانی کروانے کے باوجود کہ یہ مسلم فوڈ ہے کیونکہ یہ سؤر نہیں بطخ ہے..انہوں نے پھر بھی ہاتھ روکے رکھے..اور اپنے آپ کو مصفّا اور پاکیزہ رکھا..جب کہ بقیہ اراکین جن میں لیڈر اور دیگر تابعین بھی شامل تھے' خاور کا اعتبار کیا اور متعدد بطخیں کھا گئے...

شی آن کے بعد چین میں یہ ہماری بہترین خوراک تھی..

بطخ خوری کے بعد وفد کے ہر رُکن نے گلابی خواتین کے گرد بانہیں ڈال کر..ذرا عنقریب ہو کر تصویریں اُتروائیں تاکہ سند رہے..

ہم سب درجنوں بطخیں کھانے کے بعد جب اس ریستوران سے باہر بیجنگ کے کوچہ و بازار میں آئے تو ہمیں ہر جانب پانی ہی پانی نظر آیا..شاہراہوں پر جو ٹریفک رواں تھی..بسیں' ٹیکسیاں' سائیکل سب کے سب پانی میں تیرتے نظر آئے..سوائے پانی کے ہمیں اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا اور ہم بھی اس میں تیرنا چاہتے تھے کہ ہم اس قدر بطخائے گئے تھے..

''پیکنگ آپرا......زندہ پران اور نین پران''

اُس دوپہر بیجنگ بطخ میں تیرتے جب ہم شام میں گئے تو بیجنگ کے ایک مشہورِ زمانہ آپرا میں گئے..

خود تو ظاہر ہے نہیں گئے بلکہ لے جائے گئے..

یہاں شی آن میں جو آپرا دیکھا تھا اُس کا ایکشن ری پلے تھا..

یعنی آپرا ملاحظہ کرنے سے پیشتر ایک اور شاہانہ طعام..اور یہ بھی عوام الناس کی بھیڑ سے پوشیدہ ایک وی آئی پی ڈائننگ رُوم میں..اس کمرے کے اردگرد جتنے بھی دیگر کمرے تھے اور راہداریاں تھیں' وہاں لوگ ہنستے کھیلتے کھاتے اور پیتے ہی پیتے تھے..زندگی کی اس قیمتی رات میں وہ فروغِ مے سے چہرے چراغاں کیے خوش گفتار ہوتے تھے اور ہم ایک الگ کمرے میں جو ساؤنڈ پروف بھی تھا' اپنی شاہانہ حیثیت سے لطف اندوز ہوتے تھے..البتہ اس شاہی طعام کا ایک روشن پہلو وہ پران تھے جو ہمارے دیکھتے دیکھتے گلابی ہو گئے تھے..

ویٹرس نے طعام کے دوران شیشے کا ایک گول ڈونگا میز پر رکھ دیا جس میں بے شمار سیاہ اور سرمئی رنگ کے پران کلبلاتے تھے اور ڈونگے کی دیواروں سے چمٹ کر رینگتے ہوئے باہر آ جانا چاہتے تھے اور ڈھکن سے ٹکرا کر گر جاتے تھے..

ان زندہ پرانوں کو دیکھ کر ہر ایک کی سٹی گم ہوگئی..بلکہ نین پران گم ہو گئے..

چلیے سانپ اور گدھے کے قتلے یا ریشم کے کیڑوں کی حد تک تو ہم کو آپریٹ کر سکتے تھے کہ وہ پکی ہوئی حالت میں تھے لیکن چینی بھائیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زندہ پران کو نگل جانا تو ہمارے بس کی بات نہ تھی.. ہم نے اُن کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی کہ شاید اس نظراندازی سے وہ غائب ہو جائیں لیکن وہ بدستور کلبلاتے اپنی لمبی ٹانگوں اور مونچھوں کی نمائش کرتے رہے یہاں تک کہ جو خوراک ہم نوش کر رہے تھے وہ بھی حلق میں اُترنے کی بجائے زندہ ہو کر منہ میں پھڑ پھڑاتی محسوس ہونے لگی..

اس دوران ویٹرس نے ایک ٹرالی کو دھکیل کر ہمارے قریب کیا.. ٹرالی پر ایک اُسی سائز کے شیشے کے گول ڈونگے میں دس بارہ سیاہ پتھر سجے تھے.. ویٹرس نے میز پر سے زندہ پرانوں کا ڈونگا اُٹھایا.. مسکرا کر پہلے ہم سے اُن کی اعلیٰ نسل کی داد چاہی اور پھر اُنہیں نہایت احتیاط سے پتھروں پر اُلٹ دیا.. تب ایک شُوں شُوں کی آواز کے ساتھ پتھروں میں سے بھاپ سی اُٹھی کہ وہ پگھلے ہوئے لوہے کی مانند گرم تھے اور جونہی بھاپ تحلیل ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ تمام پران گلابی ہو چکے ہیں اور پک چکے ہیں.. ویٹرس نے ایک بار پھر اُنہیں اُلٹ کر اوریجنل ڈونگے میں منتقل کر دیا اور اُسے ہمارے سامنے رکھ دیا..

ہم پہلے تو جھجکتے رہے لیکن صرف ایک پران چکھنے کے بعد اُن کے ذائقے اور خستگی کے قائل ہو گئے اور اُنہیں مسلسل کھانے پر مائل ہو گئے.. اتنے تازہ جھینگے ہم نے پہلے کہاں کھائے ہوں گے کہ ابھی تیس سیکنڈ پیشتر وہ اس جہان میں تھے اور ابھی ہمارے منہ میں گھلتے تھے..

کھانے سے فارغ ہو کر نیچے آپرا ہال میں آئے تو وہاں حسب معمول میزیں سجی تھیں جن کے گرد خوش گپیوں میں مشغول چینی اور غیر ملکی پردہ اُٹھنے کے منتظر تھے..

یہاں پر لیڈر نے حیرت انگیز طور پر شراب سے بھرا ہوا ایک گلاس فضا میں بلند کر کے ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا ''چیئرز.'' اس پر ہم سب ششدر رہ گئے لیکن ہماری ششدری عارضی نوعیت کی ثابت ہوئی جب لیڈر نے ایک کائیاں مسکراہٹ لبوں پر پھیلا کر اعلان کیا کہ حضرات آپرا ہال میں موجود ہر شخص کی خدمت میں ایک جام آن دے

ہاؤس ہے یعنی مفت ہے اور میں تو پیتا نہیں ہوں تو جو بھی بڑھ کے جام اُٹھا لے' یہ اُسی کا ہے.. چونکہ مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے اس لیے متعدد قاضی نمودار ہو گئے لیکن جام ایک تھا اور قاضی بہت.. تو صرف ایک ہی قاضی لیڈر کی اس مفت کی دریا دلی سے مستفید ہوا.. بقیہ فوراً تائب ہو گئے..

پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ..

تو پردہ اُٹھا.. ہم سٹیج پر نظریں جمائے کرداروں کے نمودار ہونے کے منتظر تھے لیکن سٹیج خالی تھا..

پھر ایک سرگوشیوں بھرا شور سا بلند ہوا اور مڑ کر دیکھتے ہیں کہ زرد رنگ کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہنے.. زرق برق عباؤں میں حرکت کرتی چینی دوشیزائیں ہال میں داخل ہو رہی ہیں اور پھر ہماری میزوں کی قربت میں پیرہن لہراتی سٹیج کی جانب رواں ہیں..

آپرا کے پہلے کھیل میں قدیم چینی لوک حکایتوں کی عکاسی کی گئی تھی.. چونکہ چینی زبان میں کی گئی تھی اس لیے میں اُس کا متن اور تفصیل آپ تک نہیں پہنچا سکتا..

ایک اور ایکٹ میں سٹیج پر جو اداکار پرفارم کر رہے تھے' وہ مختلف اقسام کے نقابوں میں روپوش تھے..

یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ نقاب کے عقب میں کون ہے.. کس کا چہرہ ہے..

تیس برس پیشتر میں نے اپنے ناولٹ ''فاختہ'' میں ماسکو کے سرخ چوک میں برپا نقاب پوشوں کے ایک جشن کو بیان کیا تھا جہاں بن مانس' اونٹ' خرگوش' عقاب اور ریچھ گھومتے تھے جو محض علامتیں تھیں.. اور فاختہ کے نقاب کے پیچھے دو آنکھیں تھیں جو اندھی تھیں..

یہاں بھی.. بیجنگ میں اصل کردار نقابوں میں پوشیدہ تھے..

اگرچہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ سب سٹیج پر اپنے اصل چہروں کے ساتھ پرفارم کر رہے تھے اور صرف میں تھا جو کل تماشائیوں میں تنہا ایک نقابِ شرمندگی میں اپنے آپ کو چھپائے ہوئے تھا.. اور اس نقاب کے پیچھے ایک چہرہ تھا.. مذہبی تعصب... ماضی کی تلواروں میں گم..

اپنی مخدوش عظمت میں گم..اپنی حماقتوں اور ناکامیوں کو اغیار کی سازشوں کے سپرد کرتا..اپنے آپ کو بری الذمہ ٹھہراتا..دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتا..اپنی جہالت پر فخر کرتا..اور نہایت ڈھٹائی سے اُنہی دوسروں کے سامنے کشکول پھیلاتا...اس نقاب میں پوشیدہ وہ چہرہ تھا..

وہ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت سے ہمکنار کرتا ہے تو اُسی نے اُس شب بیجنگ آپرا کی پرفارمنس کے دوران میری عزت رکھ لی اور کسی کو کچھ پتہ نہ چلا کہ میرے نقاب کے پیچھے کیا ہے..

’’عظیم ماؤ کے حنوط شدہ چہرے کے سامنے‘‘

یہ نہیں کہ ماؤ کی توقیر کم ہوگئی ہے..

صرف یہ ہے کہ اب اُس کی پوجا نہیں ہوتی..

مجھے بیجنگ‘ شی آن‘ شنگھائی یا ہانگ چُو کے کسی چوک کسی کونے کھدرے میں ماؤ کا ایک بھی مجسمہ نظر نہیں آیا.. پہلے ان جگہوں پر ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہاتھ سیدھا کیے ماؤ...ماؤ کیپ میں ایستادہ نظر آتا تھا..

اُس کی تصویر بھی خال خال ہی دکھائی دیتی ہے..صرف شہرِ ممنوعہ کے ماتھے پر وہ ابھی تک قائم ہے..

ماؤ کی سرخ کتاب ایک ایسے نایاب پرندے کی طرح ہے جس کی نسل کب کی معدوم ہو چکی ہے..یہ سرخ پرندہ ’’ایک ملک دو نظام‘‘ کی اقتصادی جھیل میں کب کا ڈوب چکا ہے..

اس سرخ کتاب..معدوم ہو چکے پرندے کے حوالے اب تاریخ کی کتابوں میں ہی دستیاب ہو سکتے ہیں..

وفد کے ایک رُکن نے سرتوڑ کوشش کی کہ ماؤ کی سرخ کتاب جو ایک زمانے میں لاہور میں ڈھیروں کے حساب سے فروخت ہوتی تھی.. ماؤ کے بیجنگ میں صرف ایک کاپی دستیاب ہو جائے جو نہ ہوئی..

ماؤ اگر اب تک موجود ہے تو ٹورسٹوں کی دلچسپی کے لیے سوویئنر شاپس پر فروخت ہوتی ماؤ کیپ میں یا اُن سگریٹ لائٹرز پر جو سیاح بڑے شوق سے خریدتے ہیں..

ہاں..چین میں اگر آج بھی ماؤ پوری قوت سے زندہ ہے تو ایک شاعر کی حیثیت سے..

اہل چین تو اپنے جابر ترین اُن شہنشاہوں کے لیے بھی دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں جو اعلیٰ درجے کے شاعر تھے..مثلاً ''لوگ اپنی محبت کو چھپاتے ہیں'' جیسی نظم بھی پندرہ سو برس پیشتر لیانگ خاندان کے شہنشاہ ووتی نے کہی تھی۔''دریائے بہار پر پھول اور چاندنی'' یانگ تی شہنشاہ نے لکھی تھی..ایک اور ووتی نے جو ہان خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا اکیس سو برس پہلے اپنی بیوی ''لی فوجین'' کی موت پر ایک مرثیہ لکھا تھا..

اُس کے ریشمی آنچل کی آواز رُک چکی ہے
مرمریں راستے پر گرد بڑھ رہی ہے
اُس کا خالی کمرہ سرد اور ساکت ہے
دروازے کے ساتھ گرے ہوئے پتوں کا ڈھیر لگ چکا ہے..
اُس پیاری خاتون کی حسرت کرتے ہوئے
میں کس طرح اپنے دُکھتے دل کو آرام دے سکتا ہوں..

اور یاد رہے کہ چینی یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر ایک شہنشاہ ہے یا گداگر' وہ صرف شاعری دیکھتے ہیں..چنانچہ ان شہنشاہوں کے پہلو بہ پہلو ماؤزے تنگ بھی ایک شاعر کی حیثیت سے قائم ہے..

بیجنگ کے سپر سٹورز میں اُس کی نظموں کی خطاطیاں اب بھی بیسٹ سیلرز ہیں..

ولادیمیر لینن سے شاید یہی خطا ہوئی تھی کہ وہ صرف ایک عظیم انقلابی قائد تھا' شاعر نہ تھا..اس لیے معدوم کر دیا گیا..ویسے وہ شاعر ہوتا تو بھی اُس کی قدر نہ ہوتی کہ رُوسیوں میں وہ حسِ جمال نہیں جو چینیوں کی خصلت میں چلی آتی ہے..

رُوسیوں نے لینن کو فی الحال مکمل طور پر رد کر دیا ہے..اپنی تاریخ کے ایک بے مثل باب کو جس میں کوتاہیاں اور ظلم بھی تھے' یکسر اپنے نصاب سے خارج کر دیا ہے..

انقلاب سنبھال لیا جائے تو کوتاہیاں اور ظلم بھول جاتے ہیں..نہ سنبھل سکے تو بس یہی باقی رہ جاتے ہیں..چینی ہمیشہ سے اعتدال پسند رہے ہیں اور ماؤ کے بارے میں بھی اُنہوں نے یہی روّیہ اختیار کیا ہے..وہ اب بھی اُن کے انقلاب کا عظیم قائد ہے لیکن اُن کے لیے خدا نہیں رہا..بقول ایک شنگھائی کے ادیب کے..ماؤ نے زندگی میں بے شمار فاش غلطیاں کیں..ثقافتی انقلاب برپا کر کے چین کے پورے نظام اور قدیم ثقافت کو درہم برہم کر دیا لیکن..اُس کی کامیابیاں اُس کی غلطیوں سے کہیں بڑی ہیں..

ماؤزے تنگ ہماری نسل کے لیے ہوچی منہ اور چے گویرا کے ہمراہ ایک بڑی انقلابی تبدیلی اور روشن مستقبل کی علامت تھا..وہ اگرچہ اب گہنا چکا تھا لیکن ہمارے زمانوں میں وہ جوبن پر تھا اور آج ہم اُس کے مقبرے کو..یا اُس کی لاش کی نمائش کو دیکھنے جا رہے تھے..

چینی میزبان اس بارے میں مکمل طور پر غیر جانب دار تھے..اگر آپ ماؤ کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو لے چلیں گے..نہیں دیکھنا چاہتے تو ہم آپ کو بیجنگ کے چڑیا گھر میں لے جا کر آپ کے من پسند پانڈے دکھا سکتے ہیں..

ماؤ کے چین میں یہ کیسے زمانے آ گئے تھے کہ ماؤ اور پانڈے ایک ہی سطح پر آ گئے تھے..

ہم نے پانڈوں کی بجائے ماؤ کو دیکھنا پسند کیا..

تھیان من سکوئر میں ماؤ کے مقبرے کے سنگ مرمر سے تعمیر کردہ حصار کے سامنے سیاحوں اور چینیوں کی ایک دورویہ بہت ہی طویل قطار تھی جس میں شامل ہم آہستہ آہستہ لیکن ایک خاص ضبط کے ساتھ رینگتے تھے..

''لیو..ان ہزاروں زائرین کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ماؤ اب بھی چینیوں کے دلوں پر راج کرتا ہے..''

لیو ایک احتیاط کے ساتھ پھر غیر جانب دار ہو گیا ''ہاں..کسی حد تک..لیکن آپ غور کیجیے کہ ان میں بیجنگ کے باشندے بہت کم ہیں..زیادہ تر دُور دراز کے چینی دیہات

سے آنے والے دہقان ہیں جو ابھی تک ماؤ کے طلسم سے آزاد نہیں ہو سکے..''

صدر دروازے کے قریب قطار اندر قطار پھولوں کے گلدستے ترتیب سے سجے ہوئے تھے اور آپ نہایت معمولی قیمت پر اُنہیں ماؤ کے قدموں میں رکھنے کے لیے.. عارضی طور پر حاصل کر سکتے تھے.. لیو نے فوراً چند گلدستے حاصل کیے اور وفد کے تمام اراکین کو تھما دیئے کہ بے شک ماؤ متروک ہو چکا تھا لیکن ادب آداب تو ترک نہیں کیے جا سکتے..

ہم اپنے اپنے گلدستوں کو سینے سے لگائے رُک رُک کر دھیرے دھیرے سے آگے بڑھتے رہے..

سب لوگ خاموش تھے..

کوئی بھی بات نہیں کرتا تھا..

تھیان من سکوئر میں جو چینی گھوم رہے تھے وہ تو کھلنڈرے اور باتونی تھے اور اُن کی آوازوں کا شور ہم تک پہنچتا تھا لیکن قطار میں کھڑے یہ لوگ اُن سے سراسر مختلف اور سنجیدہ تھے..

صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہیں تو سامنے ماؤزے تنگ کا ایک شاندار اور پُرشکوہ مجسمہ آپ پر حاوی ہو جاتا ہے.. گلدستے اس سے آگے نہیں جا سکتے.. آپ انہیں اس مجسمے کے قدموں میں رکھتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں..

یہی گلدستے خدام فوراً اُٹھاتے ہیں اور اُنہیں واپس مقبرے کے باہر جو سٹال ہیں وہاں پہنچا دیتے ہیں..

آپ اس مجسمے کے دائیں جانب جاتے ہیں..

تو ماؤ ایک شوکیس میں سجا ہے..

شیشے کی دیواروں کے اندر وہ لیٹا ہوا ہے..

وہ ہے یا اُس کی مٹی ہے جو ابھی تک اُس چینی مٹی کا حصہ نہیں بن سکی جس نے اُسے گراں خوابی سے سنبھالا.. توقیر دی.. اقوامِ عالم میں سربلند کیا..

وہی ماؤ کوٹ.. سلیقے سے بنے ہوئے بال.. ذرا پُھولے ہوئے گال اور وہی نقش جو ایک زمانے میں دنیا بھر کے اربوں لوگوں کو منہ زبانی یاد تھے...... ہم نے اس چہرے کو کہاں کہاں نہیں دیکھا تھا.... اب بھی وہ ایک میڈل پر کندہ.. اخبار کے پہلے صفحہ پر.. تاریخ کی کتابوں میں.. امریکی رسالوں میں اور لوگوں کے دلوں پر نقش دکھائی دیتا تھا.. وہی بند گلے کا کوٹ.. وہی سیدھے سیاہ بال سلیقے سے بنے ہوئے بال جو ایڈگر سنو کی ''ریڈ سٹار اوور چائنا'' کی لونگ مارچ کی تصویروں میں تھے... ہنری کسنجر اور نکسن کی تصویروں میں تھے...

ٹھہر کر دیکھنے کی اجازت نہ تھی ورنہ میں ٹھہر کر دیکھتا کہ اربوں لوگوں کی تقدیر اور تاریخ کے دھارے بدل دینے پر قادر چہرے کے اندر کیا بھید ہوتے ہیں..

کچھ لوگ تو ماؤ کی حنوط شدہ لاش کو ایک خاص لاتعلقی سے دیکھتے.. اُس کا سرسری مشاہدہ کرتے اور گزر جاتے..

لیکن دس بارہ زائرین میں سے ایک فرد ایسا ہوتا جو ذرا آگے ہوتا.. آگے ہو کر ماؤ کے سامنے ذرا جھکتا اور پھر پیچھے ہو جاتا..

ایک دہقان عورت خاموشی سے روتی جا رہی تھی.. اپنے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو خاموشی سے پونچھتی جا رہی تھی..

میں نے آج سے تقریباً چالیس برس قبل ماسکو کے سرخ چوک میں کریملن کی دیوار کے دامن میں ایک مختصر نیچی چھت کے تنگ مقبرے میں ولادیمیر لینن کو اسی قسم کی حنوط شدہ حالت میں لیٹے دیکھا تھا.. ایک زیرزمین مقبرے میں جس کی پوشیدہ روشنیاں بے حد مدھم تھیں اور شیشے کے تابوت میں چھاتی تک ایک کمبل میں.. تھری پیس سوٹ۔ ٹائی کی موٹی گرہ اور فرنچ کٹ داڑھی.. آج لینن وہاں موجود نہیں ہے.. اُسے کریملن کے سائے میں دفن کیا جا چکا ہے..

ماؤزے تنگ کی نمائش میں کتنے دن باقی تھے.. یہ میں نہیں جانتا تھا.. اسے کب..

اگر کبھی یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا.. یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن.. یہ جانتا تھا کہ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو گراں خواب چینی کبھی نہ سنبھلتے..

دوسری جانب مقبرے سے باہر آئے.. یہاں زائرین کے لیے ماؤ کے سوونیئر فروخت ہورہے تھے..

میں نے ایک جھکی ہوئی عمر رسیدہ دہقان عورت کو دیکھا جو بار بار مقبرے کی جانب اشارہ کرتی.. جو بھی قریب سے گزرتا اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتی.. پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ماؤ کے مقبرے کو دیکھتی اور روتی ہوئی اور کبھی مسکراتی ہوئی کچھ کہتی جاتی..

میں نے لیو سے رجوع کیا تو اُس نے اُسی غیر جانبدارانہ رویے کے ساتھ رپورٹ دی کہ یہ دہقان عورت لوگوں کو بتا رہی ہے کہ میں یوآن صوبے سے آئی ہوں اپنے ماؤ کو دیکھنے.. یہ میرے صوبے میں پیدا ہوا تھا..

’’سمر پیلس کی جھیل اور فقیر کی چٹان‘‘

سمر پیلس ماؤ کے مقبرے سے شمال کی جانب.. پورے اٹھارہ کلومیٹر کی دُوری پر تھا..

یہ چین میں ہماری آخری اہم زیارت تھی..

اور ہم اسے دیکھنے کے امکان سے زیادہ خوش نہ تھے.. پُرجوش نہ تھے.. ایک اور محل.. بے شک وہ سمر پیلس ہی کیوں نہ ہو.. شہرِ ممنوعہ کے محلات کے بعد اور کیا ہوگا..

کوچ ایک ایسی شاہراہ پر سے گزری جس کے دونوں جانب کی عمارتوں کو قدیم چینی طرزِ تعمیر میں ڈھالا جا رہا تھا..

سمر پیلس کا صدر دروازہ ایک اور سلیٹی رنگ کی ڈھلواں چھت اور چینی بارہ دری تھی جس کے احاطے میں سیاحوں کا ایک ہجوم تھا۔ سرخ محرابوں کے پار ایک اور باغ سا نظر آ رہا تھا.. یہاں بھی چین نے اپنی قدیم اقدار کی سختی سے پاسبانی کی تھی.. کسی کو گمان نہ گزرے کہ اس بارہ دری کے پار کیا ہے.. کسی کو شک نہ ہو کہ وہ ایک اور دنیا میں داخل ہونے کو ہے..

بارہ دری کے اندر داخل ہوتے ہی ایک ایسی طویل راہداری کا آغاز ہو جاتا ہے جس میں آپ دیگر سیاحوں سے کھیتے‘ شانے بھڑاتے دھکیلتے چلتے ہی جاتے ہیں اور اس کا اختتام نہیں ہوتا.. راہداری کے بائیں جانب چینی باغوں کی خوشنمائیوں کے سلسلے چلتے ہیں اور بائیں طرف کچھ دیر بعد ایک وسیع جھیل کے پانی یوں پھیلتے چلے جاتے ہیں جیسے یہ اُفق کو پار کر کے بیجنگ شہر میں جا کر اُس کے گلی کوچوں میں بہنے لگیں گے..

اس راہداری میں اصولی طور پر تین مرتبہ پیدل چلنا چاہئے..ایک بار صرف بائیں جانب نظر کرتے باغوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے..دوسری مرتبہ دائیں ہاتھ پر جھیل کے منظر کو نظر میں اُتارتے ہوئے اور تیسری مرتبہ نگاہیں بلند کر کے ستونوں کے اُوپر محرابوں پر نقش قدیم شہنشاہوں' اُن کے درباریوں اور درباروں کی تصویریں غور سے دیکھنے کے لیے..
آپ دیکھتے جائیے کہ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کے ورق ہر دو چار قدم بعد اُلٹتے چلے جاتے ہیں..یہ اوراق یہ شاندار تصویریں سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے سامنے آتی چلی جاتی ہیں..
اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ہر تصویر کی تفصیلی شناسائی کے لیے..اُس کی باریکی' فن' شہنشاہوں اور زرد شہزادیوں کے لبادوں اور دربار کی آرائش اور درباریوں کے چہروں کو بغور دیکھنے کے لیے کم از کم ایک تصویر کے لیے ایک دن درکار ہوگا..لیکن ہمارے پاس وقت کہاں تھا..ہم یہ اوراق پارینہ بے تابی سے پلٹتے سرسری نگاہ کرتے آگے بڑھتے جاتے تھے کیونکہ شنید تھی کہ یہ راہداری تقریباً ایک کلومیٹر طویل ہے..اور یہ اتنی ہی طویل تھی۔
بائیں جانب جھیل کے نیلگوں لشکارے تھے..ہمیں بلاتے تھے کہ اس راہداری کی مسافت ترک کر کے ذرا ادھر تو نگاہ کرو..قریب آؤ..لیکن ہم نہیں جا سکتے تھے کیونکہ ہمیں شیڈول کے مطابق سمر پیلس دیکھنے بلکہ اس میں سے گزرنے کے لیے صرف دو گھنٹے مرحمت فرمائے گئے تھے..اور کوچ سمر پیلس کے دوسرے سرے پر ہماری منتظر تھی..ہم گویا میراتھن دوڑ کے وہ کھلاڑی تھے جنہیں بھاگم بھاگ اُس کوچ تک پہنچنا تھا..راستے میں جو کچھ آئے اُسے درگزر کرنا تھا اور بس ہانپتے بھاگتے اپنی فنشنگ لائن تک پہنچنا تھا۔
اگر دو گھنٹوں میں پورا روم' دہلی' لاہور یا ایتھنز دیکھا جا سکتا ہے تو ہم بھی سمر پیلس کو دیکھ رہے تھے..
راہداری کا اختتام ہوا تو ہم کھلی فضا میں آ گئے جہاں دوپہر کی دھوپ میں ڈلکیں مارتے جھیل کے پانی وہاں تک جاتے تھے جہاں تک ہماری نظر جاتی تھی اور پھر دھندلا جاتی تھی..
جھیل کے درمیان میں ایک بہت بڑا جزیرہ اُبھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا..اور اُس

جزیرے پر کسی چینی جادوگر کا کمال ایک کوہ قاف کے طلسم والا ہوش ربا محل تھا..وسیع باغ اور چشمے تھے اور ہمارے علاوہ سب سیاح..چینی و غیر چینی سٹیمرز میں سوار ہو کر وہاں جا رہے تھے..
لیکن ہم نہیں جا رہے تھے کیونکہ ہم تو میراتھن دوڑ کے کھلاڑی تھے..ہمیں کیا کہ راستے میں کیسے کیسے عجائبات اور جادوئی منظر ہیں..
یہ سمر پیلس..اس کے محلات' پگوڈے' راہداریاں' باغات اور یہ وسیع جھیل دراصل ایک چینی ملکہ کی بظاہر بیوقوفی کے باعث تخلیق ہوئے تھے..کہا جاتا ہے کہ اس چینی ایمپریس نے اپنے عوام سے دردمندانہ اپیل کی کہ مادر وطن کو جاپانی لٹیروں سے بچانے کے لیے ایک عظیم بحری بیڑے کی اشد ضرورت ہے تو آپ ٹیکسوں کے علاوہ اس کارِ خیر کے لیے فوری طور پر کچھ رقم مہیا کریں ورنہ ہم خود آپ سے مہیا کروالیں گے..چنانچہ یہ رقم کچھ تو عوام نے اپنی مرضی سے فراہم کی لیکن جنہوں نے تعاون نہ کیا اُن سے فراہم کروالی گئی...اس دوران ملکہ نے اپنا ارادہ بدل دیا...اُس نے فیصلہ کیا کہ جاپانی لٹیروں نے باز تو پھر بھی نہیں آنا تو بحری بیڑہ بنانے کا تردّد کیوں کیا جائے کیوں نہ اس رقم سے ایک ایسا سمر پیلس اور ایک مصنوعی جھیل تعمیر کی جائے جو رہتی دُنیا تک ایک شاہکار ہو اور ملکہ کے نام سے منسوب ہو..
چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی..
اور جانے کتنے برس تعمیل ہوتی رہی..
تو یہ ایک مصنوعی جھیل تھی..جسے ایک ملکہ کی حماقت نے لبریز کیا تھا..
اور آج ہم سب اُس ملکہ کے شکر گزار ہو رہے تھے..اگر وہ ایک بحری بیڑہ بنا دیتی تو اُس کی جنگی کشتیاں' جہاز' ہتھیار اور توپیں سب کے سب کب کے فنا ہو چکے ہوتے..ایک بادبان بھی باقی نہ رہتا لیکن..سمر پیلس آج بھی باقی ہے..
ہم اگرچہ شتابی میں تھے لیکن اس کے باوجود جھیل کے برابر میں ایک صحن کے بیچ میں جو ایک عجیب شباہت کی چٹان دھری تھی اُس نے ہمیں روک لیا کہ اُس کی بناوٹ ایک ایسے قدرتی مجسمے کی تھی جسے ناتراشیدہ چھوڑ دیا گیا تھا..جیسے فلورنس میں مائیکل اینجلو کے

چند مجسمے نامکمل حالت میں ہیں..

اسے فقیر کی چٹان کہا جاتا ہے..

کیوں کہا جاتا ہے؟

اس لیے کہا جاتا ہے کہ سینکڑوں برس پیشتر ایک ذوق جمال رکھنے والے چینی ضلع دار نے بیجنگ سے ہزاروں کوس کے فاصلے پر واقع ایک جنگل میں اس چٹان کو دیکھا تو اس کی قدرتی ساخت پر اس قدر فریفتہ ہوا کہ اُس نے طے کرلیا کہ میں ہر صورت اس سنگی شاہکار کو بیجنگ لے کر جاؤں گا.. ظاہر ہے اُن دنوں ایک چھوٹے پہاڑ کے حجم کی چٹان کو بیجنگ تک لے جانا تقریباً ناممکن تھا لیکن ضلع دار نے اپنی تمام تر جائیداد فروخت کر دی.. بیوی کے زیور بیچ دیئے.. اور ان سے حاصل شدہ رقم سے جانے کیسے اور کن طریقوں سے وہ اس چٹان کو بالآخر بیجنگ تک لے آنے میں کامیاب ہوگیا اور جب وہ بیجنگ پہنچا تو فقیر ہو چکا تھا.. اس لیے.. فقیر کی چٹان!

میں نے سمر پیلس میں بھاگتے دوڑتے.. مراتھون ریس کے کھلاڑی کی حیثیت سے بہت ہی مجرم محسوس کیا.. اس عجیب جہان میں بہت دن کے لیے آنا چاہیے تھا اور میں صرف دو گھنٹے کے لیے آیا تھا.. یہ سمر پیلس کی توہین تھی..

سمر پیلس کا اختتام ہونے لگا.. جھیل ہمارے ساتھ ساتھ سکڑنے لگی..

جہاں جھیل کا اختتام ہو رہا تھا' وہاں پانیوں میں ایک محل نما کشتی کھڑی تھی.. بلکہ ایک محل تھا چینی کاریگری سے مزین' سفید سنگ مرمر کا جسے کہیں سے اُٹھا کر اس جھیل میں رکھ دیا گیا تھا اور اسے کشتی کا نام دے دیا گیا تھا... ویسے اس کی کھڑکیاں نہایت واہیات اور ماڈرن ڈیزائن کی تھیں اور ان میں چینی حسنِ جمال کا کوئی شائبہ نہ تھا بلکہ علامہ اقبال ٹاؤن کے کسی دس مرلے کے ٹھیکیدار کے بنائے ہوئے گھر کا شائبہ تھا... صرف یہ گھر سمر پیلس کی جھیل میں لنگر انداز تھا..

''تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟'' تتلی جو اس بھاگ دوڑ میں میرا ساتھ دینے کی کوشش میں نڈھال ہو کر گرنے کو تھی' مجھے ڈانٹتی ہوئی بولی..

''تتلی.. سمر پیلس کی نہروں کے پار کوچ ہماری منتظر ہے.. ہمیں وہاں پہنچنا ہے اور دو گھنٹے کا جو وقت ہمیں دیا گیا تھا اُسے پورا ہونے میں صرف چند سیکنڈ باقی ہیں..''

''اگر تم اُس کوچ میں جا بیٹھو گے تو پھر کہاں جاؤ گے؟''

''ظاہر ہے ہم واپس بیں ہوٹل جائیں گے.. سامان کی پیکنگ شروع کریں گے.. ابھی سے شروع کریں تو پرسوں تک وطن واپسی کے لیے پی آئی اے کی پرواز پر بیٹھ سکیں گے ناں..''

''اتنے تردّد کی ضرورت تو نہیں..''

''سامان پیک کرنے کے لیے؟''

''نہیں پاکستان واپس پہنچنے کے لیے...'' تتلی نے پر سمیٹے.. کبھی وہ میرے بالوں میں اُترتی تھی اور کبھی میرے رُخساروں کو چھوتی تھی' لاڈ کرتی تھی.. فلرٹ کرتی تھی ''اتنے تردّد کی تو ضرورت نہیں''

''یعنی میں جہاز میں بیٹھے بغیر پاکستان پہنچ جاؤں گا..'' میری نظر کے سامنے گھڑی پر گرتے ہوئے سیکنڈ تھے..

''ہاں..'' وہ اِک ادا سے بولی.. آہستہ سے.. کہ.. ہاں..

''کیسے؟'' میں نے جھلا کر.. بلند آواز سے.. کہ.. کیسے؟

''تم سمر پیلس کی جھیل میں کھڑی اس کشتی میں بیٹھ جاؤ تو اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہو..''

''نہیں..''

''ہاں..''

''کیسے؟'' میں نے پھر جھلا کر کہا..

''سمر پیلس کی جھیل میں کھڑی اس سنگ مرمر کی کشتی کے بارے میں ایک قدیم چینی روایت ہے کہ اگر کوئی شخص اس میں سوار ہو اور اُس کا یقین مضبوط ہو اور نیت کھری ہو تو وہ اپنی اُس منزل تک پہنچ جائے گا جس کی خواہش اُس کے دل میں ہوگی.. تم اس میں سوار ہو کر پاکستان پہنچ سکتے ہو..''

''اور اگر میرے دل میں کہیں اور پہنچنے کی خواہش ہو تو؟''

''تو تم.. وہاں بھی پہنچ سکو گے.. اپنی شاہ گوری کے پاس.. اپنی جھیل کرومبر کی قربت میں..''

''یہ تم نے کیسے جان لیا کہ یہ تو میرے دل میں تھا..''

''اس لیے کہ میں تم ہوں.. بھول گئے.. تمہارے بھید میرے اندر ہیں.. اب تم جاؤ.. کوچ تمہاری منتظر ہے.. لیکن میں یہاں ٹھہروں گی.. تمہارا انتظار کروں گی اور پھر ہم دونوں اس کشتی پر سوار ہو جائیں گے..''

''ہم دونوں؟''

''تم ابھی جاؤ..'' تتلی اُڑی اور کشتی کی نوک پر جا کر بیٹھ گئی.. منتظر..

مقام.... تیان جن

''قدیم بیجنگ منہدم ہو رہا ہے....
تیان جن میں شاپنگ ہی شاپنگ''

پورے بیجنگ کو انقلاب چین کی پچاسویں سالگرہ کی آمد کی خوشی میں درہم برہم کیا جا رہا تھا..

ہوٹل پیس کے آس پاس کا علاقہ تو سکون سے تھا کہ وہاں ایک عرصے سے پرانا بیجنگ ملیامیٹ کیا جا چکا تھا سوائے میری کھڑکی کے نیچے پھیلے شینٹی ٹاؤن کے.. اُس چین کے چھپر نما گھر کے جہاں سے ہر صبح ایک خاص وقت پر ایک بوڑھا سائیکل تھامے باہر آتا تھا.. یہاں شاہراہیں' بلند عمارتیں' ہوٹل' بازار اور پارک.. قدیم شہر کے آثار سمیٹ کر ظاہر ہو چکے تھے اور صرف ایک کنواں گئے وقتوں کی یادگار تھا اور خشک ہو چکا تھا اور کسی بھی پیاسے کی پیاس بجھانے کے قابل نہ رہا تھا.. بقیہ شہر میں تعمیر نو اتنے پُر جوش انداز میں کی جا رہی تھی کہ اس کے کئی حصوں پر دوسری جنگ عظیم کے بعد کے برلن کا گمان ہوتا تھا کہ ہر جانب پرانی آبادیوں اور رہائشی علاقوں کے کھنڈرات اور ملبے تھے جن میں بلڈوزر دندناتے پھرتے تھے اور اُن میں سے نئے چین کے شواہد سر اُٹھا رہے تھے.. اس تعمیر نو پر حال ہی میں امریکی جریدے ''ٹائم'' نے ایک دُکھ بھرا واویلا کیا تھا کہ بیجنگ آج سے صرف بیس برس پہلے تک تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ وہ چینی شہنشاہوں کے زمانے میں ہوا کرتا تھا اور اب اُس کی قدامت کو ڈھایا

جا رہا ہے.. چینی تشخص کو برباد کیا جا رہا ہے اور سکائی سکریپر تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ بھلے ان پرانی آبادیوں میں گندگی اور بے ترتیبی تھی، گلیاں ٹیڑھی اور تنگ تھیں لیکن وہاں سے چین کی اصل مہک تو آتی تھی..

چینی یا کوئی بھی قوم یا تو اپنی اصل مہک قائم رکھ سکتی ہے یا پھر خوشحال اور آرام دہ ہو سکتی ہے.. امریکی یوں بھی اپنے سوا کسی اور کو سکائی سکریپر تعمیر کرتے نہیں دیکھ سکتے.. اس لیے شنگھائی کا جن ماؤ ٹاور بھی اُنہوں نے ہی تعمیر کیا ہے.. ہم ایک ایسے بازار میں سے گزرے جسے جوں کا توں رہنے دیا گیا تھا..

جاپانیوں کے علاوہ چینیوں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ورکاہلک ہیں یعنی کام اُن کے لیے ایک ایسا نشہ ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے.. اسی لیے ہوٹل پیس کی بار میں بیٹھے ہوئے ایک امریکی بزنس مین نے کہا تھا کہ ہم تو خواہ مخواہ ان کے لیے ایٹم اور ہائیڈروجن بم بناتے رہے ہیں.. ان چینیوں کو تباہ کرنے کا سستا ترین نسخہ یہ ہے کہ انہیں صرف تین دن زبردستی کام کرنے سے روک دیا جائے۔ یہ سب کے سب خود بخود دفوت ہو جائیں گے.. نہ صرف یہ کہ چینیوں کو ان تھک اور مسلسل کام کرنے کی لاعلاج بیماری ہے بلکہ کسی بھی پروجیکٹ کو ریکارڈ ٹائم میں مکمل کرنے کا بھی خبط ہے.. ایک زمانے میں جب تھیان من سکوئر کے اردگرد کی شاندار اور شاہانہ عمارتیں تقریباً پلک جھپکتے میں کھڑی ہو گئی تھیں تو اکثر یورپی اقوام اُنہیں دن رات غور سے دیکھتی رہتی تھیں کہ یہ اب گریں کہ گریں.. کہ اتنی شتابی سے تعمیر کردہ عمارتیں شتابی سے گر بھی جاتی ہیں.. اب وہ انہیں غور سے دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہیں..

پاکستانی سفارت خانے کے ایک قونصلر شاہ صاحب نے ایک عجیب قصہ سنایا.. کہنے لگے، مجھے بیجنگ میں آئے ہوئے ابھی دو تین ماہ گزرے تھے.. ایک روز دفتر سے واپس اپنے فلیٹ کو جا رہا تھا کہ راستہ بھول گیا.. چنانچہ کار موڑ کر دفتر گیا اور یادداشت پر زور ڈال کر ایک مرتبہ پھر اپنے فلیٹ کی جانب گامزن ہوا.. اور دوبارہ راستہ بھول گیا.. کسی اور انجانے مقام پر جا نکلا.. مجبوراً پھر واپس گیا اور ایک پاکستانی اہلکار سے مدد کی درخواست کی..

وہ اہلکار کہنے لگا "شاہ جی! آپ درست راستے پر ہی سفر کرتے ہیں.. آپ کے گھر کو وہی راستہ جاتا ہے.. صرف یہ ہے کہ آج صبح آپ نے اخبار میں یہ اعلان نہیں پڑھا کہ فلاں شاہراہ پانچ گھنٹوں کے لیے ٹریفک کے لیے بند رہے گی کیونکہ اُس کے اردگرد کچھ گھاس اُگانے اور شجرکاری کا پروگرام ہے..... آپ دوبارہ اُسی راستے پر جائیں۔"

شاہ صاحب نے حلفیہ بیان دیا کہ تارڑ صاحب صبح جب دفتر آیا تھا تو اُس شاہراہ کے دونوں جانب کچھ بھی نہ تھا اور جب آٹھ گھنٹوں کی ڈیوٹی کے بعد واپس گیا ہوں تو تقریباً دو کلومیٹر کے علاقے میں اُس شاہراہ کے دونوں طرف نہ صرف پلے پلائے پورے قد کے سینکڑوں درخت کھڑے تھے بلکہ اُن کے نیچے سرسبز گھاس کے تختے بھی تھے جن پر پانی چھڑکنے کے فوارے بوندیں برسا رہے تھے.. اس لیے میں یہ سمجھتا رہا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں یہ کوئی اور شاہراہ ہے..

ہر شے بدل گئی تھی.. دوبارہ تعمیر سے کچھ کی کچھ ہو گئی تھی لیکن ایک تعمیر ایسی تھی اور وہ بہت ہی قدیم تعمیر تھی جسے جوں کا توں رکھا گیا تھا.. یہ بیجنگ شہر کی قدیم حفاظتی دیوار تھی.. تعمیر نو کی سراسیمگی کے سمندر میں سکون کا وہ واحد جزیرہ تھا جو ابھی تک جوں کا توں تھا۔ محفوظ تھا.. البتہ اُس کی ہر اینٹ پر حیرت نقش تھی کہ یہ میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے..

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک بیجنگ کے بدلتے ہوئے چہرے میں سے سفر کرتے ہوئے بالآخر اس شہرزاد سے باہر آئے اور ہماری کوچ ایک خلائی جہاز ایسی نرم روی سے ایک شاہراہ پر تیرنے لگی..

ہم دراصل تیان جن جا رہے تھے..

کیوں جا رہے تھے؟

اس لیے کہ یہ بھی ہمارے شیڈول میں تھا اور وہاں کے ادیب ہمارے لیے چشم براہ تھے اور پاکستانی ادیبوں اور دانشوروں سے کچھ روشنی حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اُن کے چراغوں میں روشنی نہیں رہی.. وہ غلط فہمی میں مارے جا رہے تھے..

آج سویرے پیس ہوٹل سے روانگی پر ہم نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا تھا کہ

آخر ہمیں کیوں تیان جن جانا ہے' اور یہ کیا ہے اور یہ کہاں ہے اور جہاں بھی ہے وہاں کے ادیب ہمیں وہاں کیوں بلاتے ہیں' خود ہمیں ملنے کے لیے بیجنگ کیوں نہیں آ جاتے..

اس کے جواب میں لیو نے جو کچھ کہا اُس سے ہم لاجواب ہو گئے.. ''تیان جن ایک بالکل نیا صنعتی شہر ہے لیکن آپ اطمینان رکھئے کہ ہم پہلے وقتوں کی طرح آپ کو فیکٹریاں اور کارخانے دکھا دکھا کر ہلکان نہیں کریں گے.. ہم صرف وہاں کے ادیبوں کے ساتھ ایک مختصر مکالمہ کریں گے پھر وہ ہمیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کریں گے اور پھر..'' لیو نے جو کچھ اس کے بعد کہا اُس نے ہمیں لاجواب کیا تھا'' اور پھر ہم تیان جن کے اُس اوپن ایئر بازار میں جائیں گے جہاں اہل بیجنگ بھی شاپنگ کے لیے جاتے ہیں.. چین کی ہر شے اور چین بھر میں سب سے ارزاں شے.. وہاں آپ کو ملے گی.. آپ ذہن میں کوئی بھی شے لائیے اور وہاں نہ صرف دستیاب ہوگی بلکہ ناقابل یقین حد تک کم قیمت میں دستیاب ہوگی..''

اراکین چہکنے لگے' اُن کے چہروں پر نور برسنے لگا اور اُنہوں نے فوراً اپنی اپنی شاپنگ لسٹس جیبوں میں سے نکالیں.. اُنہیں غور سے دیکھا چیک کیا.. اگرچہ ہانگ چُو کی سلک سے ہمارے بیگ ریشم ریشم ہو رہے تھے لیکن ریشم کے سوا بھی تو چین میں بہت کچھ رکھا تھا.. چنانچہ تفتیش شروع ہو گئی..

''لیو بھائی.. وہاں سے لیڈیز شوز مل جائیں گے.. جوگرز مل جائیں گے... جیولری' شرٹیں' بچوں کے کھلونے اور جانگئے.. چینی گڑیاں' آرائشی اشیاء' قالین.. سگریٹ لائٹر...'' اور لیو سر ہلاتا جاتا تھا کہ ہاں مل جائیں گے.. یہ بھی مل جائیں گے..

اس لیے اب ہم بخوشی تیان جن جاتے تھے..

ہمارے شوقِ شاپنگ میں ایمرجنسی یوں آ رہی تھی کہ ہماری واپسی میں ایک دو روز رہ گئے تھے اور ہم واپسی پر اپنے گھر والوں اور بال بچوں کو چین کی بے مثال ترقی' دیوار چین اور ٹیراکوٹا سولجرز کی داستانیں سنا سنا کر بالکل متاثر نہیں کر سکتے تھے.. صرف اپنے سوٹ کیس اور بیگ کھول کر اُن میں ٹھنسی ہوئی شاپنگ سے ہی اُن کے دل جیت سکتے تھے..

پچھلے روز بھی اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی تھی..

سفید ریش شاعر یکدم پُراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا اور جب نمودار ہوا تو شاپنگ سے لدا پھندا دانت نکال رہا تھا.. وہ پیس ہوٹل سے ملحقہ چھوٹے چھوٹے بازاروں میں مٹرگشت کر کے آیا تھا اور بقول اُس کے نہایت کارآمد شاپنگ کر کے لوٹا تھا'' یہ دیکھو یہ کلہاڑی کتنی کارآمد ہے.. اس کا دستہ پالش شدہ ہے اور پاکستانی روپوں میں صرف ڈیڑھ سو کی ہے.. اگر گھر کے دروازے کی چابی گم ہو جائے تو تم اس کلہاڑی سے اُسے کاٹ سکتے ہو.. عید پر گائے کی قربانی پر بھی یہ کام آئے گی... اور ذرا دیکھو یہ پیچ کس کتنا زبردست ہے.. اس سے کسی بھی پیچ کو کھولا جا سکتا ہے.. شاید کسا بھی جا سکتا ہے.. اور ذرا اس چینی اُسترے کی دھار دیکھو۔ کوڑیوں کے مول لایا ہوں.. حالانکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں لیکن سو روپے میں کیا برا ہے.. اور یہ تو کمال کی چیز ہے یہ زنجیر اور پیچیدہ تالہ.. صرف دو سو روپے میں.. اس سے بے شک اپنا گیٹ مقفل کر دیا کتے کے گلے میں ڈال لو.. چوری نہیں ہوگا..''

چنانچہ ہم سب سفید ریش کی اس شاندار شاپنگ سے بے حد مسحور ہوئے اور فوری طور پر اُس کی سرکردگی میں یہ سب کارآمد اشیاء خرید لائے... البتہ واپسی پر انہیں دیکھ کر گھر والوں نے جو درگت بنائی وہ الگ داستان ہے کہ یہ کیا کیا اُٹھا لائے ہو بیوقوف.. یہ کلہاڑی تو گلگت میں سو روپے کی ملتی ہے۔ اس کا کرو گے کیا.. اُسترا آج تک کبھی استعمال کیا ہے۔ اب کیا ختنوں کا کام شروع کرنا ہے.. اور یہ زنجیر اور تالہ تو صرف تمہیں باندھنے کے کام آ سکتا ہے..

تیان جن واقعی ایک نیا شہر تھا.. ایک برینڈ نیو انڈسٹریل کمپلیکس تھا.. اور واقعی یہ ہمارے میزبانوں کا کرم تھا کہ اُنہوں نے اپنی ترقی کا رُعب ڈالنے کے لیے اُن درجنوں فیکٹریوں میں پیدل نہیں چلایا اور نہ ہی اعداد و شمار کی بوچھاڑ کر کے ہمیں نڈھال کیا بلکہ براہِ راست تیان جن کے سادہ مزاج اور مہمان نواز ادیبوں سے ایک مختصر ملاقات کروائی اور پھر دوپہر کے کھانے کے لیے ایک قدیم طرز کے ریستوران میں لے گئے جس کی سب سے بڑی خصوصیت ایک رُوٹھی ہوئی خمیرے آٹے کی مانند ذرا پھولے ہوئے چہرے والی روایتی

لباس میں ملبوس ایک گونگی لگتی ویٹرس تھی جو لکڑی کی ایک لمبی ناک والی چائے دانی اُٹھائے ذرا فاصلے پر کھڑی ہو کر میز پر دھری آپ کی پیالی میں تاک کر ایک ایسی دھار مارتی تھی کہ چائے کا ایک قطرہ بھی باہر نہیں گرتا تھا..

بلکہ پہلی بار تو ایسا ہوا کہ میں گفتگو میں مگن تھا کہ بغل میں سے ایک دھار برآمد ہوئی اور میری پیالی کو لبریز کر دیا.. میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو وہ روٹھی ہوئی ویٹریس مجھے فارغ کرنے کے بعد حسرت ناک کی طرف بڑھ رہی تھی..

پتہ نہیں اُس نے دھار مارنے کی یہ مشاقی کیسے ڈویلپ کی تھی..

تیان جن والے اپنی مقامی وائن کو بھی بہت بلند درجات پر فائز کرتے ہیں.. لیکن وہ کم کم تھے جنہوں نے اُن کا دل رکھنے کی خاطر چند گھونٹ بھرے..

کھانے سے اور اُس دھار مارتی ویٹرس سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہم سب اگرچہ بہت سے تھے لیکن ایک تیر کی مانند اُس وسیع شاپنگ بازار میں پہنچے جو تیان جن میں ہمارے لیے منتظر تھا..

لیو کی ترغیب واقعی ایک حقیقت ثابت ہوئی..

سینکڑوں نہیں ہزاروں کھوکھے' سٹال اور دوکانیں... کچھ ایک وسیع ہال کے نیچے اور بیشتر کھلی فضا میں.. اور وہاں صرف ہم تھے جو غیر ملکی تھے ورنہ چینیوں کا ایک جم غفیر.. اور وہاں وہ کچھ تو تھا ہی جو ہماری شاپنگ لسٹس میں درج تھا بلکہ اُس کے سوا بھی اتنا کچھ تھا جو کبھی ہمارے تصور میں نہ تھا.. اور اتنی کم قیمت میں تھا کہ ہم اپنے کانوں پر یقین نہ کرتے تھے.. چنانچہ جملہ اراکین وفد اس بازار چین میں ایسے کھو گئے کہ بس پاک ہو گئے.. یہاں چینی کاریگری کے لاکھوں انمول تحفے تھے..

اگر یورپ اور امریکہ کے سپر سٹورز میں ان دنوں تقریباً ہر شے پر ''میڈ اِن چائنہ'' کی مہر ہے اور اگر ایک امریکی ماہر معاشیات نے طنز کیا تھا کہ ہمیں واشنگٹن میموریل کو بھی ذرا اُلٹ پلٹ کر دیکھ لینا چاہیے کہیں وہ بھی ''میڈ اِن چائنہ'' نہ ہو تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہ تھی.. اور اگر دنیا میں چین وہ واحد ملک ہے جس کا امریکہ ساٹھ بلین ڈالر کا مقروض

ہے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ چینی مصنوعات کی کوالٹی اور قیمت کے سامنے دنیا کا اور کوئی ملک نہیں ٹھہر سکتا.. میں نے امریکہ سے امریکی برانڈ ایڈی ڈاس کے جوگرز منگوائے تو وہ بھی چین کے نکلے.. اور اگر یورپ سے سلک ٹائیاں منگوائیں تو وہ بھی چینی نژاد تھیں.. اگر دنیا بھر کے تاجر جنوبی امریکہ اور یورپ سے اپنا سرمایہ نکال کر چین میں لگانا چاہتے ہیں تو اُس کی بھی وجوہات ہیں.. آپ چین میں انڈسٹری قائم کر کے جو کچھ کماتے ہیں بے شک ڈالروں میں باہر لے جائیں.. لاء اینڈ آرڈر کی کوئی پرابلم نہیں.. لیبر فورس ایسی کہ نہ ہڑتال کرے اور نہ احتجاج.. بلکہ خون پسینہ ایک کر دے اور اگر کسی بھی لمحے اپنی رقم نکالنا چاہیں تو نکال لیں کوئی نہیں پوچھے گا..

چنانچہ تیان جن کی شاپنگ پیراڈائز میں پاکستانی ادیبوں نے وہ کچھ بھی خریدا جو کچھ اُن کی شاپنگ فہرست میں شامل نہیں تھا.. کوئی رضائیاں اٹھائے اور کوئی کمبل اوڑھے اور کوئی گلے میں چینی جیولری کے ہار لٹکائے مسکراتا چلا آ رہا ہے.. کوئی اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ پوتے پوتیاں ابھی تو متوقع نہیں ہیں' اُن کے لیے کھلونے خریدے چلا جاتا ہے..

لیکن ایک مسئلہ ہوا کہ ہم سب کھو گئے.. ایک دوسرے سے بچھڑ گئے..

ایک دوسرے کے پاس سے گزر جاتے اور چینیوں کے ہجوم میں ایک دوسرے کو چینی ہی سمجھتے اور گزر جاتے..

سب سے زیادہ پرابلم دہقانی کی تھی جو پہلے سے ہی ایک چینی بدھا کی شباہت لیے ہوئے تھا اور اب ہجومِ چینیاں میں ایسا مدغم ہو گیا تھا کہ متعدد بار پاس سے گزر جاتا اور خبر نہ ہوتی..

تیان جن کے اس اوپن ایئر بازار میں.. بقول ایک لاہوری محاورے کے.. ہمارے پیسے پورے ہو گئے تھے.. بلکہ یو آن پورے ہو گئے تھے.. پنجابی میں کسی کے فوت ہو جانے پر کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب پورے ہو گئے.. ہمارے یو آنوں کے ساتھ بھی یہی ہوا..

مقام.....بیجنگ

''سچے موتیوں کے ہار..''

اگلے روز اگرچہ ہمارے شیڈول میں.. جدید چینی ادب اور قدیم چینی ادب کے مخطوطات کے عجائب گھر کو دیکھنا درج تھا لیکن ہم سب نے قطار باندھ کر لیو خاور اور وانگ لی کے سامنے ہاتھ باندھ دیئے.. ''خدارا اب تو ہمیں اس شیڈول کے شکنجے سے آزاد کر دیں.. ہم بہت مخطوطات اور عجائب گھر دیکھ چکے... ایک اور عجائب گھر کو ہمارا معدہ قبول نہیں کر سکتا. آج ہم تھوڑا سا بیجنگ اپنے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں..''

شاید اس لیے کہ اب ہم ایک آدھ دن میں برخاست ہونے والے تھے.. رخصت ہو جانے کو تھے.. ہم چڑیوں کا وہ چنبہ تھے جنہوں نے اُڑ جانا تھا شاید اس لیے ہمارے میزبانوں کے دل پسیج گئے ''آپ بیجنگ میں سب کچھ دیکھ چکے اب کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟''

''ہم تھیان من چوک کے برابر میں جو رشین مارکٹ ہے' اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ سلک سٹور اور چینی لنڈا بازار میں جانا چاہتے ہیں تا کہ تھوڑی سی شاپنگ کر لیں..''

''مزید شاپنگ!'' لیو کا منہ کھل گیا.. ''ابھی گنجائش ہے؟''

''گنجائش تو نہیں ہے لیکن ہم نے روز روز چین تو نہیں آنا.. اس لیے مزید شاپنگ''

چنانچہ بے یقینی کے سناٹے میں آئے ہوئے میزبانوں نے ہمیں اُس روز آزاد کر دیا. ہمیں چھٹی دے دی اور ہم سب سکول کے بچوں کی طرح قلانچیں بھرتے ''چھٹی چھٹی'' کے نعرے لگاتے دورۂ چین میں پہلی بار آزاد زقندیں لگاتے پیس ہوٹل سے باہر آ گئے..

قید سے نکل آئے..

نکلے تو ہر ایک نے اپنی اپنی راہ الگ الگ اختیار کی..

اس آزادی کے دوران مجھے یاد پڑتا ہے کہ پاکستانی سفارت خانے کے پریس اتاشی رفیق ڈاہر اور بیجنگ پاکستانی کالج کے پرنسپل غالب نے ہمیں خوب کھلایا پلایا تھا.. بلکہ کھلایا زیادہ تھا اور پلایا بالکل نہیں تھا..

ان ضیافتوں کے دوران ہماری ملاقات بیجنگ یونیورسٹی کے اردو دان اساتذہ سے بھی ہوئی جو کم از کم مجھ سے بہتر اردو جانتے تھے.. ان میں عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں'' کے مترجم پروفیسر بھی شامل تھے جنہوں نے آداب میزبانی کے تکلف میں مجھ سے میرے ناول ''راکھ'' کا چینی زبان میں ترجمہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا..

ہماری شدید خواہش تھی کہ ہم بیجنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جائیں لیکن.. شاید کوئی مقامی مسائل تھے.. رموزِ چینیاں جانے کیا تھے کہ اس سلسلے میں ہماری شنوائی نہ ہوئی.. البتہ اردو شعبہ کی انچارج نے ہمیں یہ بتا کر شرمندہ کر دیا کہ لاکھ کوششوں کے باوجود حکومت پاکستان اُن کے شعبے کو جدید اردو ادب کی کتب مہیا نہیں کرتی.. جب کہ ہندوستانی سفارت کار اُن پر ہمہ وقت دباؤ ڈالتے رہتے ہیں کہ اردو تو ہماری زبان ہے.. ہم ہی تو اہلِ زبان ہیں ہم آپ کی منشا کے مطابق جتنی کتابیں آپ چاہیں مہیا کرنے کو تیار ہیں لیکن ہمارا مؤقف یہ ہے کہ ہم تو اردو کو صرف دوست پاکستان کے حوالے سے پہچانتے ہیں.. اس لیے صرف پاکستانی کتابوں کے تمنائی ہیں.. ہمارے لیے زبان سے زیادہ ملک اہم ہے..

ڈاہر کی دعوت میں ایک خوش رُو بلند قامت اردو دان چینی نوجوان آفاق سے بھی ملاقات ہوئی جو پاکستانی کلاسیکی موسیقی کا رسیا تھا.. غلام علی کا شیدائی تھا اور اُس کی گائی ہوئی حسرت موہانی کی غزل ''چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے'' کمال کے ساتھ گاتا تھا.. آواز میں غلام علی کا رچاؤ لیکن شباہت میں اُس سے بہتر.. تو ان ضیافتوں کے دوران میں نے حال مقیم پاکستانی سفارت کاروں کے سامنے درخواست پیش کی کہ آپ تو چین میں رہتے ہیں کچھ راہنمائی کیجیے.. میں ایک سلک کارپٹ اپنے ڈرائنگ روم کے لیے اور کچھ

سُچے موتی اپنی بیگم کے گلے کے لیے خریدنا چاہتا ہوں..

اگرچہ وہ پھر بھی مجھ پر شک کرے گی کہ تم یہ موتی کسی اور کے گلے کے لیے لائے تھے...سائز چھوٹا یا بڑا نکلا تو میرے گلے میں ڈال دیئے..

چنانچہ ڈاہر اور راجپوت بھائی مجھے بیجنگ کے ایک ایسے شاپنگ پلازا میں لے گئے جہاں کچھ عرصہ پہلے کھوکھوں اور سٹالوں کی ایک بے ترتیب مارکیٹ تھی..پھر حکومت نے اُس جگہ ایک شاندار سپر سٹور تعمیر کیا اور اُس کی مختلف منزلوں پر انہی کھوکھا والوں اور سٹالوں والوں کو تقریباً اُسی حالت میں منتقل کر دیا..

ایک فلور پر صرف سٹیشنری ملتی تھی..

اگلی منزل پر صرف گھڑیوں کے انبار تھے..دنیا کی معروف ترین اور مہنگی ترین گھڑیوں کے ڈھیر.صرف اس فرق کے ساتھ کہ اگر ایک اوریجنل سوئس یا فرنچ ڈیزائنر واچ پچاس ہزار کی ہے تو یہاں صرف تین سو روپے میں فروخت ہو رہی ہے...سنہری راڈو یا کارٹیئر جو لاکھوں میں جاتی ہے' یہاں چار پانچ سو میں میسر تھی۔ اور ان دو نمبر گھڑیوں کی کوالٹی بھی نچلے درجے کی نہیں۔ آپ ایک ایسی گھڑی کو اپنی یا بہتر ہے کہ کسی اور کی کلائی کی زینت بنائیے' سال بھر بنائے رکھئے' اُس کے رنگ رُوپ میں فرق نہیں آئے گا..اور نہ ہی کسی کو شک ہو گا کہ یہ نقل ہے اور بہ مطابق اصل ہے..

لیکن میری دلچسپی صرف چائنیز پرلز میں تھی..

ان موتیوں کا بھی ایک الگ جزیرہ تھا..ایک اور فلور تھا..

اور یہاں پہنچتے ہی ڈاہر ایک ایسے ملاح کی طرح ہو گیا جو اس پرل آئی لینڈ پر بہت مرتبہ آ جا چکا تھا اور یہاں اگر ایسی حسینائیں تھیں اور گھاس کے سکرٹ پہنے ''ہولا'' ناچتی تھیں تو وہ اُن سے بخوبی واقف تھا..

پورے فلور پر سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جھروکے اور سٹال تھے جہاں چائنیز پرلز اور جیولری فروخت ہو رہی تھی..ڈاہر نے پہلے تو صرف مجھے سائٹ سی انگ کروانے کے لیے پورے فلور کا ایک چکر لگایا...موتی بیچنے والی حسیناؤں سے بھاؤ تاؤ کیا..مارکٹ پرائس کا

اندازہ لگایا اور پھر بالآخر اُس چالاک چنچل اور چلبلی حسینہ کے کوٹھے پر میرا مطلب ہے کھوکھے پر لے گیا جہاں سے وہ اپنے لیے اور دوستوں کے لیے خریداری کرتا تھا..

یہ نیلے میک اپ میں نیلی ہوتی حسینہ ڈاہر کو دیکھ کر نہایت پُرمسرت ہوئی اور اگر اُس کے اور ڈاہر کے درمیان موتیوں اور زیورات سے سجی میز حائل نہ ہوتی تو وہ اُس کے ساتھ بوس و کنار کرنے سے باز نہ آتی..

ڈاہر اُس کے ساتھ کم از کم میری فہم کے مطابق فرفر چینی بول رہا تھا.موتیوں کا بھاؤ پوچھ رہا تھا' مول تول کر رہا تھا اور وہ بار بار کبھی اپنے مختصر چینی سینے پر ہتھیلی جما کر قسمیں کھاتی..کسی ایک قیمت پر اڑ جاتی..اڑی رہتی..پھر اپنے لبوں پر اُنگلیاں جما کر ہنسنے لگتی..کبھی اوئی اوئی کرتی اور کبھی انکار میں سر ہلاتی..

بالآخر ڈاہر نے اُس حسینہ کو زیر کر لیا..حسینہ کو تو نہیں بلکہ اُس کی بتائی ہوئی قیمت کو زیر کر لیا اور سودا ہو گیا..

ان موتیوں کی چمک قابل دید تھی..یہ سب کلچرڈ پرلز تھے..انہیں چینی سمندروں میں اگایا گیا تھا..سیپیوں کے منہ کھول کر موتی تخلیق کرنے والے کیڑوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ ایک اور موتی تخلیق کریں..ان میں آف وہائٹ..تقریباً سیاہ اور جامنی رنگ کے پرلز تھے..

میرا خیال ہے کہ چین میں یہ میری بہترین شاپنگ تھی.....

اس لیے بھی کہ ہم اس کھوکھا سپر سٹور میں آنے سے پیشتر غیر ملکیوں کے لیے خصوصی فرینڈشپ سٹور میں بھی چکر لگا کر آئے تھے..وہاں اشیاء اگرچہ عمدہ کوالٹی کی تھیں لیکن اُن کے دام آسمان سے باتیں کرتے تھے..اتنی باتیں کرتے تھے کہ واپس ہماری جیب تک نہیں آتے تھے..یہیں پر میں نے کافور سے بنے ہوئے وہ منقش صندوق دیکھے جو بیس برس پیشتر میں نے مانسہرہ کی خانم کے گھر دیکھے تھے..ایسا چینی فرنیچر بھی دیکھا جس کی ایک میز میرے پورے چینی شاپنگ بجٹ سے بھی نہیں خریدی جا سکتی تھی..

میں اپنے چینی موتیوں کے ہار پوٹلیوں میں سنبھالتا واپس پیس ہوٹل آیا تو وہاں سفید ریش شاعر ایک ہتھوڑے کی نمائش کر رہا تھا..''دوستو اس سے بہتر ہتھوڑا پورے

پاکستان میں نہیں ملے گا.. صرف سو روپے میں مل گیا ہے.. آزمائش شرط ہے'' وہ ہتھوڑے کو ایک مگدر کی مانند گھما رہا تھا..

میں اُوپر.. اپنے کمرے میں چلا گیا..

ہوٹل پیس کی بارہویں منزل کے نیچے بیجنگ سنسان ہو چکا تھا..

ٹین کی بوسیدہ چھتوں کی بستی میں کوئی ایک چراغ بھی نہ جلتا تھا..

وہ سائیکل سوار سو چکا تھا جو صبح سویرے کہیں جاتا تھا..

مجھے بھی سو جانا چاہیے تھا کیونکہ میں نے بھی صبح سویرے کہیں جانا تھا..

پاکستان واپس جانا تھا..

''تتلی یا تارڑ..... بیک ٹُو پاکستان''

تتلی خواب میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی ''تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟''

''سمر پیلس کے باہر کوچ ہماری منتظر ہے... ہمیں دو گھنٹے کی جو مہلت دی گئی تھی اُس کے ختم ہونے میں صرف چند لمحے باقی ہیں''

''اگر تم اُس کوچ میں جا بیٹھو تو پھر کہاں جاؤ گے؟''

''ہم واپس ہوٹل جائیں گے.. پیکنگ کریں گے پیکنگ میں آخری پیکنگ کریں گے.. اور کل بیجنگ سے اسلام آباد جانے والی پی آئی اے کی فلائٹ میں سوار ہو کر پاکستان پہنچ جائیں گے..''

''اتنے تردّد کی ضرورت تو نہیں'' تتلی پر سمیٹتی.. کبھی میرے بالوں میں ٹھہرتی' کبھی رُخساروں سے چھوتی' ایک عجیب اُداسی سے چھوتی تھی ''تم سمر پیلس کی جھیل میں ٹھہری ہوئی اس سفید کشتی میں سوار ہو جاؤ تو بھی اپنی منزل کو پہنچ سکتے ہو..''

''نہیں..''

''ہاں..''

تتلی خواب میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی..

تتلی اُڑی..

وہ پھر خواب میں ہی تو تھی..
مشکل سے اُڑی..
کہ اُس کے پروں میں وقت کے گھونسے تھے.. جو اُنہیں بوجھل کرتے تھے..
وہ کب اُڑی تھی؟
شاید صدیاں گزر چکی تھیں جب وہ اور میں چین آئے تھے..
اس تتلی نے سفر کے ایک اور تنکے کو سہار لیا تھا..
یہ تتلی میں تو نہ تھا... وہ چینی فلسفی تھا جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ تتلی بن گیا ہے اور پھر ساری عمر اسی سوچ میں رہا' اسی مخمصے میں رہا کہ کیا میں نے خواب دیکھا تھا کہ میں تتلی ہوں یا واقعی ایک تتلی ہوں..
تتلی کو.. یا مجھے کسی فیلسوف نے بتایا تھا کہ تم اُس کے بارے میں مت سوچو جو پیچھے رہ گیا ہے..
مت سوچو کنفیوشس بوڑھے اور اُس کے جھینگر کو.. شی آن کی شاموں کو.. مٹی کے سپاہیوں پتھروں کے جنگل اور ہیون سانگ کے پگوڈے کو.. شنگھائی کے گلابوں کو اور ہانگ چو کی تتلی پیکنے کو.. مسجد نیوجیہ کے سرخ ستونوں اور اُس کے آفت مجسّموں کو.. یا پھر سمر پیلس کی جھیل میں منتظر اُس سفید سنگ مرمر کی کشتی کو.. جس کے بارے میں تتلی بدگمان کرتی ہے کہ وہ تمہیں منزل تک پہنچا سکتی ہے.. مت سوچو اُس کے بارے میں جو پیچھے رہ گیا ہے کیونکہ ہر شے دنیا کی رُوح میں لکھی گئی ہے.. ہمیشہ کے لیے وہاں رقم ہو گئی ہے.. صرف اپنے دل کی آواز سنو اور شگونوں کی جانب دھیان دو.. سفر کا راز یہ ہے کہ تمہارے اپنے اندر ہوائیں ہیں.. صحرا' سمندر اور ستارے ہیں اور ہر وہ شے ہے جو کائنات میں ہے.. اور ہم سب کو صرف ایک ہاتھ نے تخلیق کیا ہے' اس لیے ہم سب کی رُوح ایک ہے..
تو یہ تتلی بھی اپنے آپ کو ہواؤں میں بدل سکتی تھی.. اور اُس نے بدلا.. صحرا ہو سکتی تھی اور وہ ہوئی.. سمندر ہو سکتی تھی اور ہو گئی.. اور وہ صرف اپنے دل کی آواز سنتی تھی.. اور میں اُس کے دل کی آواز سنتا تھا..

چینی فلسفی کے وجدان میں سے پر کھولنے والی تتلی کے بھیتر میں مَیں تھا..
اسی لیے یہ قصہ کبھی تتلی کی زبان میں رواں ہوا اور کبھی میں نے بیان کیا.. کیونکہ یہ طے نہیں ہوا تھا کہ تتلی.. تارڑ ہے.. یا تارڑ ہے جو تتلی بن چکا تھا..
ہم صحرائے گوبی کی مرگ ریتوں.. تبت کی ویرانیوں پر سے گزرتے منگولیا کے آسمانوں پر اُڑتے یہاں آئے تھے اور اب ہمیں واپس جانا تھا..
مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ایک ریت کا پرندہ ہوں..
جو مظاہرِ فطرت کی زد پر اُڑ رہا ہے..

ہم سب غمزدہ تھے..
کوچ میں ہمارا سامان لادا جا رہا تھا اور حسب روایت ہمدرد سفید ریش نگرانی کر رہا تھا.. وہ ہتھوڑا ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا کیونکہ اُسے پیک کرنے کے لیے اُس کے سامان میں جگہ نہ تھی..
ہم پر بیجنگ کی آخری دُھوپ تھی..
ہمارے کانوں میں چین کی آخری آوازیں تھیں..
آنکھوں کے سامنے سے آخری چہرے گزرتے تھے..
کوچ پر ہمارا سامان لادا جا رہا تھا..
اور کوئی بھی کوچ کے اندر جانے میں پہل نہیں کرتا تھا.. کہ جو بھی اُس کے اندر گیا.. چین سے گیا..
''جدائی کا لمحہ آن پہنچا ہے..'' کسی نے سرگوشی کی.. میرے کان کے قریب سرگوشی کی.. اور یہ تتلی تھی.. میرے کاندھے پر بے وزن براجمان تتلی تھی..
''تم کہاں سے آ گئیں..''
''میں تو سمر پیلس کی سفید کشتی میں سوار تمہاری منتظر رہی.. پھر تمہارے خواب میں آئی
[illegible]''

''کہاں؟''

''سمر پیلس کی سفید کشتی میں..''

''میں اپنے وفد کے اراکین کو کیسے ترک کردوں..کیسے چھوڑ دوں..وہ کیا کہیں گے؟''

''وہ کچھ بھی نہیں کہیں گے کیونکہ تم اُن کے لیے بالکل غیر اہم ہو..اُنہیں احساس بھی نہیں ہوگا کہ تم اُن میں موجود نہیں ہو..آ ؤ..''

میں آ گیا..ایک بے دام غلام کی طرح آ گیا..

کیسی عجب بات تھی..انہونی بات تھی..کہ ایک چینی ایمپریس کا خواب سمر پیلس ویران پڑا تھا..دُھوپ میں بالکل ویران اور کسی بھی سانس سے خالی پڑا تھا..فقیر کی چٹان کو کوئی نہ دیکھتا تھا..جھیل کے پانی بے آباد تھے۔اُن میں کوئی ایک کشتی بھی نہ تھی جو اُس کے درمیان اُبھرے جزیرے کو جاتی تھی..صرف میں اور تتلی تھے جو سمر پیلس کی صحرا ویرانی پر اُڑتے جاتے تھے..

اور سفید کشتی میں بھی کوئی ذی رُوح نہ تھا..

کشتی بھی بے جان تھی اور جب ہم دونوں اُس میں اُترے تو اُس میں جان پڑ گئی اور وہ سمر پیلس کی جھیل میں ہچکولے لینے لگی..

''وطن واپس پہنچنے کے لیے.. پرواز کے عذاب کو سہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی...یہ کشتی تمہیں اپنی منزل تک لے جائے گی..اطمینان سے بیٹھ جاؤ..''

''تمہیں کیا پتہ تتلی کہ میری منزل کیا ہے..''

''پتہ تو مجھے ہے..'' تتلی اٹکھیلیاں کرنے لگی ''پتہ تو مجھے سب کچھ ہے..لیکن یہ کشتی تمہیں شاہ گوری تک نہیں لے جاسکتی...کسی جھیل کرومبر تک نہیں لے جاسکتی کہ یہ صرف تمہیں وہاں تک لے جاسکتی ہے جہاں تک تمہارا نصیب جاتا ہے..''

''تو پھر اس کے طلسم کا فائدہ؟''

''طلسم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے..اور وہ بھی نصیب کے لکھے کے پار نہیں جاسکتا..''

''کیا تم بھی میرے ساتھ چلو گی؟''

''یہ فیصلہ تو ابھی تک نہیں ہوسکا کہ تم دراصل تتلی ہو یا میں مستنصر حسین تارڑ..تو کیا جانئے کہ کون کیا ہے..کون لوٹ جاتا ہے اور کون یہیں رہتا ہے''

''اس کا فیصلہ کب ہوگا؟''

''کبھی بھی نہیں..تم ہمیشہ مخمصے میں رہو گے..ایک خواب میں رہو گے کہ تم کبھی چین آئے بھی تھے یا نہیں..اگر آئے تھے تو کس حیثیت میں آئے تھے..ایک تتلی کے رُوپ میں یا..ایک تتلی تمہارے رُوپ میں تھی جو آئی اور چلی گئی..''

''یہ کشتی کب رواں ہوگی..''

''جب تم سوچ لو گے کہ اسے رواں ہونا ہے..''

''تو یہ رواں ہوجائے..میں نے سوچ لیا ہے''

''تو یہ رواں ہوگئی..کیا اس کی روانی تمہارے بدن میں چپّو چلاتی آگے آگے بڑھتی نہیں جاتی؟''

''ہاں..''

میں اب بھی..

آج بھی..

اُسی مخمصے میں ہوں..

اُسی خواب میں ہوں..ابھی تک اُسی مخمصے میں ہوں..جب کہ میں اپنے وطن میں کب کا پہنچ چکا ہوں..کہ کیا میں کبھی چین گیا بھی ہوں یا نہیں؟..

اور کون ہے جو پیچھے رہ گیا ہے چین میں..

اور کون ہے جو واپس آ گیا ہے پاکستان میں...

لیکن یہ طے ہے کہ میں تو ایسا سفرنامہ لکھنے پر قادر نہیں ہوں..

یہ صرف تتلی ہے جس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ' رنگوں اور سوچ نے اس سفرنامے کو جنم دیا ہے..میں نہیں ہوں..

یہ تتلی میرے ساتھ چلی آئی ہے..
سمر پیلس کی سفید کشتی میں سوار.. بیجنگ سے براہِ راست لاہور چلی آئی ہے..
اور اب.. میری سٹڈی میں.. میری رائٹنگ ٹیبل کے سامنے.. ایک کرسی پر
براجمان پھڑ پھڑاتی کاغذوں پر پلکیں جھپکاتی یہ روئیدادِ چین لکھ رہی ہے..
اگر آپ کو شک ہے تو بے شک..آ کر دیکھ لیجیے..
یہ میں نہیں... تتلی ہے..

''جب چوانگ چُو نے خواب دیکھا کہ وہ تتلی بن گیا ہے..
تو تتلی چوانگ چُو بن گئی..
اگر اکیلی مخلوق اس طرح تبدیلی سے دو چار ہو سکتی ہے..
تو یقیناً ساری دُنیا ہی بہاؤ میں ہو گی''